آپ بیتی جگ بیتی
جمیلہ ہاشمی

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

جمیلہ ہاشمی کی ایک نایاب کتاب جو اب مارکیٹ میں ناپید ہے

1969ء اردو مرکز گنپت روڈ لاہور سے شائع ہوئی

کتاب ہذا کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ و ٹائیٹل ڈیزائننگ انیس الحسن شاہ نے کی ہے

آپ بیتی۔ جگ بیتی

جمیلہ ہاشمی

عذرا کے نام

ترتیب

1	آپ بیتی جگ بیتی	6
2	پرانے گیت	36
3	برہا کی رات	51
4	اِس پار اُس پار	73
5	بن باس	94
6	آگ کا روپ	121
7	سونے کا ذرہ	143
8	دو خط	156
9	لال آندھی	168
10	گوشۂ بساط	198
11	خالی گھر	220
12	کیسری	252
13	رات کی ماں	278
14	طوطا کہانی	304
15	بجھے دیے	326

آپ بیتی جگ بیتی

نرائن چاچانے دنیا تیاگ رکھی ہے نہ کبھی بیاہ شادی میں جاتا ہے اور نہ ہی کسی کے مرنے پر افسوس کے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے بے سدھ سی۔ انسان جیتا تو اس لیے ہے کہ بڑھاپے میں اس کے چار دوست ہوں، چار پاس بیٹھنے والے ہوں لوگ اس کا نام لیں تو عزت سے اس کی طرفت دیکھیں۔ اس کے تجربے اور عقل سے کام لیں۔ اس کے صلاح اور مشورے کو اہمیت دیں اور یہ نرائن چاچا ہے کہ بس حویلی میں گھومتا رہتاہے۔ گھر بار کا جھنجھٹ بھی نہیں، کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے چیتن؟ اور چیتن نے مجھے گھوم کر یوں دیکھا گویا یہ باتیں میں نے نرائن چاچا کے لیے نہیں کہیں اس کے لیے کہی ہوں۔ حویلی کے باہر بڑ کے گھنے اور بوڑھے پیڑ پر پرندے بسیرا کرنے کے لیے آرہے تھے۔ شاخیں بار بار ہل رہی تھیں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ

دیتی تھی۔ شام کی سرخیاں درخت کے پرے سے غائب ہو رہی تھیں اور گہرے اندھیرے میں لمبی لمبی لٹکتی داڑھیوں سے خوف آتا تھا۔

تم کیا جانو کئی دُکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اتھاہ خاموش ساگر کی طرح زندگی کی حدوں سے پرے موت کی حدوں سے دور بھگوان کے گھر کو چھونے لگتی ہے۔ ہر نام، ہو سکتا ہے نرائن چاچا کو بھی کسی ایسے ہی دکھ سے پالا پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے ماضی میں بھی ایسی یاد ہو جو پھیل کر اندھیرے کی طرح ساری زندگی پر چھا جاتی ہے۔

پر یادوں کا دکھ بھی دھیرے دھیرے کم ہو جاتا ہے اور اندھیرے سے مانوس آنکھیں اسی تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ کلونت کی موت کا غم ایسا نہیں تھا جس نے کسی کو چھوا نہ ہو۔ سوائے نرائن چاچا کے۔ وہ اس گرتی ہوئی دیواروں والی پرانی حویلی میں زخمی جانور کی طرح گھوم رہا ہے۔ جیسے یہ دنیا کلونت کے مرنے پر ذرا سی بھی تبدیل نہ ہوئی ہو۔ جیسے کلونت کا مرنا کوئی بات ہی نہ ہو۔

ہر نام، کلونت تمھاری بہن تھی نا میری بیوی تھی نا، ہم دونوں کا غم دوسری دنیا کے غم سے کس طرح ایک سا ہو سکتا ہے تم نے اس کے ساتھ بچپن گزارا تھا۔ تم اور وہ دونوں ایک ہی آنگن میں ایک ہی تھالی سے کھا کر بڑے ہوئے تھے۔

ایک ہی ماں کا خون تمھاری رگوں میں تھا۔ پر نرائن چاچا سے اس بات کا گلہ کرنا فضول ہے۔

چیتن تم نے غلط سمجھا ہے. میں نرائن چاچا سے کسی بات کا گلہ نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں ایسی بے حسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اس سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔ نرائن چاچا ایسے ہیں ویسے ہیں۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ پر چار دن پہلے جب کلونت کی ارتھی اٹھی ہے تو دیواریں بھی رو رہی تھیں۔ یہ درخت بھی ماتم کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادلوں کی گھپ تاریکی سے جی ڈر رہا تھا۔ مندر کے بوڑھے بیچاری جو کسی کے مرنے پر صرف ٹھنڈا سانس لے کر سمرن کرنا شروع کر دیتے ہیں اُسے دیکھنے آئے تھے۔ گاؤں میں کون تھا جو رو نہ رہا ہو مگر نرائن چاچا جیسے پتھر ہے اس کے پاؤں میں حرکت نہیں ہوتی۔ اس نے حویلی کے کواڑ کھول کر باہر نہیں جھانکا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے۔ نہ کسی کے دُکھ سے دکھی اور نہ کسی کے سکھ میں شریک۔

پھر ہم دونوں چُپ ہو گئے جیسے کہنے کے لیے بات نہ رہی ہو دنیا کے اور لاکھوں دھندے ہیں۔ کلونت کے دس دن کے بعد اس کی چھوٹی سی بچی بھی مر گئی۔ پے در پے اس مصیبت نے تو ہم سے حواس بھی چھین لیے۔ گھر میں نئے سرے سے رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ خزاں کے لمبے بے ہنگم اور اداس دن آ گئے

۔ آندھیاں چلتی رہتیں۔ بڑ کی شاخیں تقریباً ننگی ہو گئیں اور دور چوٹی کے قریب بنے ہوئے چیلوں اور کوؤں کے گھونسلے بڑے بے آسرا سے نظر آنے لگے۔ آسمان پر سارا وقت ایک زرد رنگ کا غبار گھومتا رہتا اور آٹے کی چکی کی مسلسل کوک سے میرا دل گھبرا اٹھتا۔ خشک پتے گاؤں کی گلیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہتے اور فضا میں گوبر، موت، اپلوں اور سڑے پانی کی بو ملی رہتی۔ ایک سال پہلے کلونت جب زندہ تھی گھر میں خوشیاں تھیں۔ اس کے چرنے کی گھوں گھوں کو سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک سال بعد خزاں ایسی ویران، اُداس اور دل کو گھبرانے والی ہو گی۔

باہر بارش ابھی شروع ہوئی تھی۔ ہوا بہت زوروں سے چل رہی تھی اور چوپال کے ساتھ والے بڑ کی داڑھیوں میں سائیں سائیں کے شور سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مٹی کی سوندھی خوشبو پھونس کے دروازے میں سے اندر آ رہی تھی اور گوبر کی بو کے ساتھ مل کر عجیب غم ناک تاریکی پیدا کر رہی تھی ۔ دیے میں تیل کم ہوتا جارہا تھا ہم سب رام دلارے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ گاؤں کا نمبر دار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں کا رس، اس کی آواز کا رعب اور اس کی شخصیت کی کشش ہمیں روز اس کا انتظار کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ بہت لمبے چوڑے کنبے والا بڑا مصروف آدمی

تھا۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ چوپال میں نہ آئے۔ محفلیں اُس کے بغیر سونی رہتی تھیں۔ چودھری کریم بخش بھی یوں تو بڑا زور دار باتونی تھا مگر رام دلارے میں جو بات تھی وہ اس میں کہاں۔ اور اس لیے حقہ پیتے آگ تا پتے، باتیں کرتے جم کر نہیں بیٹھے تھے۔ ہر گھڑی پھونس کے بھڑے ہوئے دروازے کی طرف نظر اٹھ جاتی تھی نہ جانے رام دلارے کیوں نہیں آیا تھا؟ اور پھر باہر بارش شروع ہو گئی تھی اور سائیں سائیں کرتی، بین کر کے گزرتی ہوا تو میرا دل دہلا رہی تھی۔ سنتوک سنگھ نے الاؤ پر اور اپلے رکھ دیے تھے آگ کو چمٹے سے ایک دو بار ادھر ادھر کیا اور پھر کہنے لگا چپ بیٹھے کب تک راہ دیکھیں گے شمشیر سنگھ یار تم ہی کوئی بات کہو۔

شمشیر سنگھ کہنے لگا فصلوں کے گاہنے بونے کے دن دور ہیں۔ خالی دنوں میں میں کیا بات کروں۔ سمجھ نہیں آتی آج رام دلارے کیوں نہیں آیا۔ وہ تو کبھی اتنی دیر سے نہیں آتا۔ اُس نے کبھی چوپال سے ناغہ نہیں کیا؟ ـــــ سنتوک سنگھ بولا چودھری یار آج کچھ دل اتر رہا ہے میرا تو۔ واہ گورو اچھی ہی کرے۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ پر یار نمبر دار آخر کنبے قبیلے والا ہے پھر آج ایک گھوڑی کا سودا کرنے دوسرے گاؤں گیا تھا۔ بات نہ بنی ہو گی کل کے لیے ٹھہر گیا۔

کریم بخش نے کہا یہی بات ہو سکتی ہے اور اگر تم ایسے ہی فکر مند ہو تو دو قدم پر گھر ہے جا کر نمبر ار کا پتہ کیوں نہیں کرتے۔ بارش سے ڈر گئے ہو جو ان ؟

''ڈر کون گیا ہے'' سنتوک سنگھ نے کھڑے ہو کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا'' اگر یہ بات ہے چو دھری تو لو میں چلا۔ کیا تم سمجھتے ہو سنتوک سنگھ بارش سے ڈر گیا۔ ارے خون کی ہولی بھی کھیلنی پڑے کبھی ڈروں نہیں۔ واہ گورہ کا خالصہ ہوں سمجھتے کیا ہو۔ لو میں تو چلا۔ ''

چو دھری کریم بخش اور شمشیر سنگھ نے اس کے کھیس کا پلو پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا اور بولے۔ ''بس بس دیکھ لی تیری دلیری۔ یار آگے کون سی رونق ہے جو تو بھی جا رہا ہے۔ کیا یہ بات کوئی کہنے کی ہے کہ تو بہادر ہے یا نہیں۔ بس اب بیٹھ جا۔ ''

اور پھر بڑے زور سے دروازہ کھلا۔ رام دلارے کی بجائے نرائن چاچا اندر آ گیا ۔ اس کی سفید داڑھی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس کی پگڑی پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ کھیس نہ ہونے کی وجہ سے قمیص بھی جسم سے چپک گئی تھی۔ پاؤں میں جو تا بھی نہ تھا۔

''نرائن چاچا تم آج ایسے میں چوپال کیسے آ گئے ؟'' شمشیر سنگھ، سنتوک سنگھ ا ور چو دھری نے یک زبان کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا گیلے پاؤں سے گلی کی کیچڑ کو صاف کیا۔ جھٹکے سے پگڑی اتار کر دونوں ہاتھوں سے اسے نچوڑنے لگا۔ پھر اس نے پاس کھڑے شمشیر سنگھ کو نچڑی ہوئی پگڑی دے دی اور کرتا اتار کر اسے نچوڑا۔ اتنی سخت سردی کے باوجود نرائن چاچا کانپ نہیں رہا تھا۔ اس کی چھاتی لوہے کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اس کا آج یوں اچانک چوپال میں آجانا ایک زلزلے سے کم نہ تھا ہم سب چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نرائن چاچا لگ رہا تھا جیسے ایسی اندھی اندھیری رات میں کسی شمشان سے نکل کر ہمیں ڈرانے کے لیے آیا ہو
۔

پھر اس نے چوپال کے ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا:
”کیوں شمشیر سنگھ کچھ کھانے کے لیے مل سکے گا۔“ اور شمشیر سنگھ کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ برسوں سے ہم لوگ نرائن چاچا کو حویلی میں چپ چاپ گھومتے دیکھنے کے عادی تھے۔ اس نے کبھی کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ کھانا وقت پر کسی نے بھجوا دیا تو کھا لیا۔ نہیں ملا تو خاموش ہو رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کبھی اسے بولتے ہی نہیں سنا تھا۔ اور آج یہ آواز جیسے کہیں دور کسی غار میں تازہ پانی کے چشمے کے چلنے کی آواز ہو وہاں اس کونے سے آئی تھی۔

"شمیر سنگھ !" نرائن چاچا نے پھر کہا۔ "گھر جا کر روٹی ساگ جو کچھ بھی ہو لے آؤ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔"

اور اٹھتے ہوئے شمشیر سنگھ کا کھیں اس کی بے دھیانی میں پاؤں میں اٹک گیا۔ بارش اور کیچڑ اندھیرے کی پرواکیے بنا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

کھلے دروازے میں سے بارش اندر آرہی تھی۔ چیتن نے ہڑبڑا کر پہلو بدلا اور نرائن چاچا کو وہاں دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کریں۔

پانی میں بھیگا، تہبند کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے شمشیر سنگھ آگیا اور اُس نے روٹی نکال کر چاچا کے سامنے رکھ دی۔

چاچا نے نہ جانے کتنی دیر میں روٹی ختم کی ہو گی۔ پانی پی کر زور کا ڈکار لیا۔ ہاتھ اپنی سفید داڑھی پر پھیرے اور آگ کے قریب ہو کر کہنے لگا:

"جوانو تم چپ کیوں ہو۔ چوپال آج سے تیس سال پہلے تو اتنی سونی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں قہقہے گونجا کرتے تھے، جوان اونچی آواز سے ماہیا اور ہیر گایا کرتے تھے، بولیاں، کہاوتیں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، کتنی رونق ہوا کرتی تھی اور آج تیس سال بعد اس چوپال میں آکر تو میرا دل سرد ہو گیا ہے۔ تم چپ کیوں ہو، باتیں کرو۔ میں باتیں سننے ہی تو آج یہاں آیا ہوں۔"

چیتن بولا ”نرائن چاچا موت بڑی ظالم ہے سارے چین چھین لیتی ہے۔ تب جگ بیتیاں، آپ بیتیاں لگنے لگتی ہیں اور سرد راتوں میں جی چاہنے کے باوجود بات نہیں ہو سکتی۔ ہم کہانیاں کیا کہیں گے۔“

کریم بخش چودھری ہمیشہ کا باتونی آج خاموش بیٹھا اپنے حقے کی نے منہ میں رکھے کچھ سوچ رہا تھا اور شمشیر سنگھ نے کھیس کو جھٹک کر آگ کے قریب پھیلا دیا تھا۔ چھت پر بارش بڑے زور سے شور مچا رہی تھی اور سوندھی خوشبو میں پانی کی نمی کی باس مل کر اندر پھیل گئی تھی۔

نرائن چاچا بولا ”چیتن سنگھ جب بات کرنے کو جی نہ چاہے تو چوپال میں موت کا سناٹا کیوں پھیلاتے ہو۔ تمھارا خیال ہے کلونت اپنے ساتھ زندگی کی ساری ادھوری، ان کہی کہانیاں اور دکھ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ تمھاری زندگی اتنی خالی تو نہیں ہو گئی کہ گا بھی نہ سکو۔“

چیتن تو جیسے چاچا کی ہر بات کا جواب دینے پر تیار ہی تھا۔ بولا ” جو گیت دوسروں کے دلوں کو شانتی اور سکھ نہ دے سکیں ان کے سنانے سے فائدہ۔ اور چاچا میں کہتا ہوں ہیر کی باتیں پرانے قصے ہیں ان کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔“

نرائن چاچانے کہا" ہیریں روز پیدا ہوتی ہیں اور روز مرتی ہیں۔ چیتن دکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا۔"

سنتوک سنگھ نے آگ پر اپلے پھینکے تو راکھ اڑ کر سب پر گری۔ آگ کے ننھے ننھے انگارے زبانیں نکالے لپک کر اپلوں کے ساتھ لگ گئے۔ بالکل یوں جیسے نرائن چاچاکے کہنے کے مطابق دکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا یہ آگ سب کو چاٹ جاتی ہے۔ ہر ایک دامن تک اس کی گرمی جلدی یا دیر سے ضرور پہنچ ہی جاتی ہے۔

چیتن جیسے کوئی بات بعد میں یاد آئے کہنے لگا۔"کیوں چاچا آج کیوں تم قصہ نہ کہو۔ آج تم کوئی آپ بیتی جگ بیتی سناؤ۔ چوپال کے سونے پن میں ویرانوں کی کہانیاں گونجیں۔ گیتوں میں کیا رکھا ہے کیوں شمشیر؟" اور شمشیر سنگھ نے جیسے کسی خواب سے چونک کر کہا ہو۔"ہاں ہاں گیتوں میں کیا رکھا ہے۔" وہ نہ جانے کتنا اداس تھا اور اُسے کیا یاد آرہا تھا۔"چاچا تم ہی کوئی بات کرو۔ باہر کیسا اندھیرا ہے اور بارش نے تو دل اُداس کر دیا ہے۔"

نرائن چاچانے ہولے ہولے جھکا ہوا سر اٹھا کر اُن پرانی بوڑھی آنکھوں سے شمشیر سنگھ کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔"تیس سال سے اس راز کو

سینے میں دبائے دبائے اب تو میرا سانس بھی رکنے لگا ہے۔ مجھ میں اور سہنے کی ہمت نہیں رہی۔ کیوں جوانو تم میں سننے کی ہمت ہو گی۔"

چیتن اٹھ کر الاؤ کے قریب آ گیا۔ میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ شمشیر نے زور سے کہا"واہ گرو کا خالصہ واہ گرو کی جے" سنتوک سنگھ نے چمٹے سے آگ کو کریدا اور چودھری کریم بخش نے حقے کی نے منہ سے نکال کر اُسے دیوار سے ٹکا دیا۔

"تم میں سے کسی نے گوبندی کو نہیں دیکھا ہو گا۔ گوبندی میری چھوٹی بہن تھی۔ اسی حویلی کے دالانوں اور نیچی چھتوں والے بڑے بڑے کمروں میں کھیلتی کھیلتی وہ اچانک بڑی ہو گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کسی جادو کے زور سے بڑی ہو گئی تھی۔ نہیں یہ بات نہیں۔ میں اس سے دس سال بڑا تھا نا۔ گھوڑ دوڑ، کھلیانوں کی حفاظت اور گھومنے پھرنے میں بچپن کے دن گزار کر جب میں نے ہوش سنبھالا تو گوبندی میری انگلی پکڑ کر دور تک پھیلے کھیتوں کے کنارے ایک چھوٹی سی گڑیا کی طرح پھرا کرتی تھی۔ میں نہ جانے کتنی حدیں پار کر گیا تھا کہ جب اُس نے گوٹے لگی چنریاں اوڑھنی شروع کی ہیں اور گڑیوں سے کھیلنے لگی ہے تو میں سنتو کے عشق میں مبتلا تھا۔ سنتو آج نہیں ہے۔ بچپن کی محبت کی طرح وہ بھی دور پیچھے چھپ گئی ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح اُس کی محبت نے

مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سنتو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ اس کا باپ ہما رے کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کا گونا کر کے باپ نے ابھی سسرال نہیں بھیجا تھا۔ میں نے بھی اُن دنوں گاؤں کی لڑکیوں کو آنکھیں کھول کر ذرا بس میٹھی نظروں سے دیکھنا شروع کیا ہی تھا۔ میرے جیسے اور کم عمر دوست بیٹھ کر کسی باغ میں تاڑی پیتے اور نشے میں بہک کر لڑکیوں کی باتیں کرتے۔ انہی مجلسوں میں میں نے سنتو کا نام بھی سنا۔ سنتو کے بعد میں نے ویسی طرحدار عورت پھر کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے رنگ میں گندم کا سنہرا گھلا ہوا تھا اور چہرے پر چمک دبی دبی تھی جیسے کوئی ہیرا کسی پردے کے پیچھے سے دمک رہا ہو۔ آنکھوں میں کسی نے ستارے کوٹ کر بھر دیے تھے۔ اس کے لمبے لمبے بال کتنے کالے تھے چوٹی چلتے میں یوں چلتی گویا کوئی ناگن مستی میں جھول رہی ہو۔ سنتو سے زیادہ پر سکون چال میں نے کسی عورت کی نہیں دیکھی اور پھر وہ مسکان جو ہونٹوں کے قریب آنکھوں سے نکل کر امرود کے شہد کی سی مٹھاس بن کر ادھر ادھر اس کے گرد رہا کرتی تھی۔ اس کی کمر کا لوچ، میں سوچا کرتا تھا وہ ہاتھ لگانے سے یوں کچی کلی کی طرح دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ پر ایک شام جب پنگھٹ سے واپس آتے ہوئے راہ میں گلی سے آگے بڑ کی داڑھیوں کے قریب اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے گھڑا میرے سر پر دے مارا اور تن

کریوں کھڑی ہو گئی گویا اس میں کسی چیتے کی طاقت اور کسی شیر کی بہادری ہے ۔ میں نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سارا دھن جاتا ہوا دیکھ کر کہا تھا۔ سنتو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہے ۔ واہ گرو کی قسم تم مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہو۔ تو اس نے کہا تھا جو ان سرداری کے نشے میں نہ رہنا۔ بھلے آدمیوں کو دوسروں کی بہو بیٹیاں بھی عزت دار لگا کرتی ہیں تم نے مجھے سمجھا کیا تھا۔ اور تب مجھے معلوم ہوا تھا کہ سنتو کچی کلی کی طرح ٹوٹ نہیں سکتی تھی وہ تو چٹان کی طرح سخت اور کسی رانی کی طرح باوقار تھی۔ مجھے وہ شام کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگر مجھے یاد نہ رہے تو بڑ کی ان لمبی لٹکتی داڑھیوں کو یاد ہو گا کہ میں نے سنتو کے پاؤں پر سر رکھ دیا تھا اور اس نے اپنے پاؤں سمیٹ کر ایک آن سے میری طرف دیکھے بغیر گھر کی راہ لی تھی ۔ دوسرے دن جب ہم سب روز کی طرح تاڑی پی کر باغ میں گپیں مار رہے تھے تو تیجے نے کہا تھا۔ یار رات میں سنتو سے ملنے املی کے باغ میں گیا تھا تو میں نے اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ مار دیا۔ تیجے نے کرپان نکال لی اور قریب تھا کہ ہم دونوں لڑنے لگیں دوسروں نے درمیان میں پڑ کر صلح کروادی تھی، تیجا میری پھو پھی کا اکلوتا بیٹا تھا اور میرا ہم عمر تھا۔ آہستہ آہستہ یہ بات لڑکوں میں پھیل گئی کہ میں سنتو پر مرتا ہوں اس کا دیوانہ ہوں ۔ سب مجھ پر ہنستے ، مجھے چھیڑتے پر تیجا کبھی مجھے کچھ نہ

کہتا۔ بس سر جھکا لیتا یا کہیں ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ بچپن کے باوجود نہ جانے کیوں تیجے کی اس بات سے میرے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ ہم دونوں بڑے ہوتے گئے۔ دوڑوں کے مقابلوں میلوں ٹھیلوں میں ہم دونوں کئی بار اکٹھے گئے مگر ہمارے درمیان ہوا جیسے یخ بستہ رہتی۔ اس نے اور لڑکوں کی طرح کبھی مجھے نہیں چھیڑا۔ سنتو بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی ۔ سال دبے قدموں ہمارے قریب سے نکل گئے اور جب وہ دو بچوں کو لے کر گوبندی سے ملنے ہمارے گھر آئی تو میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور اُس نے بھی بنا جھجک کے مجھ سے باتیں کیں۔

ان دنوں آموں پر بور آ گیا تھا۔ کوئل رات کے وقفوں میں کو ہو کو ہو بولتی اور ہوا پر بڑی سوندھی پیاری اور انجان خوشبوئیں تیرتی رہتیں۔ رہٹ چلتے اور گادی پر بیٹھا لڑکا ہیر گاتا رہتا۔ اپنے دیس کا پیار ہے جوان۔ ہیر اپنی زندگی کا حسن ہے اور رانجھا اس زندگی کا عشق ہے۔ یہ محبتیں جو سنتو سے پہلے زندہ تھیں اور اس کے بعد بھی زندہ رہی ہیں۔ دو بچوں کی ماں سنتو سسرال سے میکے آ کر پھر واپس نہیں گئی۔ کیوں کہ واہ گرو کی قسم میں نے اُسے کاٹ کر اس کے ذرا ذرا سے ٹکڑے کر کے اُسی بڑ کی انہی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے اُسی جگہ دبا دیا تھا جہاں میں نے اُس سے کہا تھا "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

رات کا کوئی پچھلا پہر ہو گا۔ میں کھیتوں کو پانی دینے جا رہا تھا۔ باری تو اصل میں بلوچ کی تھی مگر میں نے اس سے کہہ کر اس رات پانی اپنے لیے لے لیا تھا۔ آخری راتوں کا چاند پرانے زمانے کی طرح آسمان کے کنارے پر ستاروں کے جھرمٹ میں چمک رہا تھا اور کھیتوں پر پھیلی چاندنی سوئی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ میں نے کھیس کندھے پر ڈال رکھا تھا اور ہاتھ میں پھاوڑا لیے تیزی سے گاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ مندر کے قریب موڑ سنسان سا ہے اور وہاں سادھو کی کٹیا بہت عرصہ سے خالی پڑی تھی جب کوئی مہاتما ادھر سے گزرتے تو بس اُسے چند دنوں کے لیے آباد کر جاتے پھر ویرانی ہوتی۔ اچانک میں نے دیکھا سامنے سے تیجا آرہا ہے۔ وہ بنا کچھ کہے میرے پاس سے گزر گیا۔ چند قدموں پر نمبر دار کے مکان کی وجہ سے وہ موڑ آج بھی اسی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جب میں دوبارہ سامنے آیا ہوں تو میں نے سنتو کو اس کٹیا سے نکل کر تیزی سے اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو میں دھوکا کھا جاتا مگر یہ سنتو کی چال تھی۔ یہ اس کی چوٹی تھی۔ اس کے جسم کے رنگ ڈھنگ اور پھر اس کی خوشبو۔ میں کہتا ہوں جوان مرد ساری عمر ایک ایسی ہی ان جانی خوشبو کو ڈھونڈتا نہ جانے کتنی عورتوں میں اُسے پانا چاہتا ہے۔ وہ خوشبو جو روحوں کی پاکیزگی اور ہیر کے حسن سے پیدا ہوتی ہے اور جو انسان کے

مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی اور فضا میں ڈولتی ہے۔ مگر تم یہ سب سن کر کیا لو گے۔ میں تو سنتو کی بات کر رہا تھا بڑ کی داڑھیوں کے پاس جا کر میں نے اسے پکارا۔وہ کھڑی ہو گئی۔اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں اُس کا کوئی نہ تھا۔ مگر وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا تم نے مجھے دھتکار کر تیجے کو پسند کیا تھا۔ تم ماں بن جانے کے بعد بھی اچھے برے کو نہیں پہچان سکی ہو۔ میں نے تمھارے نام سے اپنا سینہ آباد رکھا تھا۔اور اُس نے واہ گرو کی قسم اس نے داڑھیوں کے اندھیرے میں جب چاند چمک رہا تھا میرے منہ پر تھوک دیا تھا اور کہنے لگی تم اس کی جوتی کی برابری نہیں کر سکتے۔ تم تو کتے کے پلے ہو جو لٹکے ہوئے پلو کو دیکھ کر مالکن کے پیچھے چوں چوں کر کے چلتا ہے۔ اور واہ گرو کی قسم پھر مجھے غصے نے پاگل بنا دیا۔ مجھے صرف یہ سدھ رہی کہ میرے ہاتھ میں پھاوڑا ہے اور سنتو نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے۔ جب مجھے ہوش آیا تو سنتو ادھ موئی میرے پاؤں کے قریب پڑی تھی اور میں اس پر زور زور سے وار کر رہا تھا۔ میر اغصہ ہولے ہولے ٹھنڈا ہونے لگا اور میں ایک ایسے آدمی کی طرح جو تیزی اور جلدی سے کوئی ضروری کام کر رہا ہو۔ اپنی ساری طاقتوں کو اکٹھا کر کے سنتو کی لاش کے ٹکڑے کیے۔ نہ جانے تیزی اور کام کرنے کی طاقتیں کیسے اکٹھی ہو گئی تھیں کہ میں نے صبح ہونے سے پیشتر ان ٹکڑوں کو دبا دیا، جگہ برابر کر

دی اور خود کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے کنارے بیٹھا گاتا رہا۔ میری انگلیوں میں سنتو کے جسم کی نرمی بس گئی تھی۔ زندگی میں نہیں تو موت کے بعد سہی ۔میں نے انگ انگ اس کے جسم کو چھوا تھا۔ اس کے گلابی پھول کی خوشبو سونگھی تھی ان ریشی بالوں کو خون میں بھگو کر چوما تھا۔ سنتو زندگی میں میری محبوبہ تھی اور مرنے کے بعد بھی میری محبوبہ رہی۔

دوسری صبح شور مچ گیا سنتو کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے، اس کے نام پر گالیاں پڑتی رہیں۔ اس کے ماں باپ شرم سے منہ چھپا کر راتوں رات کسی دوسرے گاؤں چلے گئے اور سنتو کا نام ہمارے گاؤں سے مٹ گیا۔ میرے دل میں ہر وقت ایک غم تھا جو گھن کی طرح میری روح کو کھا رہا تھا۔ یہ غم نہیں کہ میں نے سنتو کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ یہ غم کہ اب سنتو کہاں ہے ۔میں ہر رات سپنے میں اُسے دیکھتا۔ مغموم صورت بنائے بال کھولے وہ آتی اور میرے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتی، پھر حسرت سے میری طرف کو تکتی رہتی اور آہ بھر کر اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگتی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ ان سپنوں نے مجھے اتنا پریشان کر دیا کہ میں جو سنتو کی موت کے بعد کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے کنارے بیٹھا گاتا رہتا تھا۔ سونے سے ڈرنے لگا۔ باپو نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے رام نگر جہاں میرا چچا رہتا تھا بھیج دیا۔

چاچے کے پانچ لڑکے بڑے ہی مضبوط جسموں والے اور بہادر جوان تھے۔ انہوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ کی مگر نیند سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ سادھوؤں، سنتوں، مہاتماؤں، جادو اتارنے والوں نے سب جتن کیے اور میں روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا۔ اور چھ ماہ کے بعد میں اسی طرح پریشان حال گاؤں لوٹ آیا۔

اور تب میں نے اندازہ کیا۔ میں نے دیکھا گوبندی کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر یونہی مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں بھی ناگن کی سی مستی تھی۔ اس کے پاؤں بھی زمین پر یوں پڑتے تھے جیسے روئی کے گالے ہوں۔ وہ بھی خزاں سے ناآشنا پھول تھی۔ ڈیوڑھی سے اندر گھسا ہوں تو سب سے پہلے بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھے ویر کہا کرتی تھی۔ ارے تم چھ ماہ میں کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میرا دل یکایک اس کے لیے نرمی، ملائمت اور محبت سے بھر گیا۔ وہ میری اکلوتی بہن تھی۔ اس کے پاؤں پر گویا پر لگ گئے تھے۔ کام کرتے ہوئے مڑ کر وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ ویر تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔ اتنے پیلے کیوں ہو گئے ہو۔ ماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی، میرا سر دبا رہی تھی اور میری بیوی کی طرف دیکھ کر پیار سے مسکرا بھی رہی تھی۔ میری بیوی جیتو

گھونگھٹ کی اوٹ سے سب سے نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی اور پھر گردن جھکا کر کام کرنے لگتی اور وہ میٹھی نگاہیں میرے جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھیں اس لیے کہ وہ نگاہیں مجھے پھر سنتو کی یاد دلا رہی تھیں۔ میں زندگی بھر ایک لمحے کے لیے اسے نہیں بھلا سکا۔

غموں اور دکھوں، مصیبتوں اور گناہوں کے بوجھ تلے دبا میں اسے کبھی نہیں بھول سکا۔ وہ آج بھی بڑ کی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے زندہ ہو گی۔ مجھے کبھی یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تیجے میں کیا تھا، اس کی شکل پر مجھے ہمیشہ آوارگی اور بدکاری لکھی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اسے کبھی آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

شام کو میری پھوپھیل اور خاندان کے اور لوگ ملنے آئے۔ اچھا خاصا میلہ، ساتھ تیجے کی بیوی بھی تھی۔ اس کی بہن تھی تھی۔ نئ بیاہی بہوئیں، کنواری لڑکیاں، بوڑھی عورتیں، جوان لڑکے، بچے، گاؤں میں ملنے والے جاننے والے سارا گاؤں ہی امڈ آیا تھا۔ گاؤں والوں کو یوں بھی ایک دوسرے سے بہت پیار ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں تیجا آیا تھا۔ سر پر بڑے تیز رنگ کی پگڑی باندھے گلے میں ہار پہنے بڑا بانکا لگ رہا تھا۔ آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میرا حال پوچھا۔ چاچا کی، رام نگر کی اور اس کے بیٹوں کی خیریت دریافت کی۔

گوبندی ادھر ادھر پھرتی جیتو کے ساتھ آنے والوں کی خاطر تواضع کر رہی تھی۔ دودھ کا گلاس لے کر وہ تیجے کی طرف بھی آئی۔ گلاس پکڑاتے ہوئے، میں نے دیکھا دونوں کی انگلیاں ٹکرائیں۔ گوبندی نے مسکرا کر تیجے کو دیکھا اور تیجے نے ایک لمحے کے بعد گلاس لے لیا۔ میں لیٹا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ خون ایک سنسناہٹ سے میری رگوں میں چلنے لگا۔ جیسے جسم میں کسی نے بھٹی جلا دی ہو۔ میرا ہاتھ بار بار اپنے پہلو میں لٹکتی کرپان کی طرف جاتا۔ مگر میں رک گیا۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ بڑی بوڑھیاں میرے سر پر ہاتھ پھیرتی، مجھے دعائیں دیتی اور ماں کے اکلوتے لڑکے کے لیے دعائیں کرتی بڑے دروازے سے نکل جاتیں، لڑکیاں، بچے، بہوئیں، میلہ ہولے ہولے کم ہو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف بندھی دس بارہ بھینسوں، گایوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹنٹنا اٹھتیں، جب وہ چارہ کھاتے کھاتے سر ہلاتیں یا ایک دوسرے سے زیادہ کھانے کی کوشش میں آگے بڑھ کر منہ مارتیں۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھیں گوبندی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ تیجا سب کے جانے کے بعد بھی بیٹھا ہوا تھا اور چارپائی پر بیٹھا آہستہ آہستہ ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

میں نے کہا" یار بڑی موج میں ہو" تو اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور کوئی جواب دیے بنا کچھ گنگنانے لگا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا " اچھا بھئی نرائن سنگھ میں چلتا ہوں۔" پھوپھی جو ماں اور جیتو کے ساتھ بیٹھی کسی کی بہو کا قصہ کہہ رہی تھی کہنے لگی "تیجے تو گھر چل میں آ جاؤں گی۔" مگر تیجا وہاں کھڑا رہا۔ بے مقصد ادھر ادھر دیکھتا رہا اور گنگناتا رہا۔ مجھے ہر گھڑی غصہ آ رہا تھا۔ آخر یہ اب جاتا مرتا کیوں نہیں۔ یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ گوبندی بھینسوں کے ناند کے قریب کھڑی کسی بڑے ضروری کام میں الجھی ہوئی تھی اور کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے زور سے کہا۔

"ماں گھڑے میں پانی کم ہے اگر کہے تو جیتو کے ساتھ جا کر پنگھٹ سے پانی لے آؤں۔" اور ماں نے اس طرح ہی باتوں میں الجھے ہوئے پھوپی سے کوئی کہانی سنتے کہہ دیا "ہاں جاؤ تم دونوں لے آؤ۔" پھر میں نے جیتو اور اپنی بہن گوبندی کو گھڑے اٹھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ یہ سارا تماشا میری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں صدیوں پرانا ایک بھوت ہوں جسے کہیں چین نہیں ملا۔ جس نے پاتال کی گہرائیوں اور آکاش کی بلندیوں پر بھی اپنے لیے سکھ نہیں پایا اور جو اب یہاں صحن میں اپنے گھر کی چارپائی پر لیٹا کسی کو دکھائی نہیں دے رہا۔

پھر تیجے نے بھی کہا "اچھا بھئی نرائن سنگھ میں بھی چلتا ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آنگن پار کر کے نکل گیا۔ صرف خون کی روانی سے سائیں سائیں کرتی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور کوئی بات مجھے سنائی نہ دے رہی تھی۔ چاند کے قریب تارے کا رنگ آنکھ میں اترے خون کی وجہ سے مجھے سرخ لگ رہا تھا۔ میں آگ میں بھن رہا تھا اور پھر اتنا لاغر ہونے کے باوجود میں بھی باہر نکل گیا۔ ماں کو اتنی سدھ ہی نہیں تھی کہ مجھ سے کچھ کہتی۔ پھوپی اور وہ اپنی باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

پنگھٹ کے قریب جا کر میں نے دیکھا کہ تیجا کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ جیتو اور گوبندی پانی بھر چکی تھیں اور گھڑے اٹھا رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا میں دور ہی سے لوٹ آیا تھا۔ لمبی گلی سے آتے مجھے دیر ہو گئی اور جب میں گھر میں گھسا ہوں تو گوبندی چاٹی میں دودھ ڈال رہی تھی اور جیتو چولہے میں آگ تیز کر رہی تھی۔ چاند کی تیز اور دیے کی مدھم روشنی کے سنگھم پر کھڑی گوبندی مجھے نہ جانے کیوں اتنی پیاری لگی۔ اس کے چہرے پر طمانیت کا ایک غرور تھا۔ ایک ایسا جذبہ جس کی سمجھ مجھے نہیں آئی۔ اس گھڑی مجھے یوں لگ رہا تھا گویا وہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کی سردار ہو اور جیتو، سنتو سب اس

کے سامنے پانی بھرنے والی کہاریاں اور اس کے ساتھ ہی تیجے کے خلاف پرانا غصہ میری رگوں میں گرم پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گھوم رہا تھا اور سپنوں میں رونے والی سنتو کی صورت مجھے چولہے کی آگ کے شعلوں میں نظر آنے لگی جیسے وہ ہنس رہی ہو۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔

پھر رات اور گہری ہو گئی۔ کام ختم کر کے گوبندی نے زور سے کہا "ماں آج ہم پھوپی کے گھر جا رہے ہیں وہاں ساری رات چرخے کاتیں گی۔ میرے حصے کا تیل دے دے۔" اور ماں نے کہا "اچھا تیری پھوپی بھی کہہ گئی ہے۔ تیرے ویر کو کھانا دے لوں۔ پھر چلتی ہوں۔ جیتو گھر رہے گی۔" اور جیتو نے گھڑے میں سے پانی ڈالتے ہوئے ذرا سا سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ مگر اس رات تو میں صرف گوبندی کو دیکھ رہا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں ماں میں گوبندی کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا چاہتا۔ مگر چپ رہا اور گوبندی کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ پھر پونیوں کا ڈھیر اٹھا کر اس نے ایک کپڑے میں باندھا میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ "ویر تیرا جی کیسا ہے۔ دودھ پی کر آرام سے سونا۔ ویر تم کتنے دبلے ہو گئے ہو۔ تمھیں کیوں یہ دکھ نہیں چھوڑتا۔" اس کی آواز میں اتنی اداسی تھی، اتنی سچائی تھی کہ اگر میری رگوں میں خون کی جگہ آگ نہ ہوتی تو میں گوبندی کو گلے سے لگا لیتا اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا اور

اسے کہتا۔ ”میری ننھی بہن میں صرف تیری دعا سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ مگر میں پتھریلے دل کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ ماں کے ساتھ پھوپی کے گھر چلی گئی۔

جیتو نے لمبا گھونگھٹ ہٹا کر بڑے پیار سے کہا ”اندر چلو جی اب تو بہت ٹھنڈ ہو گئی ہے۔“ مگر مجھے اس ٹھنڈک کا ہوش کہاں تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی بیٹھا رہا۔ رات نیلے آکاش کی چنری اوڑھے دھیرے دھیرے پائل چھنکاتی ہوئی ستاروں کی آنکھوں سے ہمارے گھر کے خالی صحن کو دیکھ رہی تھی جس میں گایوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹ گونج رہی تھی اور دہلیز پر بیٹھی جیتو اپنا سر دروازے سے ٹکائے میرے اندر جانے کے انتظار میں نہ جانے کب سے سو چکی تھی۔ ان دنوں دل کتنا دیوانہ تھا۔ میرے خون میں موت کا راگ تھا صرف موت کا۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا تھا جیسے مجھے خون کی پیاس لگ رہی ہو۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے انجانے ہی قدم پھوپی کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ نیچی حویلی کی دیوار کے قریب جا کر میں دیکھا گوبندی گھڑوں کے قریب کھڑی پانی پی رہی تھی اور تیجا بھی اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس سہانی اور تصویر کی سی رات میں میری بہن گوبندی اور تیجا۔

کمرہ لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا، کچھ سو رہی تھیں۔ دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں چرخوں کی گھوں گھوں تھی جو موت کا راگ معلوم دیتی تھی اور میٹھے مدھر سپنوں کے سے گیتوں سے ہوا بوجھل تھی۔ میں دہلیز میں کھڑا ہو گیا اور گوبندی جو ابھی چرخے کے سامنے آ کر بیٹھی ہی تھی گھوم کر دیکھنے کے بعد کھڑی ہو گئی۔ ''کیوں ویر کیا بات ہے ؟''

میری شکل دیکھ کر اسے اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ہو گی۔ ایک عورت نے جسے ہم سب ماسی کہتے تھے کہا ''نرائن سنگھ بچوں کی طرح ماں بہن کے پیچھے آیا ہے۔'' اور ہنس پڑی۔ ''ماں کہاں ہے'' میں نے بس یونہی پوچھا۔ اونچے ہارے کے پاس سوئی ماں کو پھوپی نے کہا ''بھابی نرائن سنگھ آیا ہے پوچھ تو کیا بات ہے۔'' پھر وہ مجھ سے کہنے لگی ''کیوں نرائن جی تو اچھا ہے لال۔ تو کیسا پریشان دکھائی دے رہا ہے۔'' میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے گوبندی کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کا رنگ دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں مٹی ہو رہا تھا اور جو اپنے چرخے کے پاس کھڑی تھی۔ پھر میری ممیری پچیری بہنیں بھی پریشان ہو گئیں۔ سب نے چرخے چھوڑ دیے اور اٹھ اٹھ کر دہلیز میں آ کھڑی ہوئیں۔ ''نرائن کیا بات ہے۔ نرائن ویر تیرا جی کیسا ہے ؟'' ماں نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر لے آئی۔ میں نے کہا ''گوبندی کو بھی ساتھ لے لو۔ نانے کے گھر

سے ہو آیا ہے۔ شاید اسے آج رات جانا پڑے۔" اور ماں حیران سی ہو لے سے بولی "چل گوبندی آ گھر چلیں۔" سب کو دہلیز میں کھڑا چھوڑ کر ہم سب چلنے لگے تو پھوپی کہنے لگی "کیوں بھابی میں بھی آؤں۔ کیا کوئی بڑے فکر کی بات ہے۔" اور ماں کی بجائے میں نے جواب دیا۔ "چھاؤنی سے نائی آیا ہے۔ باقی بات میں پھر بتاؤں گا۔"

گوبندی ہمارے پیچھے پیچھے ہولے ہولے چل رہی تھی جیسے راستہ کانٹوں سے بھرا ہو اور اسے سنبھل سنبھل کر قدم دھرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح کبھی ادھر ادھر دیکھتی اور آگے چلنے لگتی۔ اس کا چھوٹا سا دل نہ جانے کتنے زور سے دھڑک رہا ہو گا کیونکہ اس کے بعد تو مجھے پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اس کے گلے پر اپنا پاؤں دھر دیا اور وہ بے کس جانور کی طرح ویر کہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارے۔ یوں ایک کیڑے کی طرح جسے کوئی ذرا سی انگلی سے روندے۔ میں نے گوبندی کو ہٹا دیا۔ اپنی اس بہن کو جس کے بعد آج تک مجھے کسی نے ویر نہیں کہا۔ ان آنکھوں کی حسرت مجھے کبھی نہیں بھولی۔ ایک لمحے کے لیے بھی۔ جیتو کی آنکھیں خوف سے کھلی ہوئی تھیں اور ماں یوں گم سم بیٹھی تھی

جیسے پتھر ہو۔ اگر ان دونوں میں ایک بھی ذرا سی حرکت کرتی تو اس کا انجام بھی شاید یہی ہوتا۔

اگر تیجا اتنا بانکا نہ ہوتا تو شاید میری کہانی مختلف ہوتی۔ میری زندگی کے قصے میں اور رنگ ہوتا۔ میں نے یہ زندگی حویلی میں بند ایک زخمی جانور کی طرح پھر کر گزارنے کی بجائے اور طریقے سے گزاری ہوتی۔ اگر تیجا عورتوں کو لڑکیوں کے دلوں کو باندھنے اور انھیں بے بس کرنے والا جادو نہ جانتا ہوتا تو آج گوبندی زندہ ہوتی۔ میرے لیے بھی دنیا کی خوشیاں ہوتیں۔ مگر گوبندی کو میں نے مار دیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے اسے اناج کی کوٹھیوں سے بھرے کمرے میں دبا دیا اور پیپل کی چھاؤں تلے سے گوبندی کی ڈولی کبھی نہ گزری۔ ہمارے آنگن میں سہاگ بھرے گیت کبھی نہ گونجے۔ ہمارے دالانوں میں مہندی کی ہلکی خوشبو کبھی نہ اڑی۔ گوبندی کے بعد سے یہ حویلی ویران ہے۔ اس کے بڑے بڑے دالان ڈھولک کی تھاپ سننے کا برسوں انتظار کرتے رہے اور پھر بوڑھے ہو گئے۔

اگر تیجے کو میری اس کمزوری کا یقین نہ ہوتا کہ میں اس سے جلتا ہوں تو آج بھی وہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر نیلی دھول اڑاتا ہوا چوڑی گلیوں اور بڑ کی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے سے گزرا کرتا۔ مگر اسے میری اس کمزوری کا یقین تھا اور

اسی لیے اپنی شکست کو روز اس کی آنکھوں میں پڑھنے کی بجائے میں نے اسے مار دیا۔

نہر کے پل کے قریب گھنے درختوں کی وہ رات کبھی نہ بھولے گی جب اماوس اپنی ساری تاریکیوں سمیت گزر رہی تھی اور تیجا ماہیا گاتا گھوڑی کو دلکی چلاتا بڑے گھراٹ سے گھر آ رہا تھا اور وہ نشے میں دھت تھا۔ اس نے دوسرے گاؤں میں پیٹ بھر کر تاڑی پی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ شاید اس رات گاؤں کے کسی موڑ پر کوئی سنتو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید اس گھڑی بھی کسی دالان میں نکل کر کسی گوبندی نے پانی پینے کے بہانے اس سے بات کرنی تھی۔ مگر میں نے ان سب کو انتظار کرنے دیا۔ میں نے اس پر پیچھے سے وار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا آج پچھلا بقایا ادا کرو اور اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"نرائن سنگھ واہ گرو کی قسم ساری زندگی تو نے آج ایک بات کام کی، کی ہے۔ میں تو کب سے سوچ رہا ہوں۔ اگر تجھ سے حساب کتاب نہ ہو سکا تو کیا ہو گا۔" اور اس نے اپنی لمبی کرپان نکال لی تھی اور گھوڑی کو درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر میں بھی اپنی گھوڑی سے نیچے اتر آیا اور ہم خاموش چپ چاپ لڑتے رہے۔ صرف کرپانوں کے ٹکرانے سے اندھیرے میں چنگاریاں اڑ

رہی تھی۔ تیجے کے بازوؤں کی قوت کا احساس مجھے اس رات ہوا تھا۔ اپنی برتری اور غصے کا پتہ بھی مجھے اس رات ہی چلا تھا۔ اس کے ہانپنے کی آواز میرے کانوں میں فتح کے گیت سے بھی زیادہ سہانی ہو کر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم تھا میں اپنی باقی ساری زندگی لڑ سکتا ہوں۔ میرے خون کی گرمی اور غصے کی آگ نے مجھے دیو بنا دیا تھا۔ ورنہ تیجے کے سامنے جاتے تو لوگ کانپا کرتے تھے۔ اس نے کہا "نرائن سنگھ موت یقینی ہے مگر میں تجھ سے رحم کی بھکشا نہ مانگوں گا جو جی چاہے کرو۔" اور اس نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ مگر میری کرپان کی کاٹ بڑی گہری تھی۔ تیجا گر گیا اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی گھوڑی رسہ تڑا کر نہ جانے کب کی گھر بھاگ گئی تھی۔ مجھے اس رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میں نے پہلے نہر سے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر کرپان کو مل مل کر دھویا اور اس کے بعد اپنی گھوڑی کو کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ زندگی میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔

جس رات میں نے تیجے کو مارا ہے۔ میری زندگی کے سارے دکھ سکھ ختم ہو گئے۔ میں بھی اسی رات وہیں مر گیا اور آج تیس سال پہلے کی بات ہے میرا بھوت حویلی کے دالانوں میں یونہی چکر لگایا کرتا ہے۔ مجھے کبھی کوئی یاد نہیں آتا پر گوبندی کے لیے میرا جی تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک کسی

نے مجھے ویر نہیں کہا۔ نہ جانے اس کا ننھا سا دل اس رات کس زور سے دھڑکا ہو گا۔ یہ راز میں نے تیس سال اپنے سینے میں چھپائے رکھے ہیں۔ پر آج ان کے بوجھ سے میرا دل پریشان ہو گیا تھا اور میں تیس سال میں پہلی بار حویلی کو چھوڑ کر نہر کے کنارے اس پل تک گیا تھا جہاں اماوس کی آخری رات ہم نے ایک دوسرے سے ٹکرانے میں اپنے اپنے حساب کتاب سمجھے تھے۔"

ہم سب خاموش تھے۔ نرائن چاچا بجھتی ہوئی آگ کرید رہا تھا۔ شاید اسے گوبندی یاد آ رہی تھی۔

پرانے گیت

رتنم کے بعد میرا گیت سر نہیں پا سکا۔ رتنم کے بعد میرے گیتوں کے بول ادھورے ہیں اور پھر بھی وہ کبھی میری نہ ہو سکی۔ آج اپنے سے پوچھتا ہوں تو کوئی جواب نہیں پا سکتا۔ کیا میں نے رتنم کو چاہا تھا؟ اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ صرف دھڑکن ہے جو بھاری بوجھ کی طرح دل کو نیچے کھینچتی ہے اور چاہت بھی کیا ہے؟ اپنے وجود کے تقاضوں سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکا اور اسی لیے رتنم کے چرن چھونے کی ایک دھیمی سے خواہش ہولے ہولے میری رگوں میں آگ بن کر بسنے لگی۔ پتہ نہیں وہ ساری پوترتا اور ساری سندرتا جو ہمارے جنم کی گھڑی اکٹھی ہوتی ہے دوسرے دیس میں آن کر کہاں بھاگ جاتی ہے اور زندگی صرف چھونے، محسوس کرنے کے احساس تک ہی کیوں محدود ہو جاتی ہے۔

"رتنم تم سے ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" اس نے برش ہاتھ سے رکھ دیا اور ساڑھی کے پلو سے انگلیاں پونچھتی ہوئی میرے قریب آن بیٹھی۔ میں اسے کیا کہتا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک

رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ اس کے قرب اور وجود کے احساس سے میرا سانس رک رہا تھا۔ کائنات تھم گئی تھی اور ساری آوازیں ڈوب گئی تھی۔

رتنم عورت نہیں ایک خواب تھی۔ اندھیرے کی طرح اپنے اندر آپ چھپی وہ یورپ کے اس بیگانے شہر میں ہمیں کتنی اپنی لگتی تھی۔ دیے کی طرح جلتی ہوئی، شعلے کی طرح لرزاں۔ وہ ہم سب کے لیے پگڈنڈی تھی جس سے ہم اپنی سمتوں کا تعین کر سکتے تھے۔ مگر میں نے اپنے ہاتھوں سے اس راہ کو کھو دیا۔ زندگی کی سردی میں محبتوں کے اس دیے کو میں نے ہاتھ بڑھا کر خود ہی بجھا دیا۔

رتنم سے تم عام باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ موسم کی باتیں، شہری پارٹیوں کی باتیں، لڑکیوں کے حسن کے قصے، اس کے پاس آ کر بکواس لگتے کیونکہ رتنم بالکل معمولی لڑکی تھی۔ اس کو ملو تو کبھی یوں نہیں لگتا کہ تم کسی بڑے واقعے سے دوچار ہو رہے ہو۔ کسی کیفیت میں سے گزر رہے ہو۔ کوئی سرور محسوس کر رہے ہو۔ نیند کی طرح رتنم کے وجود کا احساس انسان کو جب ہوتا تو وہ اس کی شخصیت کی جاذبیت میں بہہ چکا ہوتا۔ اس میں کوئی بلندی نہ تھی۔ تم اس سے مل کر خوش نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے کو کسی پرانے گیت کا بڑے درد سے دہرایا جانے والا بول محسوس نہیں کرتے کچھ بھی تو نہیں ہوتا تھا کیونکہ

رتنم کی آنکھوں میں ستاروں کی جوت نہ تھی۔ اس کے بالوں میں لہریئے نہ تھے۔ وہ زور سے قہقہے نہ لگاتی تھی اس کی گرمجوشی میں ایک سردی ہوتی جس کو تم کبھی کبھار اپنی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا محسوس کر سکتے تھے۔ اسے یاد کر کے کسی کا دل کبھی دکھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر بھی رتنم کے بعد میرا گیت سر نہ پا سکا۔

جب میں رتنم سے پہلے پہل ملا تو وہ اپنی کم عمری کے باوجود پتہ نہیں کچھ کچھ ماں جیسی لگی شاید اس لیے کہ وہ ساڑھی پہنتی تھی اور اس پر دوسرے دیس کے رنگوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سر کو پلو سے ڈھانپ کر چلتی تھی وہ ساری باتیں جو مجھے پیاری تھیں اسے دیکھ کر یاد آنے لگتیں۔ آم کی خوشبو، زمین کی باس، رات کی سیاہی، پروا کا لمس اور تلسی کے پودے کی نرمی۔ یہ ساری چیزیں جب میرے خیالوں پر ابھرتیں تو پہلے ماں یاد آتی اور پھر ہولے ہولے رتنم آن کھڑی ہوتی۔ میلی سی مورتی جو سنہرے غبار میں لپٹی ہو اور جس کے گرد سامگری کی خوشبو ہو۔

رتنم بہت آہستہ بولتی تھی اس کی بات سننے کے لیے اپنا سانس روکنا پڑتا تھا جب وہ کسی کی طرف دیکھتی تو لگتا اس کی نگاہیں دلوں کو ٹٹول رہی ہیں۔ پتہ نہیں اس میں یہ شکتی کہاں سے آئی تھی۔ تم اس کی طرف بری طرح نہیں کھنچ

سکتے تھے۔ پر تم اسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی جاذبیت اور کشش دھوپ کی طرح زندگی بخش اور چاند کی کرنوں کی طرح آسودگی بخشتی تھی۔

اتنے بہت دنوں بعد رتنم کو یاد کرتے ہوئے مجھے دھیان نہیں پڑتا کہ کون مجھے اس تک لایا تھا۔ یا پتہ نہیں جن دو دلوں کو ملنا ہو وہ دنیا کے کناروں سے چلتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے سینے میں بند ہو جاتے ہیں۔ پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی میں رتنم کے پیچھے اس کے لیے غلط باتیں نہیں کہوں گا۔ رتنم کو کبھی پتہ نہیں چل سکا کہ میں نے اسے چاہا بھی تھا۔ وہ ساری دنیا کی رادھا تھی اسے کیا پرواہ کہ اسے کون یاد کرتا ہے اور کون بھلاتا ہے۔ وہ تو بس حاکم تھی پر اس نے کبھی کوئی حکم نہیں دیا۔ ہمیں سدا یہ حسرت ہی رہی کہ ہم اس کے کسی کام آ سکیں۔ ریاض سے جب اس نے سنا کہ میرے پاس تان پورہ ہے اور میں گا سکتا ہوں تو کہنے لگی۔ ”کسی دن میرے سٹوڈیو آؤنا۔“

میں نے سمجھا تھا تان پورے میں میری اور رتنم دونوں کی آوازیں گم ہو جائیں گی۔ ہم دوسروں کی طرح نہیں تو کم از کم دو انسانوں کی طرح آپس میں گھل مل جائیں گے۔ گھر سے دور یورپ کے اس دھند سے بھرے کثیف شہر میں لوگوں سے بھرے ریستورانوں اور شراب کی بو سے بوجھل ہوا میں بیٹھ کر

میں دوستوں سے اس کے جسم کے خطوط اور اس کی آنکھوں میں پھیلتی مدہوشی کی باتیں کر سکوں گا۔ کافی کے پیالے کھڑکیوں کے کھنچے ہوئے پردوں، راتوں اور روشنیوں کے قصے میری زندگی کو رنگین کر دیں گے۔ یورپ میں ہر شخص اسی شے کا متلاشی ہوتا ہے۔ سستی خوشیاں کم قیمت پر وصول کر کے تنی ہوئی رسی پر جذبات کا ناچ ناچتے ہوئے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے کہ تم زندگی سے دوچار ہو رہے ہو۔ لڑکیوں اور پارٹیوں میں خوشی سے گلے مل سکتے ہو۔ اتنے مصروف ہو کہ تمھارے اندر بھی قہقہے گونجتے ہیں۔ تم زندگی کے دھارے میں نہا سکتے ہو۔ کوئی حسرت باقی نہیں رہتی۔ تمھارے ذہن کے پس منظر میں ہر وقت نغمہ و نور ہوتا ہے۔ میں رتنم سے ملا تو میں نے سوچا اتنی بہت لڑکیوں سے عشق کر چکنے کے بعد میں چالاکی سے اسے دام میں گرفتار کر لوں گا۔ مجھے ریاض سے اس کی باتیں سن کر بھی اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ چند دنوں کی بات ہو گی۔ پھر تان پورے کے تار ڈھیلے ہو جائیں گے۔ مضراب کھو جائے گا۔ انگلیاں تھک جائیں گی اور کھڑکیوں کے پردے کھل کر میری زندگی کے ایک اور باب کو ڈھانپ لیں گے۔ ڈراپ سین، اندھیرا اور چور چور جسم۔ بند بند میں درد اور روح کی شکست، ذہن کا خلا

جس کے احساس کا شکار میں اس بھری پری ہنستی کھیلتی دنیا میں بھی اکثر ہو جایا کرتا تھا۔

رتنم کی لاتعلقی میں بھی ایک تعلق تھا۔ اس کے سٹوڈیو میں بیٹھ کر ایک لمحے کو بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ تم اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔ تصویر بناتے بناتے وہ مڑتی اور بات کر کے پھر کام کرنے لگتی مگر جب میں پہلے دن ریاض کے ساتھ اس کے سٹوڈیو میں گیا تو مجھے یقین تھا کہ یہ معمولی سی لڑکی رتنم مجھے پا کر کتنا خوش ہو گی۔ میں سدا محبوب بنا رہا ہوں۔ ہر کہانی کا ہیرو۔ ہر لمحے کا مرکز، ہر مجلس کی رونق۔ مجھے اپنے سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ میں بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا تھا۔ فتح کا غرور آنکھوں میں شیری کے نشے کے ساتھ اور بھی زیادہ چمک رہا تھا۔ میں ہر بار اپنی دلداری کرتا تھا اور خود اپنے وجود کی تکمیل سے مطمئن تھا۔

ریاض اور میشور رتنم کے ساتھ کسی تحریک کا ذکر کرنے لگے۔ گفتگو اتنی ذاتی تھی کہ میں اس میں حصہ نہیں لے سکتا تھا اور میں دیواروں پر لٹکتی تصویروں اور کونوں کے ساتھ زاویے بناتی لکڑی کی چھت کو دیکھتا رہا پھر بکھری کتابوں کے سنہری حروف میں لکھے نام پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آنے لگی۔ ان تینوں کی باتیں میرے کانوں میں شہتوت کے درخت پر مدہوش مکھیوں کی ہوا کے

ریلے کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور کم ہوتی جھنجھناہٹ کی طرح بڑھنے لگیں۔ نیند کا ہلکا سرور مجھ پر لہروں کی طرح چھا گیا۔ رتنم کی آواز خواب میں قریب آتی آہٹ کی طرح میرے دماغ میں گونج بن کر پھیلتی گئی پھر تان پورہ میرے ہاتھ سے لڑھک کر زمیں پر گرا اور میں جاگ گیا۔

رتنم نے جب تان پورے کو اٹھا کر اس کے تاروں پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے پھر ماں جیسی لگی۔ ویسی ہی جوان اور بھگوان کی سی خوابوں سے بھری آنکھوں کو جھکائے بڑی معمولی سی لڑکی۔ میں جسے لفظوں کے جادو کا احساس تھا اور جسے اپنی آواز سے عشق تھا ساری سہ پہر بنا بولے وہاں بیٹھا رہا تھا۔ میں نے کہا "اب میں جاؤں گا۔"

رتنم نے ہولے سے کہا "نہیں تم ابھی نہیں جا سکتے۔" اور مجھے لگا جیسے کسی طاقت نے ان جانے ہی مجھے اپنے قابو میں کر لیا ہو۔ میں اس حکم کو ماننے پر مجبور تھا اور پھر بھی میرا دل اس کی طرف نہیں کھنچ رہا تھا۔ وہی تنہا عورت ہے جس کی شدید تمنا کے باوجود میں اسے چھو نہ سکا جس کے لمس کے لیے اندھیرے میں میں صدیوں منتظر رہوں گا جو میرے دکھی دل کے روگ اپنی مسکراہٹ سے بدل سکتی ہے۔

میرا دکھ اسی طرح ہے کیونکہ رتنم نہیں ہے۔ رتنم ہوتی بھی تو میرے دل کا دکھ کبھی نہ مٹتا۔ پتہ نہیں مجھے اس سے محبت تھی بھی کہ نہیں۔ رتنم نہیں ہے اور دکھ زندہ ہے۔ پتہ نہیں خوشیوں کی زندگی اتنی کم کیوں ہوتی ہے کہ اس کے بنا زندگی کو اپنا وجود تاریک راہوں سے گھسیٹ کر کسی نہ کسی منزل کی تلاش میں بھٹکتے رہنا پڑتا ہے۔

اوم شانتی۔ شانتی۔ شانتی۔

جب رتنم نے تان پورہ بجانے سے پہلے اسے ماتھے پر چڑھایا اور تاروں کو چوما تو میں حیران رہ گیا۔ پھر مضراب کو انگلی میں گھما کر بولی۔ ”بھگوان مجھے شکتی دے اور دھیرج بھی۔“ اور میں جو ہر بات ٹھیک طریقے سے ٹھیک وقت پر کہنے کا عادی تھا ہنس کر بولا۔ ”آخر دھیرج چاہنے سے کیا ہو گا اور شکتی تو جتنی ہے اسے ہی سنبھالو تو ٹھیک رہے گا۔“

رتنم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے پہلی بار لگا جیسے میں نے کوئی بہت غلط بات کہی ہو۔ اس کے بعد سے میں نے رتنم کے سامنے کبھی زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اسے تان پورہ بجاتے دیکھ کر مجھے لگا جیسے عورت کے وجود میں ایک زہر ہے جو رگوں میں پھیل سکتا ہے جو بے چین کر سکتا ہے اور جس سے بچ کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ صرف حسن ہی میں طاقت نہیں۔ خوب

صورتی ساری شکتی نہیں۔ شکتی کا ایک حصہ ہے بڑا معمولی سا جسے بھلایا بھی جا سکتا ہو۔

رتنم امر تھی وہ شانتی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں بہت سی باتیں تھیں انھیں کہنے کی تمنا تھی مجھے اپنی زبان پر ناز تھا لفظوں کے دھارے کی نرم رو میری روح میں سے باہر نکلنا چاہتا تھی میں اسے بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا رتنم کے بنا زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا۔ میرے بازوؤں میں اینٹھن تھی وہ ساری محبتیں جو میں نے شراب پی کر نیم وا آنکھوں کے کونے سے چہرے پر بھرپور نظر ڈالنے والی لڑکیوں سے کی تھیں مجھے بکواس لگتی تھیں۔ گذری زندگ ایک غلط سانحہ لگ رہی تھی۔ میں اتنے سالوں کے بعد اپنے وجود کو گم ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

پھر رتنم کا سر تان پورے پر جھک گیا وہ رو رہی تھی۔ میں نے سوچا اب میں اسے چپ کرا سکتا ہوں۔ زندگی ایک گیت بن جائے گی جسے گا کر ہم دونوں مطمئن ہو جائیں گے۔

میں نے کہا۔ ”رتنم تم رو کیوں رہی ہو۔“

رتنم نے سر اٹھا کر غصے سے میری طرف دیکھا جیسے میرا وجود اس کے سٹوڈیو میں قطعاً فالتو شے ہو اور میں نے غلط بات کہی ہو۔ اس کی وہ نگاہ مجھے کبھی نہیں

بھولی۔ میرا تجربہ اس کی حیرت سے شکست کھا گیا۔ میری زندگی میں یہ پہلی ناکامی تھی۔ اس کے بعد میں نے کبھی رتنم کو نہیں پکارا۔

رتنم کو نہیں پکارا تو کیا ہوا میری روح میں اس کے قدموں کی گونج ہے۔ اس کی چاپ جو کبھی قریب آتی ہے اور کبھی دور ہو جاتی ہے جیسے کوئی خواب میں چل رہا ہو۔

ایک دن میں نے ہمت سے کہا۔ ''مجھے بہت کچھ کہنا ہے میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔''

رتنم نے کہا۔ ''کہہ ڈالو شاید اس سے تمھارے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے تمھیں شانتی مل سکے کہہ بولو۔''

اور مجھے اپنے جذباتی پن پر بڑی شرم آئی میں اسے وہ عام باتیں کس طرح کہتا۔ ایسی باتیں جو ہر چاہنے والا مرد کسی نہ کسی عورت سے زندگی میں ضرور کہتا ہے۔ اور میں اپنے آپ سے بھاگتا اپنے سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کے اسٹوڈیو سے آگیا۔ میں نے اپنے جی سے وعدہ کر لیا کہ کبھی رتنم سے نہیں ملوں گا جب وہ میرے دل کی بات جانتی ہے تو پھر بتانے اور کہنے سے کیا فائدہ۔

کتنی ہی راتیں میں نے زخمی جانور کی طرح اپنے کمرے میں چکر لگا کر گزار دیں مگر لندن کی ساری جل پریاں اور حسین شاموں کی مدہوش کرنے والی رونق

میرے لیے ختم ہو چکی تھی ناچنے اور تلخ شراب پی کر حلق میں کانٹے چبھونے والی خوشی کو تلاش کرنا میرے لیے بے معنی تھا۔ خوشی جسے محسوس کرنے کی کوشش کرو تو لگتا ہے جیسے بھاری پتھر سے بندھی ہستی نیچے ڈوب رہی ہو۔ ڈوبتے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارو تو اپنی ناکامی کا اور بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ ریاض اور میشور میری حالت سے بے خبر تھے وہ ہمدردی کے بہانے میرے زخموں کو کریدتے۔ پر زخم بھی کہاں تھے۔ یہ تو ایک خود سے پیدا کردہ دکھن تھی۔ یا میں اس دور سے گزر رہا تھا جب انسان دکھ سے پیار کرتا اور دکھی ہونا چاہتا ہے۔ میں رتنم کو بھلانا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ سے بدلہ لے رہا تھا۔

اگر میں رتنم سے کوئی بات نہ کہتا تو شاید یہ جلن جو آج میرے سینے میں ہے ٹھنڈک میں تبدیل ہو سکتی اور اس خلاء سے میرا سینہ آباد نہ ہوتا جسے اس کی چاہت نے پیدا کیا تھا۔ اس خلاء میں نہ خواب جاگتے ہیں نہ روشنیاں نہ اندھیرا ہے۔ انسان میں بار بار عشق کرنے کی طاقت کہاں سے آسکتی ہے۔

مگر محبت اظہار چاہتی ہے اور جب رتنم آنکھوں کی زبان نہیں سمجھ سکی تو میں نے اسے اپنے دل کا حال لفظوں کے سہارے بتانا چاہا۔ مجھے لفظوں سے بھی عشق ہے نرم رو دھارے کی طرح بہتے اور مختلف شکلیں اختیار کرتے لفظ مجھ پر جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ میں اپنی آواز کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہوں مجھے اپنے

سے بھی بہت محبت ہے۔ رتنم کی چاہت نے مجھے آزار پسند بنا دیا تھا مگر پھر بھی روح کی تہوں کے نیچے چھپی اپنے میں گم ہونے اور اپنے بچانے کی طاقت مجھے مجبور کر رہی تھی تب بہت دنوں بعد وہ میرے پاس خود آئی تھی۔

کمرے کے سامنے کھڑی بولی۔ ”میں اندر آسکتی ہوں؟“

اور پھر وہ میرا جواب سنے بنا اندر آ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری ماں کی ڈولی آموں کے بور سے بھرے راہ پر سے ہو کر گھاٹ پر آن اتری ہو اور دوسرے لمحے میرا دل اس کی شدید چاہت سے بھر گیا اس کی تمنا نے مجھے پاگل بنا دیا۔ میں نے آج تک اپنے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ آخر میں اپنے آپ سے ہار جانا پڑتا ہے۔ انسان دوسروں سے جنگ کر کے جیت سکتا ہے پر اپنے سے جیتنا بڑا مشکل ہے۔

میں نے کھڑکی میں کھڑے اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔ ”رتنم تم کیوں آئی ہو؟“

بولی۔ ”تم مجھ سے ناراض ہو گیا؟ اپنی تان پورہ لینے بھی نہیں آئے۔ اور میں اس اجنبی دیس میں تمھیں پا کر بہت خوش تھی۔ یوں جیسے تم میرے ماں جائے ہو۔“

”رتنم“ میں نے چیخ کر کہا۔

"کیا ہے؟" وہ حیرت سے میری طرف تکنے لگی۔ "کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے۔ تمھیں تکلیف دی ہے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اگر رتنم اس لمحے واپس چلی جاتی تو آج یہ احساس گناہ میرے دل کو یوں نہ مسلتا۔ میں نے جو ساری عمر ایک گناہ گار کی طرح اپنے سے بچنے میں گزاری ہے کچھ اور ہوتا۔ مگر المیہ تو یہی ہے کہ رتنم میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میں نے بھاگ کر اسے زور سے پکڑ لیا۔ ہوا ہم دونوں کے گرد رونے لگی۔ ساری روشنیاں بجھ گئیں اور صرف یہ درد کا احساس جاگتا رہا۔ یہ کھو دینے کا احساس جو اب تک ہے میرے بازو جو آگ میں جلتے رہتے ہیں کاش میں انھیں اپنے جسم سے علیٰحدہ کر سکتا۔ کبھی کبھار جی چاہتا ہے میں سینہ کھول کر دل کو نکال لوں اور اس کے ریزے ریزے کر کے ہوا میں بکھیر دوں یہ پاگل دل۔ وہ چاہت جو ایک طعنے کی طرح رتنم کی آنسوؤں بھری آنکھوں کے نیچے جنم لے کر اب تک زندہ ہے۔ وہ شعلے کی طرح تڑپی اور میرے بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔ اس کے بعد میں نے کبھی رتنم کو نہیں دیکھا کبھی نہیں۔

لمحے واپس نہیں آتے۔ وقت بیت جاتا ہے۔ زندگی بہر طور گزر جاتی ہے۔ جب میرا جہاز روانہ ہونے لگا تو ریاض نے بڑے دکھ سے کہا۔ "پتہ نہیں رتنم کہاں گئی؟ اب تم گھر جاؤ گے تو یہ تک بھول جاؤ گے کہ کسی بلند عظیم اور رتنم

جیسی پوتر عورت سے مل چکے ہو۔ پتہ نہیں رتنم کہاں ہے؟ وہ کس شے کو ڈھونڈتی رہی تھی؟"

اس ٹھاکر دوارے میں آم کے گھنے سایوں تلے بیٹھا آدھی زندگی گزارنے پر بھی میں اسے بھلا نہیں سکا کاش مجھ میں ذرا کم ہمت ہوتی مجھے اپنی طاقت پر ذرا کم ناز ہوتا۔ اپنی تکمیل سے کم طمانیت ہوتی۔ عورت جو ہمارے لیے وقتی خوشی اور دم بھر کی رونق ہوتی ہے۔ رتنم میں کہاں تھی۔ وہ ساری عورتیں جن سے میں نے راہ کے کنارے، ٹیوب سٹیشن پر اور یونیورسٹی میں چاہت کا ناطہ جوڑا آج کہاں ہیں۔ کیا میں بھی کسی کے لیے ایسی دکھن بن سکا ہوں؟ اور یہ سوال کہ رتنم ایسی کیوں تھی اب تک ویسا ہی ہے۔ پتہ نہیں ایک نگاہ کے کم ہونے سے ساری دنیا اندھیر کیوں ہو جاتی ہے۔ ہم نئی اور پرانی روایتوں کے دوراہے پر آخر کس شے کے منتظر ہوتے ہیں۔ کس خوشی کے حصول کی خاطر زندہ رہتے، کوشش کرتے اور مر جاتے ہیں؟

ہمارے لیے زندگی صرف چھونے اور جسم کے احساس تک کیوں محدود ہے۔ ہمیں نہ محبت شانتی دے سکتی ہے اور نہ مکتی۔ ہم زندگی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ لمحوں کے جادو میں شدت سے قید ہیں۔ ہم اچھائی اور سچائی کی نہیں صرف عورت کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ ہمارے لیے کسی تلاش کی

گنجائش نہیں۔ ہماری ساری جنگیں اپنے سے پٹنے اور اپنے سے شکست کھانے میں ختم ہو جاتی ہیں۔

رتنم کو کھو کر میں کبھی خوش نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد میرا گیت کبھی سر نہیں پا سکا۔ وہ بھی شاید ایسا بول تھی جو کسی گیت میں ڈھل نہ سکی۔ وجود کے شدید احساس کا شکار وہ بھی تھی۔ پر جب میں نے اس کے لیے یہ ساری باتیں جان لیں تو وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں آخر ہم ساری عمر کسی شے کو کھوجنے میں گنوا دیتے ہیں یا ہمیں کسی شے کی چنتا نہیں۔ نہ کسی گیت کی اور نہ کسی سر کی!

برہا کی رات

دکن سے پریم سنگھ کا خط آج ہی آیا ہے، ایک پرزہ کاغذ ہے صرف ایک پرزہ۔ پریم سنگھ کو نہ میں نے کبھی دیکھا ہے اور نہ ہی اس نے مجھے۔ پر موہن سنگھ کے مرنے کی خبر اس نے صرف مجھے لکھی ہے صرف مجھے۔ مرتے سمے اس نے پریم سنگھ کو تاکید کی ہو گی کہ میں دور پنجاب دیس میں بیٹھی موہن سنگھ کے مرنے پر ضرور دکھی ہو جاؤں گی کیونکہ میں جو اور بہت سی عورتوں کی طرح اس کی مالکن ہوں اس کی طرح بوڑھی ہو رہی ہوں مرنے کی راہ دیکھ رہی ہوں اس خبر کو سن کر دو آنسو ضرور گراؤں گی۔ انسان کو یہ تسلی کہ دنیا کے کسی کونے میں کوئی اور اس کے اپنوں سے الگ اس کے نہ ہونے سے رنجیدہ ہو گا کتنی بہت ہوتی ہے۔ انسان مرنے کے بعد بھی اس دنیا سے کوئی نہ کوئی رشتہ محسوس کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟

آج بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلے پہل موہن سنگھ کو کب دیکھا تھا۔ جب یکا یک میں نے ہوش سنبھالا ہے تو اسے اپنے گھروں میں آتے جاتے، پانی

بھرتے اور گاتے پایا۔ اس سے پہلے اس کے کندھوں پر سوار ہو کر ہم میلہ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ بڑے بھیا، میں، جیجی سب ایک ساتھ ہی تو بڑھے اور بڑے ہوئے تھے۔ جیجی مجھ سے یہی کوئی ایک سال بڑی تھیں۔ شرارت ان کی نس نس میں بھری تھی ایک منٹ کو نچلی نہ بیٹھتیں۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود گھر میں زور زور سے گاتیں۔ بھیا ان کی چٹیا پکڑ کر کھینچ لیتے تھے۔ پھر دونوں میں خوب زور سے لڑائی ہوتی۔ ماں رسوئی گھر سے پہلے تو پکارتی رہتیں۔ جب لڑائی نہ تھمتی تو اٹھ کر آتیں اور سب سے زیادہ مار جیجی کو پڑتی اور ادھر سے موہن سنگھ نہ جانے کہاں سے آ جاتا۔ آنگن میں سے ہی شور مچاتا ہوا ”بڑی بہو ہاتھ روکو پھول سی بچی کو مار رہی ہو۔ بھلا کوئی کنیا کو بھی مارتا ہے۔ لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں نہ جانے تم لڑکیوں کے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہو۔“ اور میری ماں اپنا ہاتھ روک کر چپکے سے واپس رسوئی گھر میں چلی جاتیں۔ موہن سنگھ ہم سب کو اپنے گرد جمع کر لیتا۔ بھیا کو کہتا ”دیکھو لالہ اگر بٹیا سے معافی نہ مانگو گے تو میں کبھی کندھوں پر بٹھا کر میلے میں نہیں لے جاؤں گا۔“ اور بڑے بھیا فوراً جیجی کا ہاتھ پکڑ لیتے صلح ہو جاتی موہن سنگھ وہیں بیٹھ جاتا ہم اس سے سانپوں کی اور جانوروں کی کہانیاں کہنے کی التجا کرتے۔

میری یاد میں آج بھی وہ صورت ابھرتی ہے موہن سنگھ کی طرح میں نے کسی کو کہانی سناتے نہیں دیکھا۔ دیو جنوں کی کہانیاں کہنے کا اسے بہت شوق تھا۔ ہم کہتے "موہن بھیا کہانی کہو۔" وہ کہتا "نہیں بٹیا تم رات کو ڈرو گی یہ بڑے بڑے بھوت خواب میں نظر آئیں گے تم شور کرو گی تو بڑی بہو صبح مجھے ماریں گی۔ نہ بابا میں کہانی نہیں کہتا رام رام۔" اور اٹھنے لگتا۔ ہم سب اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے اس کے کندھوں سے لٹک جاتے اور اسے زبردستی بٹھا لیتے۔ کہانی جاری ہوتی کہ کہیں سے آواز آتی "موہن بھیا" اور وہ ہمیں وہیں چھوڑ چھاڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ نہ جانے اس نے کتنی کہانیاں ایسے ہی ادھوری چھوڑ دی ہوں گی، زندگی کی طرح اس کی کہانیوں کا اختتام بھی ہم نے کبھی نہیں سنا۔

صبح اٹھتے تو سب سے پہلے اس کے جانے کی آواز کان میں پڑتی اور ماں کہتی "اٹھیو موہن بھیا اٹھ گیا ہے۔ وہ کنوئیں سے پانی نکال رہا ہے۔ وہ ابھی دروازہ کھٹکھٹائے گا اور تم کو سوتا دیکھ کر تم سے خفا ہو جائے گا۔" ہم آنکھیں ملتے ہوئے بستروں میں بیٹھ جاتے۔ ماں ایک ایک کا منہ دھلاتیں اور پھر ہم صاف ستھری رسوئی میں ماں کے پاس بیٹھ کر منتر یاد کرتے۔ ماں کام کرتی ہمیں بتاتی جاتی۔ ان دنوں چولہے میں آگ کتنی بھلی لگتی تھی۔ سرخ شعلے اٹھتے اور توے کی سیاہی سے ٹکراتے۔ روٹیاں اترتی رہتیں۔ ماں انھیں ایک ٹوکری میں لپیٹ

کر رکھتی جاتیں اور ہم سب میں سے جیجی کی طبیعت بہت بے صبری تھی اسے کسی شے کا انتظار کرنا برا لگتا تھا اور شاید اسی لیے اس نے مرنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ خود ہی موت کو بلا لیا۔ جیسے موت بھی کوئی چاٹ تھی جسے وہ بچپن میں مزے لے لے کر کھایا کرتی تھی۔

نہ جانے جیجی نے شیام کو چاہنا کیوں شروع کر دیا۔ شیام میں اسے کیا دکھائی دیا۔ میرے لیے تو شیام میں کچھ بھی نہیں تھا، مجھے زندگی میں اس سے زیادہ معمولی کبھی کوئی شخص نہیں لگا۔ اپنے کام میں مگن، بہت ہی کم باتیں کرنے والا۔ وہ جیجی سے کوئی چار سال بڑا تھا۔ جن دنوں ہم سے ہائی سکول میں پڑھتے تھے وہ کالج میں تھا۔ اپنی کتابیں لیے خاموشی سے آتا۔ گلی میں سے گزرتے نیچی نگاہیں کیے بس گزرتا چلا جاتا۔ موہن سنگھ اکثر کہا کرتا تھا "شیام تو چندر بہو کا بیٹا ہے۔" چندر بہو اس کی ماں تھیں۔ بڑی باتونی، دولت پر جان دینے والی۔ زیور اور روپے پر ریجھ جانے والی، محلے بھر میں ان سے بڑھ کر لڑاکا کوئی عورت نہ تھی۔ گرمیوں کی سہ پہروں کو جب دن ذرا ڈھل کر ٹھنڈا ہو جاتا تو ساری بہوئیں چھوٹی چھوٹی کھٹولیاں بچھا کر بیٹھ جاتیں، باتیں کرتیں، چرخے کاتتیں اور دنیا جہاں کی بہو بیٹیوں کے قصے کہتیں۔ چندر بہو کی آواز ان دنوں بھی سب سے زیادہ بلند ہوتی تھی۔ انھیں کسی کا ڈر نہیں تھا وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی

تھیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر زور زور سے ساری بہو بیٹیوں کے قصے کہتی رہتیں۔ ہمیں ان سے بہت ڈر لگتا تھا اور پھر بھی نہ جانے کیوں شیام کو جیجی نے چاہنا شروع کر دیا۔ چاہت میں سارے ڈر دور کیوں ہو جاتے ہیں اور انسان کو صرف ایک ہستی ہی کیوں دکھائی دیتی ہے؟ کیا محبت کی روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں؟

مجھے وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی، وہ رات میری یاد میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سردیوں کی طویل راتوں میں سے زندہ رہنے والی صرف ایک رات۔ جیجی بہت دنوں سے چپ چپ رہا کرتی تھیں۔ سکول سے آتیں تو ماں کے کہنے کے باوجود دودھ نہ پیتیں، کھانا نہ کھاتیں اور سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتیں۔ ماں بہت فکر مند تھی۔ ماں نے کہا تھا "تارا چل تجھے وید جی کے پاس لے چلوں۔" تو اس نے کہا "نہیں ماں طبیعت خراب نہیں صرف امتحان نزدیک ہے نا میں سکول سے آ کر لیٹ رہتی ہوں تو جی اچھا ہو جاتا ہے۔" اور ماں رسوئی گھر کے چکروں میں فکر مند سی کئی بار تارا جیجی کو آواز دیتی۔ مجھے کہتیں "جا بڑی بہن کے پاس بیٹھ اس کا جی اچھا نہیں اسے کھانا تو کھلا، نہ جانے اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا کیوں پڑ رہا ہے جیسے کسی نے اس کے پرانوں سے جان ہی کھینچ لی ہو خون کسی نے چوس لیا ہو۔" اور جیجی لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر کہتیں "ماں

تمھیں تو وہم ہے میں مر نہیں جاؤں گی بالکل نہیں مروں گی۔" اور ماں کام کرتے کرتے کہتی "رام کا نام لے لڑکی مرنا اتنا آسان نہیں۔" اس رات سخت سردی تھی، ہوا بہت زوروں سے کواڑوں کو دھڑ دھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ بڑے بھیا کا امتحان شاید نزدیک تھا۔ اپنے کمرے میں لالٹین جلائے پڑھ رہے تھے۔ ماں سارا دن کی تھکن کے بعد بے سدھ سی سو رہی تھیں۔ ہمارے کمرے میں کوئی روشنی نہ تھی۔ کوئی آدھی رات کا وقت ہو گا۔ میں نے جانا جیسے سپنا دیکھ رہی ہوں۔ آنکھ کھلی، ذرا ہوش آیا تو جیجی میرے پاس لیٹی تھی۔ میں نے بول کر پوچھنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ ہاتھ اتنی سخت سردی کے باوجود پسینے سے گیلا تھا، جیسے پانی میں بھیگا ہوا ہو۔ جیجی کی سانس بہت تیز چل رہی تھی اور وہ رو رہی تھی۔ میں چپ تھی، مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کروں۔ ہچکیوں سے اس کا سارا جسم ہلنے لگا اور میں پریشان سی اس کے قریب یعنی چھت کی طرف تکتی رہی۔

کتنی دیر میں بے حس پڑی رہی۔ پھر میں نے ہولے ہولے اپنی باہیں بڑھا کر جیجی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ نہ جانے جیجی کو کیا دکھ ہے۔ اگر کوئی اور رات ہوتی تو میں ماں کو جگا دیتی۔ اسے زور سے چیخ کر آواز دیتی پر اس رات دل میں سے کسی نے کہا، یہ دکھ ماں سے کہنے کا نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس رات میں ماں

کو آواز دے دیتی۔ پر وقت کو کون واپس بلا سکتا ہے اور یہ دکھ کہ ان جانے جو کچھ ہم نے نہ کیا اگر کر لیتے تو دکھ میں کمی ہو جاتی دل کو کس طرح پیستا ہے۔

جیجی نے بتایا وہ شیام کو ملنے والے جانے والی تھی۔ پر رات کی سردی، بارش اور طوفان سے اسے ڈر لگتا ہے میرا دل زور سے دھڑکا۔ میرا جی چاہا میں جیجی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دوں۔ پر میں خاموش رہی۔ میں نے جیجی کو اور زور سے اپنے سے لپٹا لیا وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

اس رات کے بعد کئی راتیں آئی ہیں وہ بیتی راتیں اگر واپس آسکتیں تو شاید میں جیجی کو اس کی بھول بتا سکتی۔ پر ان دنوں تو کسی بات کا احساس نہ تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا تارا میری بہن ہے اور اسے ہر رات شیام سے ملنا ہے۔ شیام جو چندر بہو کا بیٹا تھا اور نیچی نظریں کر کے گلی میں سے گزرا کرتا تھا اور جسے لوگوں نے بہت کم بات کرتے سنا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے صحن میں کھڑی ہو جاتی۔ جیجی ہولے سے دروازہ کھولتی، شیام ہماری ڈیوڑھی میں آجاتا اور چند لمحوں کے بعد واپس چلا جاتا۔ بچپن کی چاہتیں، بھولے پن کی چاہتیں، دیوانگی کے زمانے کی باتیں۔ اگر جیجی زندہ ہوتی تو شاید ان راتوں کو یاد کر کے مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

موہن سنگھ کی گونجدار آواز ہمیں سنائی دیتی رہتی۔ ہمارے گھروں میں اس کے ڈر سے کبھی چور چکار نہیں آسکے۔ بچپن میں چوکیدار کی آواز سن کر کتنا ڈر لگا کرتا ہے پر اس صدا کو سن کر دل میں ایک طاقت آجاتی تھی۔ جیسے ہر طرف وہ ہو اور ڈر کی باتیں سپنے کی پرچھائیں ہوں۔

جب جیجی نے کہا کہ وہ اور شیام کسی دوسرے نگر کو جانے والے ہیں تو میرا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میرے پرانوں سے کسی نے ساری جان نکال لی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے پوچھا تھا جیجی موہن بھیا سے ڈر نہ لگے گا۔ مجھے اس سمے کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ کاش میں نے اسے روک لیا ہوتا۔ پر گزرے دنوں میں یہی دکھ تو زندہ رہتا ہے اور شام کی ہوا کی طرح سینے میں چکر لگاتا ہے اور اس نے ہنس کر کہا تھا اس سے کون ڈرے گا۔ یہ سارا کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میرا ذہن اس تیزی سے سوچ بھی تو نہ سکا۔ کسی پرندے کی اڑان کے سائے سے زیادہ تیزی سے سب کچھ ہو گیا۔ شیام اور تارا جیجی کو میں اور موہن بھیا دریا پار جانے والی ناؤ میں سوار کرا کے خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

اور دوسری صبح ہمارے لیے مصیبتیں لے آئی۔ ایک چپ چاپ تھی جس کا جادو ٹوٹ گیا۔ ایک طوفان تھا جس کے بندھن کھول کر کسی نے اسے آزاد کر

دیا۔ میں نے اپنے حالوں تو سوچا تھا کہ میں جیجی اور شیام کے کام آ رہی ہوں، بہن کے لیے کچھ کر رہی ہوں۔ سنسکاروں میں بھی تو یہی لکھا ہے "کسی کی مدد کرنا سب سے بڑا اپُن ہے۔" پر چندر بہو کی گرج سے سارا محلہ دہل اٹھا۔ چندر بہو ایک بات سے تو سچی تھیں۔ میری ماں کی طرح اس نے بھی بیوہ ہونے کے سب سال شیام کے سہارے گزارے تھے۔ اور ماں کو تو ایسی چپ لگ گئی گویا اسے کہنے اور سننے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو۔ رسوئی گھر سونا پڑا رہا۔ بڑے بھیا اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ ساری بہوئیں کانوں کو ہاتھ لگاتی پھرتی تھیں اور اس کے بعد سے میں نے موہن سنگھ کو کبھی گاتے نہیں سنا۔

تیسرے دن بنا بولے بنا کسی کی طرف دیکھے ماں نے چپکے سے پران تیاگ دیے۔ بابا کے نہ ہونے کا ہم سب کو اتنا دکھ نہ تھا پر اب ہمارا کون —— تارا جیجی کے ساتھ گویا ساری زندگی گھر سے چلی گئی۔ وہی منتروں، بھجنوں اور گیتوں سے گونجنے والا گھر مرگھٹ لگتا تھا۔ ان دنوں اگر موہن سنگھ نہ ہوتا تو نہ جانے ہمارا کیا بنتا؟ ہم شہر سے گاؤں لوٹ آئے!

موہن سنگھ نے کہا تھا۔ "منیا یہ کرم کا پھل نہیں اپنی اپنی سہار کی بات ہے تم میں پرماتما نے بہت شکتی رکھی ہے اور اس لیے تم کو دکھ بھی بڑا دیا ہے۔ دل کو ذرا سمنت بنا لو تو ہر دکھ رپٹ کر ادھر ادھر گر جاتا ہے۔ اگر تم ہر دکھ کو جی

سے لگا لو گی تو جینا بہت مشکل ہو جائے گا۔" اور ان دنوں یہ جاننے کے باوجود کہ سہار کیا ہے، جینا کیا ہے میں نے موہن بھیا کی بات کو پلے باندھ لیا۔ دن تو بہر حال گزارنے تھے۔

سچ مچ اگر موہن میرے پاس نہ ہوتا تو میں کیا کرتی۔ پر آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے کبھی کبھار دکھوں کے سامنے سر ٹیک دینے سے بھی بڑا آنند ملتا ہو گا۔ اور مجھے تو موہن کی باتوں نے چٹان بنا دیا۔ نہیں نہیں میں غلط سوچتی ہوں۔ موہن بھیا نے مجھے دنیا اور اس کے دکھوں سے مقابلے کے لیے تیار کیا تھا ورنہ میں ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جاتی۔ کون کہہ سکتا ہے کیا ہوتا؟ جب بھیا کے ہوش بھی جاتے رہے تھے۔ ماں کی طاقت اور محبت بھی مجھ سے چھن گئی تھی اور تارا جیجی ایک دور دیس کی سنی ہوئی کہانی لگتی تھیں میں یہ سوچ کر کہ میں نے گھر کو سنبھالا ہے، جھوٹی بڑائی کا سہارا لے رہی ہوں۔ اصل تو یہ ہے کہ موہن بھیا نے ایک فرض سمجھ کر کسی احسان کے بنا ہمارا بوجھ اٹھا لیا تھا۔

اس بڑی حویلی میں اکیلی بیٹھی میں اکثر سوچا کرتی تھی اور پھر سوچنے کو بھی کچھ باقی نہ رہا۔ بھیا نے اپنے حواس کھو دیے اور مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا دکھ آن پڑا۔ وہ طویل راتیں اور نہ ختم ہونے والے دن موہن نے بھاگ کر گزارے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں وہ کبھی سویا بھی ہو گا۔ اگر کبھی میں نے رات کو بھیا کی

خاطر جاگنا چاہا ہے تو اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ”منیا کیا تم کو مجھ پر بھی وشواش نہیں رہا۔ کیا تم سوچتی ہو میں بھیا کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں کرتا۔“ مجھے خاموش کروا دیا۔ میں کہتی ”موہن بھیا تم تھک گئے ہو گے۔“

کہتا ”کیا میں کسی اور کے لیے کچھ کر رہا ہوں۔ کیا بڑے بھیا میرے کچھ نہیں۔“

میں نے ہر بار اس سے ہار مانی ہے۔ دوسرے کو ہرا دینا ہی تو اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔ دوسروں کے لیے اس نے کبھی اپنے دکھ درد کا خیال نہیں کیا۔ اگر بھگوان بھی کسی روپ میں آئے تو میں اسے کبھی نہ پہچانوں گی۔ سوائے موہن بھیا کے اس کا کوئی روپ نہیں ہو سکتا۔

مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھتا تو کہتا۔ ”دیکھو منیا بھیا ٹھیک ہو جائیں گے تو ان کی سگائی کریں گے پھر دو سال کے بعد بیاہ کریں گے۔“

میں کہتی ”کیوں سگائی کے بعد بیاہ دو سال بعد کیوں؟“

کہتا ”دیکھو نا تم ہر بار جلدی کرنے میں سب کام گڑبڑ کر دیتی ہو۔ بس کچھ انتظار کروائیں گے بھیا کو۔“ اور میں بھیا کی طرف دیکھتی جو روز بروز سوکھتے جاتے تھے اور جن کی نگاہوں میں سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔

میں کیا بھولوں اور کیا یاد کروں۔

تارا جیجی دو سال کے بعد گھر واپس آئی تو پہچانی نہ جاتی تھی۔ شیام کو چندر بہو ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس لے آئی تھیں۔ انھوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ تارا جیجی کو چھوڑ کر ماں کی محبت اور نئے بیاہ کا لالچ شیام کو واپس لے گیا۔ شرارتیں نہ جانے کہاں جاچھپی تھیں کہ تارا جیجی نے جینے سے ہی انکار کر دیا اور گاؤں واپس آنے کے تیسرے دن بعد اس نے دھتورہ کھا کر اپنی جان کی شرمندگی کو چھپالیا۔

میں کہتی ہوں آخر دکھ سکھ کے ساتھ بھول تو انسان سے ہی ہوتی ہے۔ تارا جیجی نے زہر کھا کر کس شے سے چھٹکارا چاہا تھا۔ زندگی کے کورے کپڑے پر ایک بار داغ لگ جائے بس پھر یہ دھبہ کبھی نہیں چھٹتا کبھی نہیں کیا؟ تارا جیجی بہت جذباتی تھی، بڑی ہی بزدل، اگر وہ بھی تھوڑے دنوں موہن بھیا کے پاس رہتی تو اسے جینے کا ڈھنگ آجاتا۔ یا پھر یوں ہوا ہو گا جب کوئی آس باقی نہیں رہتی تو جینا بیکار کا بوجھ لگنے لگتا ہے اور تارا تو سدا کی چنچل تھی اس سے کوئی بھی بوجھ کب اٹھ سکا ہے؟

اور اس کے بعد زندگی ایک خالی سنسان ویرانہ تھا جس میں بڑے بھیا کی خالی نگاہیں تھیں اور بڑی حویلی کی چھتوں پر چپ چاپ قدم دھرتی اداسی تھی۔ اس اداسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور موہن نے مجھے بہلانے کے لیے

قصے کہنے شروع کیے، وہی کہانیاں جن کو ہم نے بچپن میں سنا تھا۔ بڑے بھیا کی دوا دارو اور دیکھ بھال سے جتنا وقت بچتا اس میں کھیتی باڑی کے ہزاروں دھندے گھر کے کام ہوتے اور یہ خاموشی میرا دم گھونٹنے لگتی تو موہن گھبرا کر کہتا ''منیا میں تمھیں کسی دن ایک اصلی کہانی سناؤں گا۔ بالکل اصلی بس ذرا صبر کی بات ہے۔'' اور اس اصلی کہانی میں پریم سنگھ کا نام بھی کہیں آ گیا تھا ورنہ موہن کی زندگی تو ایسی روشنی تھی جس کے آگے پیچھے اندھیرا ہوتا ہے اور جو اکیلی کرن کی طرح اپنے نور سے آپ ہی روشن ہوتی ہے۔

پریم سنگھ کے خط باوجود مجھے یقین نہیں آتا کہ موہن سنگھ مر گیا ہے۔ موت کس طرح اسے چھو سکتی تھی وہ بھی آنسوؤں کی طرح رپٹ کر اس کی گود میں گر گئی ہو گی۔ موت کو اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کیسے ہوئی۔ موت نے ماں کو سمیٹ لیا کہ ماں تو کامنی سی مورت تھی۔ بڑی بہو ہونے کے باوجود اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے ایک ہی جھونکے ہی سے گر جائے گی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں مجھے آج یاد پڑتا ہے ایسا لگا کرتا تھا جیسے آنسو بھرے ہیں۔ ماں جب بھگوان کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑے آرتی اتارتی تو میرا من ڈول جاتا۔ اس کے مرنے کے بعد کبھی کسی پوجا میں دل نہیں لگا۔ بھگوان کی مورتی کا سارا سہانا پن ماں سے تھا۔ گاؤں کے گھر میں

اکیلے طاق میں بھگوان کی میلی مورتی کی آنکھوں میں نہ کبھی جوت جلتی ہے اور نہ ہی کبھی ان ہونٹوں سے ہنستی پھوٹتی ہے ماں سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی۔ جب بھی مندر میں کسی بڑی پوجا کے سمے موہن بھیا مجھے گھسیٹ کر لے گیا ہے میرا من شانتی پانے کی بجائے بہت دکھی ہو گیا ہے۔ جو منتر مجھے یاد تھے وہ سب میں بھول چکی ہوں پر کرشن بھگوان کی گیتا آج بھی میرے سامنے ہے اور اس میں لکھا ہوا ہے "موت تو بس ایک دو گھڑی کا بچھونا ہے۔ نیند کی ایک جھپکی ہے۔" اگر یہ بات ہے تو ہم بچھڑنے والوں کے لیے دکھی کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ کتابوں میں لکھے ہوئے لفظ ہمیں تسلی نہیں دے پاتے اور سارے دکھ سکھ کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی جان کو خود اس ہون کنڈ میں ڈالنا پڑتا ہے یہ کیسی بے چینی ہے یہ کیسا سکھ ہے؟ اور موہن بھیا نے مجھے ہمیشہ یہی کہا تھا۔ "بٹیا سارے دکھ سکھ کی بات ہے جس طرح باہر کی چیزوں میں چہروں میں بھگوان میں سندرتا ہم اپنی آنکھ سے پیدا کرتے ہیں ایسے ہی من کی شانتی اور ہر دے کی دکھن سوچ کی بات ہے اور کچھ نہیں۔"

اور اس نے ہی تو مجھے کہا تھا۔ "دکھ تو ایک سان ہے اس پر چڑھ کر تم میں چمک آتی ہے۔ دکھوں کے بعد سکھ آتے ہیں۔ یہ چکر ہے تمھارے لیے یہ چکر ذرا ہولے ہولے چل رہا ہے پر کسی نہ کسی دن آہستہ قدموں چلتا سکھ تم کو ملے گا

ہی۔ اور یہ سب جاننے پر بھی کہ بھیا کی آنکھوں سے نور کم ہو گیا ہے۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے ہیں۔ تارا جیجی نراش ہو کر مجھ سے منہ موڑ گئی ہیں اور ماں کی صورت میری نظروں سے دور ہو گئی ہے میں سکھ کا انتظار کرنے لگی۔ بھلا موہن بھیا نے جو کہا تھا وہ کبھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات تھی جس میں بھیا کے سرہانے بیٹھے میں اور موہن انتظار کرتے تھے۔

بھیا کا سانس اس رات بہت مشکل سے چل رہا تھا۔ وید جی اپنی سی سب کوششیں کر چکے تھے۔ جاتے جاتے انھوں نے کہا تھا اگر یہ رات گزر گئی تو شاید وہ بچ جائیں۔ مجھے موت کے پہنچے سب طرف دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے راگ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ بڑی خوفناک آنکھیں چاروں طرف سے گھور رہی تھیں۔ کمرے کے طاق میں پڑی بھگوان کی مورتی بہت دکھی لگ رہی تھی۔ موہن بھیا نے کہا تھا۔

"منیا کہانی سنو گی۔"

"ہاں بھیا۔"

"دور کے ایک نگر کی بات ہے منیا، دو بھائی اس کے گاؤں میں رہتے تھے دونوں
میں بہت پریم تھا۔ جیسے تم میں اور تارا میں۔ نگر کے راجہ کی باندیاں بڑی
خوبصورت تھیں اور ان میں سے بڑا بھائی جیتکا کو چاہنے لگا۔ چاہت جانتی ہو کیا
ہوتی ہے منیا جب آگ کا ایک شعلہ سب طرف سے لپٹ جائے اور اس آگ
میں پریمی جل جائے اس کو ہر بات پر سکھ کا انوبھو ہو اور پھر بھی سکھ کہیں نہ ہو
ایک جلن ہو جیسے ہون کنڈ میں سامگری ڈالتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہوتی
ہے تو ایسی ہی چاہت تھی۔ اس بڑے بھائی کے جی میں۔ پر وہ کر کچھ نہ سکتا تھا۔
جیتکا راجہ کی باندی تھی اور محل کی دیواروں سے باہر نہ آسکتی تھی۔ مگر اس
لگن سے وہ بھی بے خبر نہ تھی۔ پھر ایک شام آئی جب راجہ شکار کے لیے باہر
گیا۔ راجہ کے ساتھ باندیاں تھیں رانیاں تھیں۔ قبیلے کے جوان تھے جن کی
ننگی تلواریں سنہری دھوپ کے پیلے پڑتے سایوں میں چمک رہی تھیں اور جن
کے جسموں پر بنے ہوئے رنگ برنگ کی تصویروں میں سے مانو آگ نکل رہی
تھی۔ ان جوانوں میں وہ دونوں بھائی بھی تھے اور ذرا پرے باندیاں اپنے بڑے
بڑے لہنگے سنبھالے اپنے پاؤں کی کڑیاں بجاتی رانی کی پالکی کے ساتھ ساتھ جا
رہی تھیں۔ بڑے بھائی کی آنکھوں تلے اندھیرا تھا وہ اپنے آپ کو بہت سنبھال
رہا تھا اور بہت دکھی تھا۔ پھر کالی اندھیری رات آئی۔ جوان راجہ کے گرد جنگل

میں پھیل کر پہرہ دینے لگے اور باندیاں رانیوں کے دل بہلانے کے لیے گیت گانے لگیں۔ تب بڑے بھائی نے سنا جیتکا کہہ رہی تھی ”گھوڑے تیار ہیں دریا کے کنارے ناؤ لہروں پر ڈولتی ہوئی انتظار کر رہی ہے۔ دو پریمی آج رات دریا کے پار اتر رہے ہیں۔“ گیت پھر ہوا کی لہروں پر ڈولتا رہا۔ باندیاں یوں ناچتی رہیں کہ آکاش بھی چپ چاپ انھیں دیکھنے لگا۔ رات گہری ہو گئی۔ رانیاں سو گئیں اور گھوڑوں پر سوار کراتے ہوئے ہری سنگھ نے کہا تھا۔ ”میں ان سے خود نپٹ لوں گا بس تم ہوا ہو جاؤ، دادا، جیتکا نے تم پر بہت بھروسہ کیا ہے صرف اس کا خیال کرنا۔ میں بھی تمھارے پیچھے آ رہا ہوں۔ میں پیچھے رہوں گا تا کہ اگر وہ پیچھا کریں تو میں انھیں روک سکوں۔“ اور بڑے بھائی کے پیچھے بیٹھی جیتکا کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ جنگل للکار سے گونج اٹھے۔ پھر گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کے ٹاپوں کی آوازیں نزدیک آتی گئیں۔ ہری سنگھ نے کہا ”تم گھوڑے کو اور تیز کر لو۔ میرا فکر نہ کرو بس جیتکا کو لے کر ناؤ میں بیٹھ جانا۔ اگر میں ان کو روک کر ہرا سکا تو تم سے آملوں گا میرا انتظار کرنا بس چند لمحے۔“ جیتکا اور بڑا بھائی دھڑکتے دلوں سے چند لمحے ناؤ میں بیٹھے رہے اور پھر سائے اور قریب آ گئے۔ ہری سنگھ نے زور سے کہا میں آ رہا ہوں اور بڑے بھائی نے راجہ کے جوانوں کو اس کے پیچھے دیکھ کر ناؤ کو پانی میں دھکیل

دیا۔ راجہ کے جوانوں کی للکار دور تک پانی پر بھی بڑے بھائی کا پیچھا کرتی رہی اور ہری سنگھ کی چیخ جنگل کے گھنے اندھیرے میں خاموش ہو گئی۔ بڑا بھائی اس للکار کا جواب نہ دے سکا۔ پر زندگی کے آخر تک وہ اس بات کا انتظار کرے گا جب بھی اسے وقت ملا وہ اس قبیلے کی پکار کے بدلے انھیں پکارے گا اور پھر اس کی بوڑھی رگوں کی ہمت اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ یہ ایک قرض ہے جسے چکانے کے لیے وہ زندہ ہے۔"

تب تو مجھے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ موہن سنگھ سے پوچھ سکوں کیا یہ تمھاری کہانی ہے مجھے کسی شے کا ہوش نہ تھا۔ دیے کی لو بہت نیچی تھی وہ کانپی اور بجھ گئی ہم دونوں ڈر گئے۔ یا صرف یہ میرا وہم ہے کہ موہن بھیا کسی شے سے ڈر سکتا تھا بھلا۔ سردی کا ایک جھونکا آیا۔ ہمارے انجانے ہی موت کوٹھڑی میں گھس آئی تھی اور اس نے بڑے بھیا کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔

ہر موڑ پر میں نے سوچا ہے، سدا یہی سوچا ہے کہ بس اب راہ ختم ہو گیا ہے، میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا مگر موہن بھیا نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر آگے پھیلے ہوئے راہ پر بڑھا دیا ہے۔ مرلی منوہر بھی تو موہن بھیا کی بہت عزت کرتے تھے اور اوی ناش کی پیدائش کے بعد سے تو اس نے مجھے مالکن کہنا شروع کر دیا۔ میں نے بہت کہا میں تمھاری وہی منیا ہوں مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا "وہ

پرانے دنوں کی دنیا اب کہاں ہے وہ تو شہر میں کہیں کھو گئی ہے جس دن سے تمھارے کندھوں پر یہ سارے دکھوں کا بوجھ آن پڑا ہے تم مالکن بن گئی ہو۔
"

سارے اپنے ہولے ہولے میرا ساتھ چھوڑ گئے اور آج موہن سنگھ کی موت کا سندیش بھی آ گیا ہے۔ وہ بھی جھوٹ ہے بالکل جھوٹ پریم سنگھ نے یونہی لکھ دیا ہے۔ بھلا موہن سنگھ کو بھی کسی سے شکست ہو سکتی ہے۔ وہ بھی کبھی ہار سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو ہرانا جانتا تھا۔ زندگی کے دکھ اس سے ٹکرا کر خود ہی پیچھے ہٹ جایا کرتے تھے۔ وہ تو لوہے کی ایک دیوار تھا۔ میں کیسے سوچوں کہ موہن کے چاندی کے تاروں سے بھرا ہوا سر، اس کی سفید بھویں اور چمکیلی آنکھیں اس کے مضبوط ہاتھ شمشان کی راکھ بن گئے ہیں۔ اس کے گیتوں کی گونج آج میرے دل کے ویرانے میں زخمی جانور کی طرح پھر رہی ہے، چکر لگا رہی ہے۔ کاش کوئی مجھے وہ زمانہ واپس لا کر دے سکے۔ کیا وہ گیت اس کے گلے میں گھٹ گئے ہیں اور وہ للکار اس کا کیا بنا۔ جیتکا کہاں گئی؟ یہ سب باتیں اب بھی بند رازوں کی طرح میرے دل کو پریشان کر رہی ہیں۔
موہن بھیا نے کہا تھا تم انتظار کرو ہولے ہولے سکھ تمھیں آ ملے گا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں آج سکھی ہوں۔ اگر بچوں اور رونق ہنسی اور گیتوں کا نام

سکھ ہو سکتا ہے تو! پر نہ جانے کیوں جب بھی کبھی بیتا وقت یاد آجاتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ دکھ بیت جاتا ہے پر اس کی یاد نئے سرے سے دکھی کر دیتی ہے۔ اوی ناش کے بچے میرے گرد کھیلتے مجھے دادی اماں کہتے میری گود میں گھس آتے ہیں مجھ سے کہانی کہنے کی فرمائش کرتے ہیں تو مجھے اپنا بیتا وقت یاد آجاتا ہے اور پھر تارا جیجی یاد آجاتی ہے۔ تارا کا بچہ جس کو چندر بہو اس سے زبردستی چھین کر لے گئی تھیں اب جوان ہو گا۔ میرے اوی ناش کی طرح بچوں والا ہو گا۔ زندگی دکھ اور سکھ کے درمیان ایک ندی کے بہاؤ کی طرح خاموشی سے بہتی رہتی ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ دکھ ہو یا سکھ وقت بیت جاتا ہے۔

اوی ناش کے بیاہ کے بعد موہن بھیا نے کہا تھا "مالکن اب میرا وقت ختم ہو گیا ہے۔ میں واپس جاؤں گا۔ مجھے ایک قرض چکانا ہے۔" اور پھر قرض چکانے کے لیے وہ کہانیاں لکھنے والا زور زور سے گانے والا، ہنسنے اور پریشانیوں کو ہاتھ کے اشارے سے دور کر دینے والا موہن بھیا واپس اپنے قبیلہ کے راجہ کے پاس چلا گیا۔

تارا جیجی کو شیام کے ساتھ ناؤ پر چڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا مجھے ٹھیک یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ اس نے کہا تھا ''شیام بھیا پریم بھی سہار کی بات ہے اگر تم تارا کو سہارا نہیں سے سکتے تو اب بھی رک جاؤ'' اور ناؤ میں بیٹھے بوڑھے مانجھی نے بڑی بے چینی سے اپنی چھوٹی سی گڑ گڑی کی آگ کو بڑے سے انگوٹھے سے دباتے ہوئے کہا تھا ''ہاں بھیا پریم کا سہار ہے بس اور کچھ نہیں ——'' اور پھر جب ناؤ کنارے سے ہٹ کر دور چلی گئی تھی تو موہن بھیا نے زور سے کہا تھا ''تارا کے دل میں روشنی روز روز نہیں جلے گی۔ اس جوت کو زندہ رکھنا تمھارے ہاتھ ہے۔'' اور شیام نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

میرے جی میں ایسی کوئی جوت نہیں جلی۔ مرلی منوہر اور میں بڑی خاموشی سے دو ساتھیوں کی طرح کندھے سے کندھا ملائے چلتے رہے ہیں جیسے اب اوی ناش اور کملا چل رہے ہیں۔ جیسے میرا چھوٹا پوتا کسی دن کسی لڑکی کے کندھے سے کندھا ملائے چل کر زندگی کا راستہ طے کرے گا۔ اور یہ سوال کہ امر کون ہے، ان مٹ کون ہے موہن بھیا اور جیتکا یا تارا جیجی۔ اور زندگی کی کئی ایسی ادھوری کہانیاں جن کا شروع کبھی سمجھ نہیں آیا جن کا انجام کبھی معلوم نہیں ہوا میرے گرد پھیلی ہوئی ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کیا دل سے ساری تمناؤں کا نکل جانا اور کسی نئی آس کی روشنی کے نہ رہنے کا نام بڑھاپا ہے یا اس وقت کا

سر پر آجانا جب واپس جا کر قرض چکانے کے سوا اور کوئی کام نہ رہ گیا ہو؟ موہن سنگھ بھی تو آج نہیں ہے جس سے میں کچھ پوچھ سکوں اور اس کے ساتھی پریم سنگھ نے اس کی موت کی خبر صرف مجھے لکھی ہے کیونکہ اس خبر کو سن کر میں دو آنسو ضرور گراؤں گی، اور یہ سوال کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس دنیا سے کوئی نہ کوئی رشتہ محسوس کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ ویسے ہی رہے گا کیونکہ اس سوال کا جواب دے کر میری تسلی کرنے والا موہن سنگھ بھی تو اب زندہ نہیں اور ادھوری کہانیاں خلاؤں میں ایسے ہی ادھورے سوالوں کے کندھے سے کندھا ملائے تیزی سے اتر رہی ہیں۔

سامنے کے پیپل پر بڑی اداس کرنیں دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں اور نہ جانے یہ آوازیں میرے دل سے خون کیوں نچوڑ رہی ہیں جیسے کوئی میرے پرانوں سے ساری جان نکال رہا ہو۔ گزرے دن جب یاد آتے ہیں تو بس آتے ہی چلے جاتے ہیں اور موہن سنگھ کے بھولے ہوئے گیت پیپل کے پتوں کے تال پر کون گا رہا ہے؟

اِس پار ــــــــ اُس پار

انورادھا چلی گئی۔ مجھے الوداع کیے بنا، مجھ سے رخصت ہوئے بنا، میری اشیر واد کے بغیر، تم غلط کہتے ہو۔ یہ بات ناممکن ہے۔ آؤ مجھے سہارا دو میں خود باہر جاؤں گا۔ وہ بھلا مجھ سے کہے بنا اسے کیسے وداع کر سکتے ہیں۔ میں ابھی زندہ ہوں۔

مگر مالک۔ اب تو مہمان لوگ جا چکے ہیں۔ لان میں روشنیاں بھی بجھا دی گئی ہیں۔ اب تو کرسیاں بھی سمیٹ چکے ہیں اور چھوٹی بٹیا تو اپنے سسرال پہنچ گئی ہوں گی۔ آپ باہر جا کر کر کیا کریں گے۔

تم چپ رہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پھیرے ہو چکے، برات چلی گئی اور کسی نے مجھے کہا تک نہیں۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے کیا میں اس کا دادا نہیں ہوں۔ کیا وہ میرے بلونت سنگھ کی بیٹی نہیں ہے۔ کیا یہ وہی انورادھا نہیں ہے جو میری پوتی ہے تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو وہ میری اشیر واد کے بنا ہی وداع ہو گئی۔

اب کوئی اشیر واد نہیں لیتا۔ ہماری کوٹھی کے ادھر ادھر چھوٹی بٹیا کی سنگت والیوں میں جتنے بھی بیاہ ہوئے۔۔۔۔۔

اچھا تم بلونت سنگھ کو بلاؤ۔۔۔۔ جاؤ کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ چلے جاؤ۔ جاؤ۔ پر مجھے معلوم ہے میرا بیٹا بلونت سنگھ نہیں آئے گا۔ وقت ہولے ہولے ریشم کے کیڑے کی طرح میرے اوپر اس باریک تار سے ایک قبر تیار کر چکا ہے اور اب نہ تو کوئی آس ہے اور نہ ہی کوئی خوشی۔ میں یادوں کے بت کی طرح زندگی کے برگد تلے اس چبوترے پر اندھیرے اجالے میں بیٹھا رہتا ہوں اور بھلائی ہوئی پرانی چیزوں کو کون اشیر واد کے لیے پکارتا ہے۔

اگر پرانے تانے بانے نہ ٹوٹتے۔ پر میں بھی کیا سوچ رہا ہوں۔ وقت بہنے والے پانی کی طرح میرے گھر کے آگے سے گزر چکا ہے اور اب واپس نہیں آئے گا۔ امراؤ سنگھ، عنایت علی، غلام نبی، چودھری شیر دل سارے مجھ سے بچھڑ چکے ہیں۔ وہ الاؤ اب کبھی نہیں جلے گا۔ وہ الاؤ جس کے گرد بیٹھ کر ہم سب سردیوں کی ٹھنڈک اور آگ کی روشنی میں حافظ کے اشعار پڑھتے تھے اور کریما یاد کیا کرتے تھے۔ یہ نشان جو میری پیشانی کی دائیں طرف ہے اس پر آج بھی ہاتھ پھیرتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ ہر ایک کی بات مان لینے والے نرم مزاج سے بابا مگر مکتب کے وقت کتنے سخت ہو جاتے جیسے لوہے کی

دیوار ہوں۔ وہ جب آنکھیں اٹھا کر چہرے کی طرف دیکھتے تو کسی کی ہمت نہ تھی کہ ان سے آنکھ ملا سکے۔ سبق یاد کرنے سے جو وقت بچتا تھا اس میں سے ہم سب بابا کے گھر کے کام کرتے تھے۔ شیر دل اور میں کتنا جھگڑتے تھے کہ وہ لمبا کرتا کون دھوئے گا۔ شیر دل بھی اب میری طرح بوڑھا ہو گا۔ وہ بھی اب ایسے ہی اپنے نئی روشنی کے دلدادہ بیٹے کے گھر کسی کونے میں پڑا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی مجھے یاد کر رہا ہو۔ بیتی زندگی پر جب نظر دوڑاتا ہوں تو یوں جان پڑتا ہے جیسے ایک خواب تھا۔ خواب جس میں میں اور شیر دل اور غلام نبی اور کتنے اور ساتھی اکٹھے تھے اور پھر مان کھیڑے کی بڑی نہر کے اس پار وہ مجھ سے وداع ہوئے اور انھوں نے اپنے چہرے میرے پیچھے آنے والے قافلے کے غبار راہ میں چھپا لیے مجھ سے منہ موڑ کر بھاری قدموں سے چلتے نہ جانے کہاں چلے گئے اور میں اس قافلے کے تیز دھارے کے ساتھ ساتھ بہتا یہاں آ گیا۔

یہاں میرے لیے کیا تھا؟

بڑی نہر کے پل کے پار وہ تھے اور میں ہولے ہولے بہت بے دلی سے مان کھیڑے کو چھوڑ رہا تھا۔ پل کے جس کنارے وہ سب کھڑے تھے وہ آنگن تھا جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ ان گلیوں اور راہوں سے مجھے الگ کیا جا رہا تھا جہاں میری جوانی گزری تھی۔ مان کھیڑے کے باہر میرا وجود کہاں تھا اور پھر

بھی وہ سب وہاں تھے اور مجھے رخصت کر رہے تھے۔ بڑی نہر کا پل میرے لیے تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک بن گیا جہاں سے گزر کر اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے مجھے خدا کے تخت کے سامنے حاضر ہونا تھا۔ مگر پل کے اس پار خدا کہاں ہے، وہ پرم آتما کہاں ہے وہ واہگورو کہاں ہے۔ وہ خدا جو محبت ہے، وہ پرم آتما جو سدا زندہ ہے۔ وہ واہگورو جو شکتی اور سچائی ہے۔ یہ سب چیزیں کہاں ہیں، وہ سب طاقتیں کہاں ہیں؟ پل کے اس پار جو گھر تھا وہ یہاں کیوں نہیں ہے؟ ایک ایک کر کے ہولے ہولے ریت کے ذروں کی طرح میری آنکھوں میں یہ سال چبھ رہے ہیں۔ میں کس طاقت کو پکاروں، کس سے مدد چاہوں؟

انورادھا کو انھوں نے مجھ سے اشیر واد لیے بنا رخصت کر دیا۔ پر شیر دل نے تو ایسا نہیں کیا تھا ——— شیر دل کی فاطمہ کی شادی ہوئی ہے تو میں مان کھیڑے سے اپنے سمدھیوں کے ہاں کسی کام سے آیا تھا۔ شیر دل نے کتنی تاکید کی تھی اور کہا تھا "تم نہیں آؤ گے تو فاطمہ کی ڈولی نہیں جائے گی۔" اور مجھے معلوم تھا کہ میں وقت پر نہ پہنچا تو فاطمہ کی ڈولی نہیں جائے گی۔ میں پچاس میل کی مسافت طے کر کے جب پہنچا ہوں تو پسینے میں نہایا ہوا تھا اور فاطمہ کی ڈولی رکھے وہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ فاطمہ مجھے بہت پیاری تھی۔ جب بسنتی

وداع ہوئی تھی تب میرا جی اتنا دکھی نہیں ہوا تھا۔ مگر جب فاطمہ میرے گلے لگ کر روئی ہے تو آنسو نہ جانے کہاں سے آنکھوں میں آ گئے۔ بیٹی باپ کے گھر مہمان ہی ہوتی ہے۔ بابل کا گھر چھوڑتے ہوئے اسے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ وہ آنگن جس میں اس نے اپنے ویروں سے جھگڑا کیا تھا گڑیاں کھیلی تھیں۔ ماں سے پٹی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ مل کر ہنسی بولی تھی اس سے چھٹ رہا تھا۔ فاطمہ کے جانے کے بعد میں بہت دنوں اداس رہا تھا۔ جیسے وہ شیر دل کی نہیں میری اپنی بیٹی ہو۔ جیسے وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ وہ زندگی میں اپنے پن کا احساس آج کہاں ہے، کیا میں انورادھا کا کچھ نہ تھا؟

پل کے اس پار محبت کی گرمی تھی۔ روشن چہرے تھے اور زندہ رہنے کا ولولہ تھا۔ شاید اس پل پر سے گزرتے ہوئے تلوار کی دھار سے بھی باریک راہ پر میری روح کٹ گئی اور میرا وجود یہاں آ گیا مگر روح کہاں ہے؟ اور وہ سب کیوں پل کے اس پار رہ گئے ہیں۔ مان کھیڑے کی گلیوں میں شیر دل کیا اکیلا خوش ہو گا۔ میرے بنا حویلی کے دالانوں میں کیا اب بھی وہ اسی طرح محفلیں جماتے، ہنستے بولتے ہوں گے۔ کیا میرے بنا ان کا دل سو گوار نہیں ہو گا۔ مگر کس طاقت نے مجھے مان کھیڑے سے الگ کر دیا ہے؟ وہ طاقت کون سی تھی، اسے کس نے بنایا ہے؟ کیا یہ باؤلا پن تھا؟ میں اور شیر دل ایک ہی مٹی سے پیدا

ہوئے تھے۔ غلام نبی نے اور میں نے بابا سے اکٹھے پڑھا ہے۔ ہم سب کے جسموں پر اور پیشانیوں پر اور ہاتھوں پر اس الاؤ کی جلتی لکڑیوں کے داغ تھے۔ ہم نے ایک ہی فضا میں سانس لیا ہے۔ ایک سی باتیں سوچی ہیں۔ ہم ہر خوشی میں اکٹھے شریک ہوئے ہیں۔ پھر یہ آخری وقت ہمارے لیے اتنا سخت کیوں بن گیا ہے؟ ہے واہگورو۔ اے خدا میں کیا کروں۔ ہم نے زندگی اکٹھے گزاری تھی، ہم موت کے لمحوں میں کیوں ایک پل کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ مان کھیڑے سے مجھے الگ کرنے کے لیے کس نے اس پل کو درمیان میں لا کھڑا کیا۔ یہ مشرق اور مغرب کیوں ہمارے درمیان دیواریں بن گئے ہیں۔ شیر دل کون ہے اور میں کون ہوں؟ کیا وہ بیتا وقت ایک سپنا تھا، ایک سپنے کی پرچھائیں تھا۔

مالک سردار کسی انگریز کے ساتھ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ میں نے ان سے آپ کا پیغام کہہ دیا تھا۔ وہ چپ رہے تھے۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ رات کو لوٹیں گے۔ کیا میں پھر انھیں کہوں کہ آپ نے انھیں بلایا ہے؟

نہیں شمبو ناتھ انھیں تکلیف نہ دینا۔ مجھے ان سے کچھ نہیں کہنا۔ تم جاؤ۔

رات کتنی تاریک ہے اور اندھیرا دم گھونٹ رہا ہے۔ ہوا کس زور سے آم کے درختوں میں کراہ رہی ہے اور خشک پتے کیسے اڑ رہے ہیں جیسے یہ رات

انورادھا کی شادی کی پہلی رات نہ ہو۔ یہ میرا کمرہ ہے۔ بہو جب یہاں سے گزرتی ہے تو کہتی ہے "بڑے سردار صاحب کا کمرہ صاف ہے کیا شمبھو۔" میرا کمرہ۔ مان کھیڑے کے پل کے پار میں نے شیر دل اور غلام نبی کے ساتھ ہی زندگی کی ساری وسعتیں چھوڑ دی تھیں۔ کچے آوے سے لے کر سمندر سنگھ کے کھوہ تک نہر کے کنارے سے لے کر علی وال تک کے کھیت اور ان پر جھکا ہوا نیلا آکاش بہت پیچھے چھٹ گئے اور صرف یہ کمرہ میرے نصیب میں رہ گیا۔ جس میں گرمی ہو تو دھوپ بھر جاتی ہے اور سردی ہو تو درزوں میں سے ہوا فراٹے بھرتی گزرتی ہے جیسے اپنے پیچھے ساری بدروحیں سمیٹ لائی ہو۔ وہاں پل کے پار جب سردی ہوتی تھی تو ہم سب بڑی حویلی کے دالانوں میں کتنے بڑے بڑے الاؤ جلا کر بیٹھتے تھے اور ساری رات حافظ کے شعر پڑھتے رہتے اور پرانی کہانیاں کہتے رہتے۔ کئی ایسے موسم بھی آئے ہیں جب ہم نے بارشوں میں کڑکتی بجلیوں میں پار کے لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے ساری ساری رات سرکنڈوں میں چھپے چھپے گزار دی۔ ایک چپہ زمین کے لیے خون بہائے ہیں۔ پار والوں سے دلاور علی کا جھگڑا تھا۔ معمولی سی بات بڑھتے بڑھتے دشمنی میں بدل گئی اور ایسی ہی رات میرا جگت سنگھ نہ جانے کیسے پار والوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ میں نے سمجھا کہ میں نے اپنی دوستی کے لیے اپنے جوان کو قربان کر دیا

ہے۔ میں نے دلاور علی کے لیے اپنے بیٹے کو مار دیا ہے۔ پر نہ جانے پھر کیا ہوا کہ ہم نے کسی دوستی کی خاطر نہیں دشمنی کے واسطے نہیں اپنے اپنے بیٹے پوتے مار دیے۔ اور کسی غیبی طاقت نے زندگی کی بساط پر ہمارے مہرے پیٹنے شروع کر دیے۔ نہ جانے وہ کیسے ظالم ہاتھ تھے جنھوں نے کسی آدرش کی خاطر نہیں کی۔ بس یونہی ہم سے ہمارے بیٹے چھین لیے، پوتے چھین لیے، نہر کے کنارے سے لے کر علی وال تک کے کھیت چھین لیے اور ان پر جھکا نیلا آکاش چھین لیا اور پل کے راستے ہم سب کو ایک ایسے اجنبی دیس میں دھکیل دیا جہاں کچھ بھی تو اپنا نہیں۔

بسنتی کے سسرال کا گاؤں اس پل سے بہت دور تھا۔ اور بلونت سنگھ فکر مند تھا۔ میں نے اسے کہا تم مجھے تو مان کھیڑے سے نکال کر لیے جاتے ہو مگر بسنتی کو اس دیس سے جدا نہ کرو وہ اس زمین کا ایک ٹکڑا ہے وہ اکیلی نہیں۔ اس کا چچا شیر دل ہے۔ دلاور علی اس کا خیال رکھے گا وہ کسی غیر دیس میں تو نہیں اور بلونت سنگھ نے کہا تھا "باپو تم تو پاگل ہو، یہ شیر دل، یہ دلاور علی یہ سب ہمارے دشمن ہیں۔ ہمارے مذہب کے دشمن ہیں، ہمارے آدرش کے لاگو ہیں۔ یہ ہمارے کوئی نہیں ہیں۔ تم کو کبھی سمجھ نہیں آئے گی کہ یہ دیس بیگانہ ہے۔ بسنتی کی عزت کا سوال ہے۔"

اور میں آج بھی سوچتا ہوں اگر سوچنے کا نام پاگل پن ہے کہ اگر شیر دل اور دلاور علی ہمارے دشمن تھے تو پھر دوست کون تھا؟ اگر وہ دھرم کے بیری تھے تو پھر گوردوارے میں بیٹھ کر گرنتھ صاحب کو اتنے احترام سے کس طرح سنتے تھے اور بلونت سنگھ کی یہ بات تو مجھے اب بھی سمجھ نہیں آتی کہ آدرش کیا ہے۔ میں نے بابا سے اخلاق جلالی پڑھی تھی۔ میں نے اور شیر دل نے اور دلاور علی نے اور امراؤ سنگھ نے اور یشپال ٹھاکر نے سب نے حافظ کو اکٹھے پڑھا تھا۔ پرانی کتابوں میں اس آدرش کا ذکر کیوں نہیں تھا یا بابا نے ہم سے یہ بات جان بوجھ کر چھپائی تھی۔ وہ کونسا خزانہ تھا کہ ہماری اولاد نے ہم سے علیٰحدہ اسے پالیا اور اب شیر دل کا جوان سال شاہ دل اور دلاور علی کا جواں بخت اور میرا بلونت سنگھ اس کے لیے لڑ مرنے کو تیار تھے؟ یہ آدرش کی بات مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی۔

مرا جی بسنتی کو دیکھنے کو کیسا کیسا چاہا ہے، میرا دل فاطمہ کو دیکھنے کو کیسا کیسا تڑپا ہے مگر اتنے بہت سے سال گزرنے پر بھی وہ مجھے نظر نہیں آئیں۔ ارے کوئی کبھی انھیں سسرال سے وداع کرا کے نہیں لایا کیا؟ میری فاطمہ نے دہلیز پر کتنے پھیرے کیے ہوں گے۔ حویلی کے باہر نا جانے کتنی بار جھانکا ہوگا۔ پر اسے کبھی کوئی ویر بانکی پگیا باندھے پہاڑ جیسے گھوڑے پر سوار راہ پر اپنے پیچھے گرد

کے بادل بناتا میکے گھر کی خیر صلاح کی خبر لاتا دکھائی نہ دیا ہو گا۔ اس نے کتنی بار مکھن کو ساس سے چوری چوری مٹی کے کٹورے میں ڈھانپا ہو گا کہ شاید کسی گھڑی ویر آجائے اور اسے چوری کھلائے۔ اس نے کتنی بار گھی کو نتھار کر رکھا ہو گا کہ بھائی کے چاولوں پر گرم گرم ڈال کر کھلائے گی۔ کتنی بار اس نے خواب میں وہ پوٹلیاں دیکھی ہوں گی جن میں شاہ دل اس کے لیے میکے کی سوغات لایا ہو گا۔ پر اس کے خوابوں پر کوئی منحوس پر چھائیں پڑ گئی اور فاطمہ کو ملنے شاہ دل پل کے اس پار سے کبھی نہ آیا۔ جس طرح بسنتی کو ملنے بلونت نہ جا سکا۔ بسنتی نے پنگھٹ پر گھڑا رکھ کر کتنے راہیوں کو اس شوق سے دیکھا ہو گا کہ شاید یہ اس کا ماں جایا ہو۔ اس نے کتنی بار کوے کو منڈیر پر سے اڑایا ہو گا، باہر اس سے چوری کھلانے کا وعدہ کیا ہو گا۔ روٹیاں پکاتے میں جب آٹا گرا ہو گا تو اس نے آس لگائی ہو گی اور دھڑکتے دل سے چرخہ کاتتی انتظار کرتی رہی ہو گی۔ ہر آہٹ پر چونک چونک گئی ہو گی۔ ڈیوڑھی میں جھانکا ہو گا۔ حویلی میں آنے والے ہر کہار کا منہ اس امید پر تکتی رہی ہو گی کہ شاید کوئی اسے بلونت کے آنے کی خبر سنائے تو کیا فاطمہ اور بسنتی اب آس توڑ بیٹھی ہوں گی؟

وہ دونوں آج بھی اپنے اپنے سسرال کے گھروں میں ہوں گی اور گھی کے چومکھیا دیپ جلانے کی تیاریاں کر رہی ہوں گی۔ پر شیر دل کا بیٹا شاہ دل پل کے

اس پار سے کبھی اپنی بہن کو تو لینے نہیں آیا اور میر ابلونت سنگھ بسنتی کو بھول کر بھی تو یاد نہیں کرتا۔ اس کوٹھڑی میں جس کو انورادھا کی ماں یعنی میری بہو بڑے چاؤ سے میرا کمرہ کہتی ہے پڑے پڑے میری ساری قوتیں جواب دی گئی ہیں۔ میرے بازوؤں میں تو اس دن ہی کوئی طاقت نہ رہی تھی جب چودھریوں کے جوانوں نے للکار کر کہا تھا اب ان سکھوں سے مان کھیڑا خالی کرانا ہی پڑے گا۔

مان کھیڑا میرے دل کی دنیا ہے وہ میرے دل کی آبادی ہے میرے خون میں میرا گاؤں ہے۔ کون مجھ سے مان کھیڑا خالی کرا سکتا ہے اور پھر بھی شیر دل کے برادری والوں نے میری حویلی کے سامنے للکار کر کہا تھا کہ اب تم فوراً اسے خالی کر دو۔ اس دن شیر دل چھپ کر میرے پاس آیا تھا اور کتنی ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خاموش بیٹھے رہے تھے جیسے کہنے کے لیے کوئی بات ہی نہ ہو۔ شیر دل میری طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ جیسے مجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتا ہو اور شرمندہ ہو۔ پھر رات کے اندھیرے میں جب حویلی میں خاموشی تھی اور میرے گھر کی عورتیں اندر کوٹھڑیوں میں کنڈیاں چڑھا کر بیٹھی ہوئی تھیں دلاور علی میرے پاس آیا تھا۔ وہ بھی خاموش تھا۔ گھر میں خاموشی دیکھ کر اسے وحشت ہو رہی تھی۔ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ہم نے بچپن اکٹھے گزارا تھا۔

درختوں پر اکٹھے چڑھنا سیکھا تھا۔ ڈھاب میں مل کر تیرتے رہے تھے۔ گھوڑوں پر چڑھ کر اپنی پتلی کمر والے شکاری کتوں کے ساتھ اکٹھے شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے بیاہ بھی ساتھ ساتھ ہوئے تھے۔ ہمارے پاس جو زندگی بھی تھی اس میں سب کا حصہ تھا اور آج کسی غیبی طاقت نے اسے بدلنا چاہا تھا۔ دلاور علی جب بھی میری حویلی میں آتا سب سے پہلے بلونت کی ماں کو پکار کر ست سری اکال کہتا۔ ایک زندگی کے بعد جب ہمارے بالوں میں خاکستری رنگ گھل رہا تھا اور ہماری آنکھوں کی روشنی کم ہو رہی تھی، ہم نئے آداب و اصول سیکھنے کے ناقابل تھے، دلاور علی کو ایک اجنبی کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ وہ پلنگ کی پائنتی آ کر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے اب یہاں سے مر کر ہی اٹھے گا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور شرمندگی کی تحریر میں نے اندھیرے میں پڑھ لی۔ میں نے اپنے خالی ہاتھ میں اس کا ہاتھ لینا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ پرے کر لیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہے اور وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس اندھیرے اور خاموشی میں جب دور کے گاؤں سے نعروں اور شور کی آوازیں آ رہی تھیں اور مان کھیڑے کی گلیوں میں جب کبھی تیز بھاگتے قدموں کی چاپ گونج اٹھتی تھی اور کبھی بہت سے جوانوں کے ہنسنے بولنے اور بے فکری

سے چلنے کی صدائیں آتیں۔ میں نے اندر سے بوتلیں نکالیں اور ہم مدھم سی روشنی میں مل کر وہ پرانی شراب پیتے رہے جو ہم سب کو بہت پسند تھی۔ کوٹھڑیوں کے اندر سے بچوں کے رونے کی گھٹی گھٹی آوازیں آتیں اور ہم تینوں آدمی ایک دم چونک پڑتے۔

وہ میرے ساتھ شیر دل اور دلاور علی کی آخری شام تھی۔ پھر آس پاس کے گاؤں سے لوگ ٹولیاں بنا کر اس پل کے پاس جمع ہونے لگے۔ سامان کے ڈھیر، روتے بچوں، غمزدہ بوڑھی عورتوں اور بیوہ سہاگنوں کے گروہ پل کی طرف بڑھنے لگے۔ میں سارا دن اس سرکنڈوں کی دیواروں سے محفوظ راستے پر انھیں رینگتے دیکھتا رہا۔ بلونت کی ماں نے مجھے کئی بار اندر بلایا۔ مگر مجھے وہ کس شے سے ڈرا رہی تھی، آخر مان کھیڑ میں مجھے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر میرا اپنا گاؤں، ڈھاب کے کنارے پر جھکے ہوئے درختوں تلے بندھی کشتی اور آس پاس تیرتے کنول کے پھول، پانی کے ساتھ ساتھ اپلوں کے ڈھیروں پر لپی پُتی مٹی اور پھر چمکتے صاف گھر، پانی میں تیرتا اپنے گاؤں کا عکس یہی سب کچھ تو تھا جس سے میری زندگی تھی۔ یہ سادگی جس میں کھیت ہیں، گھر ہیں اور پانی کے کناروں کو چھوتا ہوا نیلا آکاش ہے اور برگد کے قریب گوردوارہ تھا۔ اس سادگی سے مجھے کون علیٰحدہ کر سکتا تھا۔ وہاں شیر دل تھا دلاور علی تھا اور پھر بھی

ہمیں اس قافلے میں شریک ہونا پڑا۔ میں نے بسنتی کے لیے شیر دل کو کچھ نہیں کہا۔ میں اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں یہ کہتا کہ شیر دل بسنتی کا خیال رکھنا، اس کا گاؤں دور ہے اور تم اسے وہاں سے لاکر پل کے اس پار جانے والوں میں شامل کر دو تو وہ یقیناً ناراض ہو جاتا اور اس لیے میں کچھ کہے بنا پل پر آگیا۔ ہمارے ارد گرد چودھریوں کے خاندان کے نوجوان جن کی آنکھوں میں حیا اور جن کی باتوں میں لحاظ ہوتا تھا کھڑے زور زور سے ہنستے اور قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے جیسے میں اور ہمارے گھرانے کی عورتیں انھیں نظر نہ آرہی ہوں۔ گلی میں ماميوں اور چاچیوں کو دیکھ کر سلام کرنے اور ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جانے والے جوان آج ان عورتوں کو پہچان ہی نہیں رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے ہتھیار تھے اور تیز بلم لگی لاٹھیاں جیسے انھوں نے بہت تلخ شراب پی رکھی ہو اور اپنے آپے میں نہ ہوں۔

وہیں میں نے چادر اوڑھے راہ تلاش کرتی اپنے بابا کی بوڑھی بہن کو دیکھا، میں نے شیر دل کو دیکھا، دلاور علی کو دیکھا جو میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ اس لمحے مکتب اور الاؤ اور وہ سب باتیں یاد آگئیں جو بہت پرانی تھیں۔ وہ پرانے زخموں کے نشان ابھر آئے جو بابا نے سبق نہ یاد ہونے پر جلتی لکڑیوں

سے ہماری پیشانیوں پر بناڈالے تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے پل کا یہ کنارہ حشر کا میدان ہو اور ہم سب اپنے حساب کتاب کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہوں۔ بی بی نے اپنی چھوٹی سی گٹھڑی ایک جھاڑی کے قریب رکھ دی اور چادر کو ماتھے سے اور نیچے سرکا کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا تھا کہ چودھریوں کا خاندان بی بی کے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھایا کرتا تھا اور بی بی کو ہم نے دن کی روشنی میں کبھی گاؤں کی گلیوں میں چلتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ یقیناً قیامت تھی ورنہ کبھی یوں ہو سکتا تھا۔

اور پھر پل کے اوپر سے گر کر دوسری طرف آتے میں میری روح ریزہ ریزہ ہو کر اور کٹ کر گر گئی۔ تب سے اب تک میرا وجود کھوکھلا ہے۔

بلونت سنگھ کا آدرش کیا تھا؟

اس چیختی چلاتی اور تیز بھاگتی زندگی کا ساتھ میں نہ دے سکا۔ ہم ہولے ہولے شراب پیتے اور اپنے کھیتوں کے کنارے کنارے گھوڑوں پر چڑھ کر گھومنے والے مان کھیڑے کے سردار پل کے اس پار کی زندگی کا ساتھ کیسے دے سکتے تھے۔ زندگی تو ہمارے مان کھیڑے میں دودھ کے اوپر جھاگ کی سفیدی اور اناج کی خوشبو اور رہٹ کے راگ سے مل کر بنی تھی۔ گرمیوں کی سہ پہروں میں آم کے باغوں کے ٹھنڈے سایوں کے اندھیرے میں کوئل کی کوک اس

کا محور تھا اور چوپال کی آگ اس کی رگوں کی گرمی تھی۔ جب یہی چیزیں نہ رہیں تو زندگی کہاں سے آتی۔ سارے اجزاء پریشان ہو گئے ہیں۔ ہم زندہ کہاں ہیں۔ ہماری بہلیاں اور ان کے آگے جتنے والے سفید بیل رنگ برنگ پردے، آنگن میں نیم کے سایوں تلے کنواریوں کے چرخوں کی گھوں گھوں کا گیت سب بکھر گئے۔

میری بہو اجیت کور نے الگ تھلگ کوٹھڑی دکھا کر کہا تھا باپو یہ آپ کا کمرہ ہے یہ گھنٹی لگی ہے جب اس کو دبائیں نوکر آپ کے پاس آجائے گا جو کام کہنا ہو کہہ دیں۔ ناشتہ یہاں سویرے نو بجے سردیوں میں اور چھ بجے گرمیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو جس چیز کو ضرور ہو کہلوا دیا کریں۔ یہ آپ کا ٹرنک ہے یہ کنگھی ہے، یہ شیشہ ہے، یہ گھر ہے پل کے اس پار مان کھیڑے سے دور یہ گھر ہے، یہ گھر ہے یہ سرائے ہے یہ مسافر خانہ ہے یہ کیا ہے میں کہاں ہوں۔ اس کوٹھڑی میں کھڑکیاں ہیں جن پر کپڑا پڑا رہتا ہے۔ جب جی چاہے ان کو کھسکا کر ایک طرف کر دو۔ دھوپ تیز ہو تو اس کوٹھڑی میں بھر جاتی ہے اور پھر اذیت ناک گرمی ہوتی ہے۔ وہ ٹھنڈے سائے کہاں ہیں۔ رہٹ کے گیت کے ساتھ میٹھی ہوا کہیں نہیں ہے اور پھر المناک تنہائی۔ یہ اکیلا پن۔ بلونت سنگھ کی ماں اچھی تھی جو مان کھیڑے سے باہر نہ آسکی۔ ستی ساوتری وہ جس

زمین کا ٹکڑا تھی اسی میں سما گئی۔ جس گھر میں اس کی ڈولی آئی تھی وہاں سے مر کر ہی نکلی۔ چند دنوں بچے مجھے گھیرے رہتے۔ انورادھا، شیام، جگدیش سبھی میرے گرد رہتے۔ پھر ان کے سکول کھل گئے اور بہونے انھیں مجھ سے علیحدہ کر لیا۔ بلونت سنگھ کے اپنے کام ہیں۔ نہ جانے وہ آدرش کیا ہے؟ اگر میں اس سے پوچھوں بھی تو اسے بتانے کا وقت کہاں سے ملے گا۔ کبھی کبھار کھڑے کھڑے آ کر کہتا ہے باپو کیا حال ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اجیت آپ کا خیال تو رکھتی ہے، کبھی کسی کو بلانا ہو، کسی شے کو جی چاہے تو اس بٹن کو دبا دیا کریں۔

یہ بٹن دباتا ہوں مگر نہ تو شیر دل آ سکتا ہے اور نہ ہی دلاور علی۔ امراؤ سنگھ اور کیسر سنگھ کوئی بھی تو نہیں آتا اور مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ بھلا اس گھنٹی کے ہلانے سے مل سکتی ہیں۔

باہر کی دنیا کے اور میرے درمیان صرف اس کھڑکی ناطہ ہے میں نے اپنے اوپر سارے دروازے بند کر لیے ہیں۔ صرف یہی ایک کھڑکی ہے اور اس میں سے بھی جو دنیا نظر آتی ہے جو نظارے میں نے دیکھے ہیں، صبح سے شام تک رینگتی ہوئی انسانوں کی قطاریں جیسے انسان نہ ہوں چیونٹیاں ہوں۔ اس تازگی کا نشان نہیں، ہر چہرہ حیوان ہے، ہر دل ویران ہے۔ یہ بیگانگی اور یہ تنہائی یہ اکیلا

پن۔ یہ اماوس کی رات سدا سدا کے لیے دنیا پر چھا گئی ہے۔ چاند سورج ستارے کہاں ڈوب گئے ہیں۔

شمبو ناتھ کہتا ہے میرا بلونت سنگھ بہت بڑا آدمی ہے۔ آدمی کی بڑائی کیا ہے؟ کس شے سے ہے؟ بلونت سنگھ کے پاس لوگ آتے رہتے ہیں۔ ایک بھیڑ سی سارا وقت لگی رہتی ہے۔ موٹریں آتی ہیں جاتی ہیں، لان میں کرسیاں بچھتی ہیں، میز بچھتے ہیں۔ روشنیاں ہوتی ہیں بجھتی ہیں۔ اجیت کور بھی مصروف رہتی ہے اور پھر کبھی کبھار ادھر سے گرتے ہوئے میرے کمرے میں جھانک کر کہتی ہے باپو آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بھلا مجھے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ ضروریات زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں۔

انورادھا کی آنکھوں میں میری بسنتی کی آنکھوں کی سی نرمی ہے اور آواز میں ویسی ہی مٹھاس۔ مان کھیڑے کا روایتی حسن ڈولی کے پردوں کے پیچھے چمک کر چھپ گیا۔ انورادھا میں اس کی ایک کرن بھی نہیں۔ ایک تیزی ہے اور ایک سختی ہے۔ میری کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دن کہنے لگی۔ باپو یہ میرے دوست ہیں سردار سرندر سنگھ۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر انورادھا کو دیکھا۔ میں اتنی بدلی ہوئی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں ——————— کون سے چکر میں سے

گزر رہا ہوں۔ جس میں آگ ہے تو سہی پر جلا نہیں پاتی۔ جس میں دکھ تو ہے پر دل کو پگھلا نہیں سکتا جس میں موت کی آرزو تو ہے پر اتنی شدید نہیں میرے حواس کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ یہ کونسی دنیا ہے کہ انسان انسان سے جدا ہے۔

داتا۔ داتا۔

پانی کی ایک بوند برسادے۔ یہ صحرا ہے۔

روحیں اس پل کے پار رہ گئی ہیں کیا۔ یا ریزہ ریزہ ہو کر اس تیز دھار والے جدائی کے پل پر کٹ کر گر گئی ہیں۔

انسان اتنے کھوکھلے کیوں ہیں؟

اب تو بہت دنوں سے کیسر سنگھ ادھر نہیں آیا اور آئے بھی کیوں اسے بلونت سنگھ سے بہت امید تھی۔ اپنے خاندان کا آدمی، گاؤں کا ناطہ۔ مان کھیڑے کا رشتہ، انسانیت کی برادری۔ اسے بیکاری میں کسی نوکری کی تلاش تھی۔ بلونت سنگھ سے میں نے خود کہا مگر کیسر سنگھ کا کوئی کام نہ بن سکا۔ وہ سارا دن موٹروں کے پاس والے گندے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ اس کے کھیتوں کا سونا اور گندم کی چمک اس کے دھان کے لہلہاتے کھیت سب مان کھیڑے میں ہیں اور اِس دنیا اور اُس دنیا کے درمیان ایک پل ہے۔ مدتیں ہوئیں اس پر گزرنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ کیا ہم سب مر کر کسی نئے جنم سے گزر رہے ہیں۔

اجیت کور نے کیسر سنگھ کو دیکھا تو کہنے لگی۔ باپو آپ اس گندے آدمی کو ہر روز اپنے کمرے میں بٹھا لیتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ہماری عزت کا سوال ہے۔
اور پھر کیسر سنگھ کبھی اس طرف نہیں آیا۔
کیا میں کبھی پل کے اس پار نہیں تھا۔ یہ سب سپنا تھا۔ میں سدا سے اس کوٹھڑی میں قید تھا۔ جس میں کیسر سنگھ کی گندگی داخل نہیں ہو سکتی۔ پرانے دنوں کے ساتھی نہیں آسکتے۔ بسنتی کا پل کے پار رہ جانا عزت کا سوال تھا۔ کیسر سنگھ کا میرے کمرے میں آنا عزت کا سوال ہے؟ آخر عزت کیا شے ہے؟ کبھی کبھار میرے دل کے اندر کوئی شے ابلنے لگتی ہے۔ ٹوٹنے کی صدائیں آتی ہیں۔ وہ کیا شے ہے؟
کیا ابھی کچھ باقی ہے؟
اور اب تو مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ ہر شے دھندلا گئی ہے۔ ذہن سے نقش مٹتے جاتے ہیں۔ نام ہیں مگر صورتیں نہیں۔ سائے ہیں وجود نہیں۔ جب اندھیرا گہرا ہوتا ہے تو اس کی مخملیں سطح کو چھو کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے شیر دل اور دلاور علی کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہوں اور اس کے ابلتے ہوئے دل کے ٹکڑے پر ٹھنڈک پانی بن کر گرتی ہے پھر یہ دیے بھی بجھتے چلے جاتے

ہیں۔ کھنڈر میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ پر آج نہ جانے کیوں انورادھا کے جانے پر مجھے یہ سب باتیں یاد آرہی ہیں۔

حد نظر تک یادوں کے کاروان اس وقت کے پل پر سے گزر رہے ہیں۔ یہاں سے بھی شیر دل اور دلاور علی پیچھے رہ جائیں گے۔ مجھے گلے سے لگا کر رخصت کر دیں گے اور میری روح ریزہ ریزہ کٹ کٹ کر اس تیز دھار والے پل پر سے نیچے گر جائے گی۔ کھوکھلا وجود دوسری طرف چلا جائے گا۔ جہاں اس کا باہر کی دنیا سے تعلق صرف ایک کھڑکی کے ذریعے ہے۔

بن باس

پرندے تیز تیز پر مارتے اڑتے جاتے ہیں اور دھوپ پیلی ہو کر اچل کے بڑے تالاب کی سیڑھیوں پر اتر آئی ہے۔ گردوارے کے کلس کا رنگ ڈوبتی کرنوں میں سنہری مائل سفید لگ رہا ہے اور بڑے میدان سے دوسری طرف میلہ بکھرنے لگا ہے، اب تھوڑی دیر میں دسہروں کو آگ لگا دی جائے گی۔ لوگ شور کریں گے، ڈر کر بھاگیں گے اور شام کے نیلے دھندلکے میں چنگاریاں اترتی ہوئی پھلجھڑیاں لگیں گی۔ دیر تک آگ کے شعلے اٹھیں گے۔ ارد گرد کے لوگوں کے چہرے اس آگ کی روشنی میں بڑے بھیانک لگیں گے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک راون کا روپ دھارے سیتا کو جدائی سے ولاپ کرتے دیکھتے اور دوسری بار بن باس بھوگتے پا کر خوش ہونے یہاں آیا ہو۔

بن باس کتنی کٹھن بات ہے۔ پر کسی کے بس میں تو کچھ نہیں۔ کون اپنی خوشی سے دکھ قبول کرتا ہے؟

بھائی کہا کرتے تھے ”بی بی یہ سارا وقت خواب سے کیوں دیکھتی ہو۔ یہ پیار جو اب تمھیں ملتا ہے یہ رونق جو تمھارے گرد نظر آ رہی ہے ہولے ہولے کم ہو

جائے گی۔ وقت ہر شے میں کمی کر دیتا ہے۔ پر یہ بربادی اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔" آج بھائی کہاں ہیں؟ اگر جنم بھومی کی باس کو اٹھائے جاسوس کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلنے والی ہوا جا سکتی اور انھیں کہیں ڈھونڈ سکتی تو میں کہتی " جا کر پوچھو تو سہی۔ یہ دکھ میں کمی کیوں نہیں ہوتی ۔ برسوں بوجھ اٹھائے اور کٹھن راہوں سے گزرنے پر بھی انسان سپنے کیوں دیکھتا ہے سکھ کی آس کیوں کرتا ہے۔ روشنی سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے؟"

سیتا جی نے بن باس بھوگ کر بس یہی دعا کیوں کی تھی کہ وہ رام چندر سے مل سکیں۔ کیا مصیبت انسان کو اتنا سخت نہیں کر دیتی کہ وہ اچھے دنوں کی امید ہی چھوڑ دے۔ اندھیرے سے آخر پیار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں؟ نا کھ کے درخت میں اس سال سے پھول آرہے ہیں جس سال منی پیدا ہوئی تھی۔ رت بدلتی ہے تو شاخیں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور پیڑ پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتا ہے، پیڑ اور دھرتی کا سمبندھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں زمین میں اور گہری گرتی چلی جاتی ہیں۔ اس رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔

منی اب بڑی ہو گئی ہے۔ سال کتنے دبے پاؤں میرے قریب سے نکلتے چلے گئے ہیں۔

آج بڑی ماں نے گرپال سے کہا تھا۔ ”کاکا بہو اور بچوں کو ذرا دسہرے میں گھما لا۔ کتنے برس سے وہ اس گاؤں سے باہر ہی نہیں گئی۔“

گرپال نے بڑی تیزی سے کہا تھا۔ ”ماں تو نے یہ بھی کہا کب تھا۔ یہ برسوں سے کہیں نہیں گئی تو میرا کیا دوش ہے“ بھلا اس میں کس کا دوش ہو سکتا ہے جب کوئی مجھے بہو کہتا ہے تو لگتا ہے گالی دے رہا ہو۔ برسوں سے سن رہی ہوں، اس رات سے سنتی آئی ہوں۔ جب گرپال نے مجھے اس آنگن میں دھکیلا تھا اور چوکی پر بیٹھی ہوئی بڑی ماں سے کہا تھا۔

”ماں دیکھ تیرے لیے بہو لایا ہوں، بانکی اور سندر۔ آج جتنی لڑکیاں ہمارے ہاتھ لگیں ان میں سب سے اچھی ہے۔“ اور دیے کی لو اونچا کر کے ماں میری طرف آئی تھی۔ بھوک اور خوف سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میلوں ننگے پاؤں چل کر مجھ میں انگلی اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ میں ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنگن میں بندھی گائے اور بھینس ٹکر ٹکر مجھے تکتی رہی تھیں اور چارہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماں نے سر سے پاؤں تک کئی بار مجھے دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

”تو اگر اچھے کام کرتا تو آج یہ حال نہ ہوتا میرا۔ دیکھ چولھا جھونکتے ہوئے میری آنکھیں اندھی ہو چلی ہیں۔ اور ساری کہاریوں نے فصل پر اناج نہ ملنے

کی وجہ سے ہمارے گھر آنا بند کر دیا ہے۔ بتا مجھ سے یہ گھر کا بوجھ کیسے سنبھلے گا۔ کھیتی باڑی کریں تو کیا ہی سکھ ہو مجھے۔"

گرپال نے کہا۔ "دیکھ تو سہی۔ اب مہریوں کہاریوں کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ جو تیری داسی ہے، بس اس سے چکی پسوا، پانی بھروا، جو مزدوری کروا، میرا اس کا کیا علاقہ۔ میں نے تجھے بہولا دی ہے۔"

سارے سنگراؤں کی بہوئیں آئیں۔ نہ کوئی باجہ بجا نہ کسی نے ڈھولک پر لہک لہک کر گیت گائے نہ ناچنے والیوں نے سوانگ بھرے اور نہ کولہے مٹکا کر نقلیں کیں۔

میرے دھول سے اٹے ہوئے بالوں میں نہ کسی نے تیل ڈالا۔ نہ کسی نائن نے سنگار کیا۔ کورے ہاتھوں اور اجڑی مانگ سے میں سہاگن بن گئی۔ کسی نے دروازے پر میرے سر سے تیل ماش نہ وارے اور بڑی ماں نے گرپال کی بات سن کر یوں میری طرف دیکھا گویا میں مصیبت ہوں۔ جسے اس کا پوتا کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ پھر دیا اسی طرح ہاتھ میں لیے وہ چوکے میں چلی گئی اور مجھ سے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ بہو کا کیسا سواگت ہو رہا تھا؟

تب سے آج تک میں بھی سیتا جی ہوں۔ میں بن باس بھوگ رہی ہوں۔ اور میں سنگراؤں میں قید ہوں۔ جھولے اکھاڑتے، بیڑیاں پیتے، جھولوں والے ایک

دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے ہیں اور گدھوں پر سامان اتنے زور سے پٹختے ہیں جیسے گدھے لکڑی کے ہوں۔ رام لیلا کی رتھیں ایک طرف کھڑی ہیں اور روپ دھارنے والے لڑکے چمکیلے کپڑوں کی پرواکیے بنابلائی کی قلفیاں اور چٹنی والے پکوڑے کھا رہے ہیں۔ دودھ اور چٹنی کے دھبے ان رنگ برنگ پوشاکوں پر کوڑھ کے داغ لگتے ہیں۔ منی کھڑی انھیں تکتی جارہی ہے، اسے اس بات کا ہوش نہیں کہ وہ گم ہو جائے گی۔ ہوش ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جسے گم ہونا ہو وہ بھرے گھر سے کھو جاتا ہے۔

گرپال اسے کھینچ رہاہے اور دونوں لڑکے تھک کر روتے ہر بیچنے والے کو دیکھ کر چیز کے لیے ضد کرنے لگتے ہیں، یہ میلہ ہے۔

مائیں بچوں سے بے پروا بھیڑ میں دھکے کھا کر ادھر ادھر ہو جاتی ہیں اور چھوٹے ایک ایک چہرے کو تکتے زور زور سے روتے آگے ہی آگے بھاگتے جاتے ہیں۔ بھلا میلے میں بچھڑنے والے کہیں پھر ملتے ہیں؟ یہ بجوگ جنم جنم کے لیے چاہنے والوں کے درمیان اوٹ بن جاتا ہے۔ وہ صورتیں جن پر ہم سارا کچھ لٹا دیں۔ اس آس پر کہ ہم انھیں ایک بار پھر دیکھ سکیں، کہیں نظر نہیں آتیں۔ راستے لہروں پر تانا بانا بننے والے کیڑوں کے قدموں کے نشانوں کی طرح ہمارے پیچھے مٹ جاتے ہیں۔ ہم جن راہوں سے چل کر آتے ہیں ان سے

لوٹ نہیں سکتے۔ کچھ بھی تو واپس نہیں آتا اور میلے کی بھیڑ آگے ہی آگے چلتی رہتی ہے۔

"وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا" بھیا کہا کرتے تھے۔ "بی بی جو لمحہ بیت جاتا وہ مٹ جاتا ہے، دھول بن جاتا ہے۔" جب میں پڑھنے میں بے دھیانی سے کام لیتی اور گڑیا گھر کو سجانے میں اسکول سے آکر سہیلیوں کے ساتھ لگی رہتی تو بھیا مجھے سمجھایا کرتے تھے۔

یہ گڑیا گھر مجھے بابا نے لا کر دیا تھا۔ بابا یہ کھلونا میرے لیے کسی نمائش میں سے خرید کر لائے تھے۔ منی دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑی سی کپڑے کی گڑیا سنبھالے ہوئے ہے۔ گرپال اوپر بھیڑ کو دیکھ رہا ہے اور منی جھک جھک کر گھڑی گھڑی اپنی گڑیا دیکھتی ہے۔ دونوں لڑکے راون کے بت لیے ہوئے ہر چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ منی کی آنکھوں میں اپنی گڑیا کے لیے کتنا پیار ہے۔ کپڑے کے جوڑے سے منہ پر بے ڈھنگے رنگوں سے ناک اور آنکھیں بنی ہیں۔ ناک میں نتھلی ہے۔ گوٹے لگی چنری سر پر رکھے اپنے لہنگے کو سنبھالے یہ کنچنی، لگتا ہے، ابھی ناچے گی۔ اچل کے تالاب کے کنارے ہو کر کھیتوں میں سے ہمارا راستہ سنگراؤں کو جاتا ہے۔ زندگی کا کارواں چلتا ہی رہتا ہے۔ سیدھے ٹیڑھے راستوں اور الجھی پگڈنڈیوں سے کسی منزل پر پہنچنے کی

تمنا نہ بھی ہو تو بھی سدا چلتے رہنا پڑتا ہے۔ سدا سدا، چاہے پاؤں زخمی ہوں اور دل میں کچھ نہ ہو۔

شام کا نیلا دھندلکا اور نیچے اتر آیا ہے۔ شامیں نہ جانے کیوں مجھے بے حد اداس کر دیتی ہیں۔ آکاش پر اکیلا تارا دھڑکتا کانپتا دیے کی لو کی طرح تھرتھراتا ہے۔ اور نیلاہٹ کے خالی سمندر میں اس کی تنہائی مجھے اپنے بن باس کی یاد دلا دیتی ہے۔ انسانوں کے اس ویرانے میں میں تنہا پیڑ کی طرح ہوں جس پر نہ پھول آتے ہیں اور نہ پھل۔

یہ تارا مجھے اس جہاز کی یاد دلاتا ہے جس میں بھائی سمندر پار گئے تھے وہ اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ جب دور دیس کو جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو اماں کی آواز میں آنسوؤں کی رندھن تھی۔ مگر وہ بڑی تسلی سے چیزیں ٹھیک کرتی اور دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ باہر بابا کئی طرح کے انتظامات میں لگے تھے اور بھیا اداس تھے۔ آپا چپ چاپ گم سم آنگن میں دبے پاؤں چلتی ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ میں سارے گھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ چوٹ جب تک نہ لگے زخم کی تکلیف کا کیا پتہ چلتا ہے۔

بندرگاہ تک ہم سب انھیں پہنچانے گئے تھے۔ بھیا بھابی کا سامان رکھواتے، کاغذ ٹھیک کرنے گینگ وے پر اوپر آجا رہے تھے اور میں جنگلے پر جھکی مٹیالے سبزی

مائل پانی کو دیکھتی بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ ”یہ پانی ایسا کیوں ہے، اس پر تیل کے دھبے کیوں ہیں، کشتیاں کیوں ہیں، چپو کہاں ہیں، اور اونچی نیچی لہروں پر کشتیاں ڈولتی ہیں تو ہول نہیں آتا کیا؟“ سوالوں سے پریشان ہو کر بھائی کہہ رہے تھے۔ ”جب تو بڑی ہو جائے گی تو ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جائیں گی بی بی۔“

اور آج مجھے معلوم ہے جس کشتی کے چپو نہ ہوں وہ ڈوب جاتی ہے۔ کشتیاں ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پانی کی ایک لہر بھی انھیں ڈبونے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ بڑے ہونے پر جب باتوں کا پتہ چلا ہے تو بھائی نہیں ہیں۔

پھر جہاز کی سیٹیاں سنائی دیں اور بابا نے بھائی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر اچھا بھئی سپرد خدا کہا تھا۔ بھیا بھائی سے لپٹ گئے تھے۔ آپا بڑے کمزور دل کی بات بات پر رو دینے والی تھی۔ اسے ہچکیوں سے روتے دیکھ کر بھائی نے کہا تھا ”بی بی کو دیکھو کیسی خوش ہے۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ دو سال میں تو لوٹ آؤں گا۔ کوئی سدا کے لیے بچھڑ رہا ہوں؟“ پھر مجھے سینے سے لگا کر بولے ”بی بی میں تیرے لیے پیرس سے تحفے لاؤں گا۔ بس تو مجھے خط لکھتی رہا کرنا۔“ اور میں نے زور سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر جب آخری سیٹی سنائی دی تو وہ مطمئن سے، بہت لاپروائی سے قدم اٹھاتے جیسے کہیں قریب ہی جا رہے ہوں، چلے

گئے۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم رومال ہلاتے رہے۔ پھر شام کے دھندلکوں میں بندرگاہ کی ساری روشنیوں کا عکس پانی کی لہروں میں ڈولنے لگا اور جہاز کی بتی اکیلے تارے کی طرح کانپتی ہوئی اوجھل ہو گئی اور اس کے بعد ساری روشنیاں میرے گرد سدا کے لیے ڈوب گئیں۔ لہروں میں سے کبھی کوئی کرن نہیں نکلی۔

میں اماں سے لپٹ کر کتنی زور سے چیخ پڑی تھی۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا اب یہ صورت پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ اب تو بھائی کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ میرا دل زور زور سے کانپ رہا تھا جیسے مغرب میں خالی آکاش پر اکیلا تارا نیلے دھندلکے سے اوپر تھرتھراتا اور ڈرتا ہے۔ دور باغوں میں رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ گرپال نے دونوں لڑکوں کو کندھوں پر بٹھا لیا ہے اور وہ کھیتوں کے درمیان سفید لکیروں کی سی پگڈنڈیوں پر ہم سے آگے آگے جا رہا ہے اور منی دھیرے دھیرے چل رہی ہے، پانی کے نالوں کو پھلانگ کر وہ دس کھیت پرے ہمارا انتظار کرے گا۔ اور دونوں لڑکوں کو راون کی کہانی سنائے گا۔ اسے کیا معلوم سیتا اس کے پیچھے آ رہی ہے اور وہ خود راون ہے۔

منی مجھ سے کہتی ہے "ماں سروپ کے بابا نے اسے دسہرے پر بڑے اچھے رنگ والے کپڑے بھیجے ہیں۔ ریشمی ہیں۔ ہاتھ لگانے سے بہت اچھے لگتے ہیں۔

ماں میرے کوئی بابا نہیں ہیں جو مجھے اچھی اچھی چیزیں دے سکیں، ماں تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میلہ اچھا نہیں لگا تمھیں، تم تھک گئی ہو ماں؟"

"ہاں منی میں تھک گئی ہوں، میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ مجھے بہت چلنا پڑا ہے۔"

"کوئی نہیں بوڑھی ہو گئی۔" منی بڑے یقین سے میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "تم تو دیوی کی مورتی لگتی ہو ماں، بڑی ماں بھی یہی کہتی ہے۔"

منی کو کیا معلوم مجھے کتنا چلنا پڑا ہے۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی کا فاصلہ کتنا بہت ہوتا ہے اور جب انسان اینٹھ جاتا ہے، اس کے من میں کوئی آشا نہیں رہتی، تب وہ پوجنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سنگراؤں کی راہوں پر بچھڑے ہوؤں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میرا من خالی ہے، میں لکشمی ہوں۔ پھر بھی دکھ کا ناتا کتنا اٹوٹ ہے۔ گہرا اور پکا۔ کبھی ساتھ نہ چھوڑنے والا۔

منی پھر پوچھ رہی ہے۔ "کیا ہمارے کوئی بابا نہیں؟"

میں اس سے کیا کہوں۔ میں اسے کیا جواب دوں۔ دوراہے پر کھڑی سوچ رہی ہوں۔

بھیا مجھے کتنے پیارے تھے پر میں ان سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ وہ گھر میں گھستے تو چنری خود بخود سر پر آجاتی۔ چال میں ٹھہراؤ اور ہنسنے کی آواز میں روک کی

کوشش ہوتی۔ جب میں ان کے قریب کھڑی ہوتی تو لگتا دنیا میں ان سے لمبے قد کا کوئی نہیں ہو سکتا۔ سنبھل کر چلتے اور سلیقے سے بات کرنے والے میرے بھیا کتنے اچھے لگتے تھے۔ صاف سیدھی لکیریں۔ نہ صفحے گندے کرتے اور نہ ہاتھوں میں سیاہی بھرتے، مجھے کہتے "بی بی جب تو بڑی ہو جائے گی تو تو بھی ایسا ہی لکھا کرے گی۔" سیدھی سطریں اور بنا دھبے کے بھیا آج مجھے دیکھیں تو کیا کہیں؟ میرے نصیب کے لکھے پر اتنی سیاہی ہے کہ سارے صفحے پر ایک بھی تو سیدھی لائن دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے تو کبھی لکھنا نہ آیا۔

ان دنوں گڑیا گھر کو سجا کر میں سوچا کرتی تھی۔ ہم اس میں رہ سکتے ہیں۔ اماں اور بابا اور میں بھیا اور بھائی اور آپا سبھی بس یہاں رہیں گے۔ زندگی رس بھرا گیت ہے۔ کسی شے کی ضرورت نہیں، کوئی کمی نہیں۔

بھیا کی شادی ہوئی تو میں نے کہا تھا ہمارا گھر جنت ہے مکمل اور آسمانی جنت۔ ان دنوں اگر میں دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو سمجھ ہی نہ سکتی کہ کیا چاہوں۔ آج کی طرح میں نے خدا سے کچھ نہیں مانگا۔ سکھ اور دکھ کی انتہا زندگی کے چکر میں ایک ہی قدم پر ہے۔

بھائی سمندر پار چلے گئے اور میرے جنت کے خواب چور چور ہو گئے۔ ساری زندگی کی کرچیں نوکیلے کناروں والے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح ادھر ادھر

پھیل کر گزرنے والوں کو زخمی کر رہی ہیں۔ سب کے پاؤں معذور ہو گئے ہیں۔ راہ کی دوسری طرف جانے والا کوئی بھی تو نہیں رہا۔ راستہ یوں سونا ہے جیسے شمشان میں سے ہو کر گزرتا ہو۔ دور دور تک کوئی نہیں۔سیتا جی کے ولاپ کو اس دیس میں کون سنتا ہے۔ اکیلے پن کا دکھ کتنا کٹھور ہے۔ زندگی کتنی مشکل ہے گرپال دور کھڑا مجھے پکار رہا ہے۔ منی کو پکار رہا ہے۔ ہم دونوں بہت ہولے چل رہی ہیں۔ کپاس کے کھیتوں میں صرف سوکھی لکڑیاں کھڑی ہیں۔ ہنستے پھول لوگ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ گندم کے کھیتوں میں ابھی نہ بالیں پھوٹی ہیں اور نہ ان میں دانے پڑے ہیں۔ ہوا کے جھونکے نرم لچکیلے پودوں کو جھکا لیتے ہیں۔ ہوا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ہر ایک جھکتا ہے۔

بڑی ماں بہت بے چین ہو گی۔ میری طرف سے ایک انجانا خوف نہ جانے کیوں ہر وقت اس کے کلیجے کو دھڑکاتا رہتا ہے۔ جس دیس کا وہ سوچتی ہے۔ اس کا راستہ کٹھن ہے اور میں گرپال کے ساتھ جتنا راستہ چل کر آئی ہوں۔ اس سے آگے چلنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ آخر کوئی کہاں تک چلتا جائے اور پھر جب کہیں جانا ہی نہ ہو۔ زخمی دل اور زخمی دل کو لے کر اجڑی مانگ کے ساتھ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔ منی میری راہ میں کھڑی ہے، منی میرے اور ان

کے درمیان اوٹ ہے۔ کتنے فاصلے ان کے اور میرے درمیان ہیں بھلا میں اس سے پرے کیسے جھانک سکتی ہوں؟

گانے والوں کی ٹولیاں بھجن گاتی پیچھے آرہی ہیں۔ اچل کے تالاب کے پاس جما ہوا میلہ اب بٹ کر پھیل کر راہوں میں بکھر آیا ہے، بچے روتے جاتے ہیں۔ مردزور زور سے باتیں کرتے ہوئے میرے اور منی کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ عورتیں اچھے اچھے کپڑے پہنے دوپٹوں کو سنبھالتی ذرا ذرا سے گھونگھٹ ماتھوں تک سرکائے میلے میں خریدی مٹھائیوں کی پوٹلیاں ہاتھوں میں پکڑے بچوں کو کندھوں سے چمٹائے ننگے پاؤں تیز تیز چل رہی ہیں، ان کے جوتے دوپٹوں کے پلوں میں بندھے ان کے پیچھے جھول رہے ہیں، زمین اور جسم کا گہرا رشتہ ہے۔ اس کے اور انسان کے درمیان کوئی پردہ کیوں ہو؟

دور ہٹتے لوگ سفید دھبے لگ رہے ہیں۔ اکتارہ بجاتا ایک سادھو سنگراؤں جانے والی راہ پر ہمارے پیچھے مڑ گیا ہے۔ اس کی آواز میں کتنا درد ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے جب روشنی کی تمنا باقی رہتی ہے اس کے تاروں کی جھنکار مجھے سنائی نہیں دیتی صرف گیت کے بول ہوا کے ساتھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔

"ماں تم چپ کیوں ہو، کوئی بات کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔" منی بڑھتے اندھیرے میں میرے ہاتھ کو اور زور سے پکڑنے کی کوشش میں اپنی گڑیا کو سنبھال نہیں سکتی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی ہے۔ اسے کوئی اور سوال پوچھنے کا ہوش نہیں۔

منی کو بڑے ہونے پر آپ سے آپ پتہ چل جائے گا کہ اندھیرے سے ڈرنا بیکار ہے۔ جب اس کا جادو چل جاتا ہے پھر کچھ کیے نہیں بنتا۔ بھائی کہا کرتے تھے "بی بی پانی میں زور ہے، اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔" مجھے ان دنوں یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ پانی میں زور کہاں سے آتا ہے، حالات کا دھارا راہیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ بڑی ماں جب مجھے پکارتی ہیں تو میں پھلکاری کو ماتھے تک سرکائے ہولے سے "جی" کہتی ہوں۔ ہر کام کو اتنی ہی جلد نپٹانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مصروف رہوں اور اپنے ساتھ اکیلے ہونے، سوچنے بچارنے کا وقت نہ مل سکے۔

جب سمے تھا تو سوچ نہ تھی۔ اب سوچ ہے تو سمے نہیں۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ یہ کمی کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کبھی کچھ نہیں ہوتا اور کبھی کچھ۔ آج آنکھیں بند کرتی ہوں تو دل کہتا ہے "وہ سب ابھی آئیں گے اور بھیا مجھے دیکھتے ہی کہیں گے بی بی یہ کیا بہروپ ہے۔ پھلکاری تمھارے سر پر ذرا اچھی

نہیں لگتی۔ اتار کر اس کو پرے کر، یہ دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔ چھوڑ دے سارے کام، ادھر آ ہمارے پاس بیٹھ، چھٹیاں کتنی کم ہوتی ہیں اور پھر گزر کتنی تیزی سے جاتی ہیں۔ جب ہم گھر آیا کریں تو بس تو کہیں بھی نہ جایا کر۔"

بڑے کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تصویروں کی طرف دیکھتے، باتیں کرتے، چائے پیتے، آتشدان کے سامنے آگ تاپتے جب ہم سب زور زور سے قہقہے لگاتے تو اماں سوئی سوئی آواز میں کہتیں "صبح بھی اٹھنا ہے اب سو جاؤ بچو۔"تو بھیا زور سے پکار کر جواب دیتے۔"اماں گھر سے دور ہی تو رہتے ہیں۔ سارا سال اداس ہو کر سویا کرتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ سو ہی جائیں گے اماں۔" اور میں سوچا کرتی خوابوں کی طرح یہ ساری باتیں دھول میں مل جائیں گی۔ محبت کے سہارے جو جنت آباد کی ہے اس پر اس طرح گرد و غبار چھٹ جائے گا کہ کہیں بھی شادابی نظر نہیں آئے گی۔ ہم تصویروں کی طرح حقیقت کی پرچھائیں ہیں۔ میرا دل تو سدا سے باؤلا تھا۔ الٹی باتیں سوچنے والا بڑا ہی مورکھ۔

دل سدا سے انہونی باتوں کے سپنے دیکھتا اور یونہی دھڑکتا ہے جب اس سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے۔"آخر تیرا کیا جاتا ہے بی بی! سپنوں پر تو کسی کا اختیار

نہیں، اور پھر اس سپنے میں کیا برائی ہے کہ کھلے کواڑوں کے اندر کسی دن وہ سب آجائیں جن کا تمھیں انتظار ہے۔"

میں کہتی ہوں "میرے لیے سوائے اندھیکار کے کچھ باقی نہیں رہا۔"

دل کہتا ہے۔ "ناامید ہونا بہت بڑا پاپ ہے۔" پر امید آخر کس سے کروں گی؟ منی میرا آنچل پکڑے پوچھ رہی ہے۔ "ماں بتا ہمارے ماما ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔ کیا دیوالی میں ہم ماما کے پاس نہیں جائیں گے ماں؟ ساری لڑکیاں تو جارہی ہیں۔ ماں میرا دل اب اس گاؤں میں نہیں لگتا۔ میرا دل میلے میں بھی نہیں لگا۔ میرا جی تو اداس ہے۔ میں ماما کے گھر جاؤں گی۔" کس سے پوچھوں، اس کے ماما کا گھر کس نگر میں ہے۔ سنگراؤں سے باہر سارے گاؤں مجھے گڑیا گھر لگتے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ سنگراؤں بھی پرچھائیں ہے، سب کچھ پرچھائیں ہے۔

اور پھر بھی آتما نہ جانے کیوں بھٹکتی رہتی ہے۔ ایسی چیزوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے جو کہیں بھی نہ تھیں۔ ایسی آوازوں کو سننے کی آشا لیے جو پھر کبھی سنائی نہ دیں گی۔ سر پر گوبر کے ٹوکرے اٹھاتے اٹھاتے، دودھ بلوتے، اپلے تھاپتے نہ جانے کیوں چند مہینوں سے میرا دل یوں دھڑکا کرتا تھا۔ ہوا میں اچانک جانی بوجھی خوشبو ہوتی اور مجھے سارے باجوں کے سر اپنے قریب آتے جان

پڑتے۔ مجھے اپنے سے دور لے جاتے ہوئے۔ پر اب مجھے معلوم ہے جہاں وہ سب ہیں۔ وہ دیس میری پہنچ سے باہر ہے۔ سنگراؤں کو جانے والے راستوں کی طرح سارے لہراتے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے گزرتے ہیں۔ کہانیوں کے اس شہر کا کھوج لگا کر میں کیا کروں گی۔

آباد گھروں کے کھلے کواڑوں سے اندر جلتے دیوں کی کانپتی روشنیاں پریوں کے دیس کی تصویر سی جان پڑتی ہیں۔ گرپال اور لڑکے، میں اور منی اب ساتھ ساتھ چلے رہے ہیں۔ سرکنڈوں کے ریشمی بور میرے بالوں سے چھو رہے ہیں، ہوا اپنا ریشمی آنچل سنبھالے دھیرے دھیرے سونے لگی ہے۔

اکیلے سے دو ہوں تو راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

منی کہتی ہے "ماں میں تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا۔" لڑکے رو رہے ہیں اور ان کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ راون ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ ہم راہ سے ذرا ہٹ کر ایک کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے ہیں۔ منی نے میری گود میں اپنا سر رکھ لیا ہے۔ گرپال کہہ رہا ہے۔ "دیکھو تو سہی عورتیں اتنی بیوقوف ہیں، آج کتنے بچے گم ہو گئے ہیں میلے میں، انھیں ہوش ہی نہیں رہتا کہ سنبھال سکیں، پاگلوں کی طرح رام لیلا کی راس دیکھتے دیکھتے اپنے بچوں سے بچھڑ جاتی ہیں ——"

”میلے کے بنا بھی تو بچے ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں۔“ میں اس کی طرف دیکھے بنا منی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہوں۔

”تم کبھی بھول بھی سکو گی اس بات کو کہ نہیں۔ وہ وقت اور تھا یہ اور ہے۔“ گرپال ہولے سے کہتا ہے۔

گرپال کو کیسے سمجھاؤں کہ وقت کبھی اور نہیں تھا۔ اور انسان کے نصیب میں دکھ اس لیے ہے کہ وہ بھول نہیں سکتا۔ میری یاد میں وہ زمانہ اسی طرح زندہ ہے۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ ملک آزاد ہو گیا تھا۔ ملک بٹ گیا تھا۔ اماں اور بابا نے کہا یہ سارے لوگ پاگل ہیں جو ڈر رہے ہیں َدوسرے دیس کو بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا اتنے اپنوں کے درمیان بھی کبھی کسی کو کوئی دکھ چھو سکتا ہے۔ اماں بابا کتنے بھولے تھے، دکھ تو سدا اپنوں ہی سے ملتے ہیں َاس پریشانی کی کیا اصلیت ہے جو بیگانوں کے ہاتھوں ہمیں پہنچتی ہے۔ ساری زندگی نے اپنی خوبصورتی کھو دی ہے اور ہر شے کا چہرہ خون کے غبار میں چھپ گیا۔ بھگوان، گرو اور اللہ کے نام پر دان دینے والوں نے ایک دوسرے کے گلے پر تلواریں چلائیں، بہنوں بیٹیوں کے لیے کٹ مرنے والے عورت کی عزت اور عصمت کو جھوٹا بول سمجھنے لگے۔ بھائی اور اپنوں کے لفظ صدیوں کی بیڑیوں کی طرح اس آزادی اور بٹوارے میں کٹ گئے اور جتھے بنا کر گھومنے والوں کے قدموں

میں دھول بن کر مل گئے۔ اماں نے بابا سے کہا تھا۔ ”ہم دونوں بھی لڑکیوں کو لے کر چلتے ہیں، میرا جی تو ہول کھاتا ہے۔ اس وقت کسی پر بھروسہ کرنا بیکار ہے۔“

اور بابا نے اسی طمانیت سے کہا تھا۔ ”بی بی کی اماں تم بھی عام لوگوں کی طرح ناحق جان گھلاتی ہو۔ بھلا ہمیں کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔ بٹوارے کے بنا چارہ نہ تھا، شور تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا، سب کچھ۔“

اماں عام زندگی میں تو ایسے جواب سے مطمئن ہو جایا کرتی تھیں پر اس دن نہ ہوئیں۔ بولیں۔ ”جان کے ساتھ عزت کا خطرہ ہے۔ جوان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ میری مانو تو ہم سب کو بھیا کے پاس بھیج دو۔“

بابا بولے۔ ”راہوں پر ہر طرف گاؤں کے آوارہ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں۔ گاڑیاں کی گاڑیاں کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ ایسے میں جانا اور بھی زیادہ خطرے کی بات ہے۔ بس فکر نہ کرو خاموشی سے اپنے گھر میں رہو۔ خدا ہماری حفاظت کرے گا۔“ بابا حالات کی وجہ سے پریشان ہو گئے مگر انھوں نے وقت کے گزرنے پر سوائے خدا کے بھروسے کے اور کسی کی مدد کا ہمیں واسطہ نہیں دیا۔ یوں وقت تو کب سے گزر چکا تھا بابا کی بھول بھی یہی تھی کہ انھوں نے

پرانی زندگی اور قدروں کا سہارا لیا تھا اور اسی بھول کے بدلے تو جب گرپال مجھے گھسیٹ کر گھر سے باہر لا رہا تھا میں نے بابا کے سفید سر کو نالی کے کنارے پڑے دیکھا۔ ان کا جسم نالی میں تھا۔ بند آنکھوں اور خون آلود سر کو بھول کر وہ جانے کس طاقت سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ دعا کے قبول ہونے کا وقت تھا بھلا؟ اماں کے سینے سے ایک چمکتا ہوا برچھا آر پار ہو گیا تھا اور وہ اسی جگہ گر گئیں جہاں انھوں نے خدا سے اپنی حفاظت اور عزت کے محفوظ رہنے کی دعا مانگی تھی۔ ابا کی چیخیں آج بھی مجھے آندھی کے شور میں کبھی کبھار سنائی دے جاتی ہیں۔ پر آج کی طرح تب بھی میں کیا کر سکتی تھی۔ گرپال مجھے کھینچے لیے جاتا تھا۔ میرے سر پر چنری نہ تھی۔ پر مجھے ان راہوں پر بھیا کے ملن کی آس کب تھی۔ اگر بھیا میرے پاس ہوتے تو بھلا کوئی مجھے چھو سکتا۔ کوئی یوں ننگے سر مجھے جنم بھومی کی ان راہوں پر گھسیٹ سکتا تھا۔ جہاں کا ہر ذرہ ہمیں پیارا تھا۔ ان راہوں پر میرے بابا کا خون گرا ہے، اس دھول میں ان کا سفید سر گھسیٹا گیا تھا۔ وہ کون دیس ہے؟ اگر اس دھول کی ایک جھلک دیکھ سکوں تو آج بھی اس کو ماتھے پر چڑھاؤں۔ وہ مٹی مجھ سے تو خوش قسمت ہے!

مجھے اپنے بابا سے کتنی باتیں ابھی کرنا تھیں۔ اماں کو میں نے کتنا ستایا تھا۔ بھیا اور بھیائی کو کتنا تنگ کیا گیا تھا اور جب میرا وجود ڈولی کے بنا سنگراؤں تک کھینچا گیا تو

کوئی ماں جایا نہیں تھا۔ جس سے میں رو رو کر التجا کرتی کہ بابل کا دیس چھوٹ رہا تھا اور کوئی مجھے وداع نہیں کر رہا تھا۔

دکھ سہنے کے بعد اگر سکھ کی آس ہو۔ دور کوئی امید ہو تو دکھ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور میرا راستہ کبھی نہ کٹ سکا۔ کیا بھولوں اور کیا یاد کروں، گرپال تم نے تو کبھی مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی نہیں دیا۔

بڑی ماں کی مار، گرپال کی گالیاں، بھوک کی سختیاں میں نے دور ٹمٹماتے دیے کی طرح اس آس کی طرف دیکھ کر برداشت کر لی تھیں کہ شاید بھائی اور بھیا مجھے کسی دن کھوجتے ہوئے سنگراؤں میں آ جائیں۔ پھر میں بڑی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرا دوں گی اور گرپال کی طرف دیکھے بنا اپنے بھیا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس دن نیم کے پتوں میں کھیلتی ہوا گیت گائے گی اور سارے گاؤں میں خوشیاں ہوں گی۔ انسان اپنے کو ساری کائنات کا مرکز کیوں سمجھتا ہے نہ جانے کیوں؟ جب تک اندھیرے سے آنکھیں مانوس نہیں ہوتیں انسان اجالے کے لیے آنکھیں جھپکاتا رہتا ہے اور سپنے دیکھتا ہے۔ امیدیں آوارہ خیالوں کی طرح دل کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں۔ منی پیدا ہوئی ہے تو میرے سپنوں کی کڑھیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ دل کے گرد آشاؤں کا گھیرا ابھر گیا۔ میں

نے سپنوں میں جاگنا شروع کر دیا۔ سنگراؤں کے گیتوں میں کبھی کبھار میرا
ایک بول بھی گونج اٹھتا۔
جب دونوں ملکوں میں صلح ہوئی تو گرپال بہت اداس تھا۔ سہما سہما اور پریشان،
بڑی ماں اور وہ چوکے میں بیٹھے ہولے ہولے کیا باتیں کیا کرتے۔ پر مجھ سے
دونوں کچھ نہ کہتے۔ ان دنوں منی پاؤں چلتی تھی اور توتلی باتیں کرتی تھی۔
خبریں زور شور سے گھومتی رہیں اور پھر بگولے کی طرح بیٹھ گئیں۔۔
پھر میں نے سنا پاس کے گاؤں سے دوسرے ملک کے سپاہی لڑکیوں کو ڈھونڈھ
کر لیے جا رہے ہیں۔ کس دیس کو آخر؟ کہاں کن لوگوں کے درمیان؟ ان
دنوں میں نے بھی سوچا تھا۔ شاید بھیا اور بھائی بھی مجھے ڈھونڈنے آئیں گے۔
جادو کے شہر کے دروازوں کے باہر وہ کب سے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔
میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا چاہیے۔ ضرور۔ میں ہر روز اپنی امیدوں
کی پوٹلی کی گرہیں باندھتی اور آس لگائے گلی کے موڑ کی طرف دیکھتی رہتی۔
اس سال سردیوں میں ہمارے سنگراؤں میں سپاہی مجھے بھی لینے آئے۔ میں
بھیا اور بھائی کی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ منی کی ماں بھی ہوں اور میں نے
سوچا جانے یہ کون لوگ ہیں۔ وہ کون دیس ہو۔ زندگی میں پہلی بار میرا یقین
ڈگمگا گیا۔ سپنوں کا شہر دھول بن کر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میری جڑیں

سنگراؤں کی زمین میں گہری ہو گئی ہیں۔ سوکھنا، مرجھانا اور برباد ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ ہر کسی لڑکی کو مائکے سے وداع ہو کر سسرال جانا ہوتا ہے۔ ہر دلہن بیاہ کر کہیں نہ کہیں جاتی ہے۔ میرے بیاہ میں بھیا اور بھائی نہ ملے تو کیا ہوا۔ گرپال نے میرے لیے لاشوں کا فرش بچھایا تھا۔ خون سے راہیں سرخ تھیں۔ شہر کے شہر جلا کر روشنیاں کی تھیں۔ لوگ چیختے چلاتے بھاگتے میری شادی کی خوشیاں منا رہے تھے، ساری فضا میں بدلے رواجوں کے مطابق دھوئیں اور آگ اور خون کی بو تھی۔ مجھے وہ سنگراؤں لایا تھا۔ یہاں کھیتوں کے درمیان کچے گھر کی کوٹھڑی میں میری باقی زندگے بیتنے والی تھی۔ اپلوں کے نیلے دھوئیں سے بھرے گھر میں۔

میں کتنی دیر اس کتاب کے حرفوں کو دیکھتی رہتی تھی جو گرپال اتنے برسوں بعد منی کو پڑھانے کے لیے لایا تھا اور لفظ میری آنکھوں میں دھڑکن بن گئے تھے۔ مجھے وہ ساری کہانیاں یاد آ گئی تھیں جو بھیا اور بھائی نے مجھے سنائی تھیں اور پھر کہا تھا۔ ”بی بی اس سے بھی اچھی کہانیاں کتابوں میں ہیں۔ بس تو ذرا بڑی ہو جا پھر دیکھنا کتنے مزے کی باتیں پڑھے گی۔“ کہانیوں کی شہزادی کی طرح جب فوج مجھے چھڑانے آئی تو میں چھپ گئی۔ میں کسی اور کے ساتھ کیوں جاتی

بھلا؟ مجھے لوانے اور وداع کرانے بھیا اور بھائی کیوں نہیں آئے؟ میں دل ہی دل میں بھیا اور بھائی سے روٹھ گئی میں ان سے آج تک خفا ہوں۔

منی جب میرے پاس لیٹتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے۔ ”ماں تم دیوالی میں بھی ماما کے گھر کیوں نہیں جاتیں۔ ماں ہمیں کبھی کوئی مٹھائی کیوں نہیں بھیجتا؟“

ماما کبھی کھو جنے ہی نکلے منی۔ تیرے ماما مجھے کبھی وداع کرانے نہیں آئے۔ بھلا زندگی میں کسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ کسی کو ڈھونڈتا پھرے۔ ہولے ہولے محبتیں سہارا ڈھونڈ لیتی ہیں۔ بھیا کے بچے اب منی کے برابر بڑے ہوں گے۔ وہ جب اپنی ماں سے ماما کے گھر کی باتیں پوچھتے ہوں گے تو اسے چپ رہ کر یا دھیان ہٹانے کے لیے ان سے ادھر ادھر کی باتیں نہیں کرنی پڑتی ہوں گی۔ کبھی کبھار دل میں کہانیاں ہوتی ہیں پر زبان پر ایک لفظ نہیں آتا۔ گلی کی بہوئیں جب نیم کی چھاؤں میں چرخے کاتتی، گیت گاتی ہیں تو میں چپ رہتی ہوں۔ ہمارے آنگن میں کتنی رونق ہوتی ہے مائکے کے گیتوں میں کتنا رس ہے۔ رتیں بدلتی ہیں۔ سال بہ سال کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو ان کے باپ بھائی وداع کرانے آتے ہیں۔ تب آشا، ریکھا، پورو اور چندر کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے۔ وہ ہر ایک کے گلے مل کر مائکے جاتی ہیں۔ ان کے بول گیت لگتے ہیں۔ رتیں بدلتی رہتی ہیں۔

لڑکیاں کوے کو ٹھے سے اڑا کر اپنے ویروں کے آنے کا پوچھتی ہیں۔ میرا دل گلے کے قریب یونہی دھڑکنے لگتا ہے اور کلیجے کے قریب ایک نس ایسے پھڑکتی ہے مانو پھٹ جائے گی۔ میں کوے کو اڑانے کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو بے جان ہو کر ہاتھ میرے پہلو میں گر جاتا ہے۔

بڑی ماں کو مجھ سے آس بندھ گئی ہے۔ جب میں نے اپنی پچھلی زندگی سے سارے ناتے توڑ لیے تو میرا اور بڑی ماں کا ناتا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ میں اس کی لکشمی دیوی بن گئی ہوں۔ میرے ہاتھ کا سوت وہ بڑے چاؤ سے لوگوں کو دکھاتی ہے اور دوسری عورتیں جب اس سے اپنی بہوؤں کے گلے کرتی ہیں تو وہ میری باتیں کر کے ان کا دل اور بھی جلاتی ہے۔
کھیتوں میں گھومتی اناج کی خوشبو اور سبز گندم کی بالوں کی باس دور تک پھیلے دھوئیں میں مل کر ایک گیت بن جائے۔ ان پر جھکا اکے دکے تاروں سے بھرتا آکاش اور نہر کا منی لہروں بل کھاتا پانی سب اس کے بول ہوں، اگر بیلوں کے لیے سر پر چارے کے گٹھے اٹھائے کسانوں کے پیچھے کسی دن گھوڑے پر سوار ایک جوان میرے کھلے کواڑوں کے سامنے آن کر اترے اور میں بھیا کہہ کر اس سے لپٹ جاؤں۔ میں دروازے میں کھڑی بھلا کس

کا راہ تکا کرتی ہوں۔ آشاؤں کے مرنے کے بعد ان کی لاشوں کو اٹھائے مجھے کب تک گھومنا پڑے گا؟ ان اینچ پیچ راہوں کو دیکھتے یہ آنسو آپ سے آپ میری آنکھوں میں کیوں آ گئے ہیں۔ منی کے سر پر یہ آنسو گر گئے تو وہ گھبرا کر اٹھے گی اور پوچھے گی۔ ''ماں تم روتی کیوں ہو؟'' میں اس سے اپنا دکھ کیسے کہوں؟

منی اگر پوچھے۔ ''ماں تمھاری آنکھیں بھیگی ہوئی کیوں ہیں؟ تم دسہرے کی رات بھی روتی ہو ماں۔ کیا تم تھک گئی ہو؟''

گرپال نے —— دونوں بچوں کو کندھے پر اٹھا لیا ہے۔ منی اور میں سنگراؤں جارہے ہیں۔ سیتا جی نے دوسری بار بن باس پر جانے کے بدلے راون کے گھر کو قبول کر لیا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئے گی کہ میں دوسری بار کسی بے یقینی کا سہارا لے کر اندھیکار سے باہر قدم دھر سکوں۔

زندگی کی ساری روشنیاں پیچھے شہر کی طرح مجھ سے دور ہٹ گئی ہیں مگر پھر بھی مجھے اس اندھیرے سے پیار نہیں ہو پایا۔ نہ جانے کیوں؟

مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ تھکن میرے انگ انگ میں دکھن بن کر پھیلی ہے۔ پر پھر بھی مجھے چلتے جانا ہے۔ چلتے ہی رہنا ہے۔ زندگی کے میلے میں باسی اور بن

باسی سب قدم بڑھائے چلنے پر مجبور ہیں اور میں قدم بڑھاتی سوچتی ہی رہتی ہوں، کبھی بھائی اور بھیا بھی میرے لیے اداس ہوتے ہوں گے ؟

سب سے زیادہ ڈر تو مجھے منی سے لگتا ہے۔ وہ پھر کل مجھ سے یہ سوال پوچھے گی اور پھر کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکے گا، نہ گرپال نہ میں اور نہ شاید بڑی ماں۔

کئی سوال ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے کٹھن اور ایسے مشکل جن کا جواب کوئی بھی نہ دے سکے۔

سردیوں کی لمبی راتوں میں دکھ الاؤ جلا کر، بیتے سپنوں کو بلاتا اور کہانیاں سنتا ہے۔ کہانیاں بھلا سچی ہو سکتی ہیں۔ من بڑا ہٹیلا ہے۔ اسے بیتے دن نہ جانے کیوں یاد آتے ہیں؟

سنگراؤں سے پرے بھی کوئی فکر ہے کیا؟

گاؤں کی اونچی نیچی گلیوں میں گوبر اور موت کی باس اناج کی باس کے ساتھ ملی زندگی کے دھارے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح دن ختم ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے ابھی کتنا راستہ باقی ہے ؟

آگ کا روپ

چنن ہماری لگتی لگاتی تو کچھ نہ تھی پر ماں کے میکے کے ناتے ہم اس کے باپو کو ماما کہتے تھے۔ ماں کے میکے سے کوئی بھی آتا تو ہمارے گھر ماں کی خیر سُکھ پوچھنے اور پیغام لینے کے لیے دو گھڑی ضرور رکتا۔ گرمیاں ہوتیں تو ماں گڑ کا شربت بنا کر پلاتی اور میری دادی سے پوچھ کر گھڑی دو گھڑی کے لیے نیم کی چھاؤں میں بچھی چارپائی پر بیٹھے مہمان سے ضرور بات کرتی وہ بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور جاتے ہوئے اچھا بی بی رب کے حوالے کہہ کر صافا جھاڑ کر کندھے پر ڈال کر ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی کو پیچھے لٹکا کر جب حویلی کے دروازے میں سے نکلتا تو ماں ٹھنڈا سانس بھر کر ہولے ہولے چلتی دادی کے پاس آکر بیٹھ جاتی اور کتنی ہی دیر اداس رہتی تھی۔ ہمارا گاؤں ویسے بھی میرے ننھیال کے گاؤں سے دور پر شہر کے نزدیک تھا اور پھر پڑتا بھی راہ میں تھا۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ کوئی نہ کوئی ماما ضرور ہی ہمارے آنگن میں آتا

رب سب کا بھلا کرے اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ چنن ہماری لگتی لگاتی تو کچھ نہ تھی۔ جب اس کا باپو ماں سے ملنے ہمارے آنگن میں آیا تو رو پڑا۔ اس کی بیوی

چنن اور کرتار کو چھوڑ کر تھوڑے دن ہوئے مر گئی تھی۔ ہوا ہو ایا تو اسے کوئی
خاص دکھ نہ تھا۔ پر ایک دوپہر وہ باہر گئی تو کماد کے کھیتوں کے درمیان بہتے
نالے پر سے پھلانگتے ہوئے اس نے ایشر سنار کی بہن کیسری کو دیکھا۔ کیسری
کو مرے ہوئے دس سال ہو گئے تھے اور ان دنوں تو چنن کی ماں کا بیاہ بھی نہ
ہوا تھا۔ کیسری ودھوا تھی جب مری ہے تو کہتے ہیں کہ ماں کے میکے میں ان
دنوں اس سے بڑھ کر چھب کسی عورت کی نہ تھی۔ میلے کپڑوں میں ہیرے کی
کنی کی طرح لگتی تھی۔ دوسرے گاؤں سے جوان اسے دیکھنے آیا کرتے تھے۔
مگر وہ تو بڑی ابھاگن تھی۔ سہاگنیں اس کے سایے سے بچتی ہیں اور ایشر سنار
اگر اسے کبھی گلی میں جھانکتے دیکھ لیتا تو اوکھلی میں پڑے دھان کی طرح کوٹتا۔
اس بیچارے کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنی بہن کا کیا کرے وہ اس سے زیادہ سے
زیادہ کام لیتا۔ گھر میں اس کی بھابی رانیوں کی طرح پلنگ پر چڑھی بیٹھی اس پر
حکم چلاتی اور سارا دھندا اس اکیلی کو کرنا پڑتا۔ سر میں سے جوئیں نکالنے کی
فرصت تک تو اسے ملتی نہ تھی۔ کپڑے میلے چیکٹ ہو جاتے پر اسے صاف
کپڑے پہننے کون دیتا تھا۔ ایک دن اچانک سنا کیسری مر گئی ہے نہ دکھ نہ کوئی
بیماری۔ اسے شمسان لے کر جو آدمی گئے انھوں نے آکر بتایا کہ چتا میں سے

بچے کے رونے کی آواز آتی تھی۔ رام رام پر ایسی بات کون مانتا ہے۔ پھر وقت بیت کر بہت کچھ بھلا دیتا ہے۔

کیسری کو دیکھ کر چنن کی ماں جو لوٹی ہے تو پھونک کر بخار چڑھا۔ حکیم جی کی دوا دارو سے تو وہ اترنے والا نہیں تھا۔ جن اتارنے والوں کے آتے آتے آٹھویں پہر اس نے دم دے دیا۔ دور نزدیک چنن کا اور کوئی نہ تھا۔ کرتار ابھی چھوٹا یہی کوئی چنن سے ایک سال چھوٹا۔ آٹھ سال کا تو ہوگا ہی۔ میری دادی ویسے تو بڑی کراری عورت ہے۔ نہ کسی کی سننے نہ کسی سے دبنے والی۔ اس نے کبھی کسی کی منت بھی نہیں مانی۔ پر چنن کے باپو کو روتا دیکھ کر وہ بھی پاس آ بیٹھی۔ پھر کہنے لگی۔ "ویرا تو پریشان نہ ہو، رب کا دیا میرے گھر سب کچھ ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں۔ تیرے بچے میرے پوتے پوتیوں کے ساتھ اپنا نصیب ہی کھائیں گے۔ ان کی ماں مر گئی تو تیرے کا مقدر کا لکھا ہے۔ جب تک تو دوسرا گھر کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ بیشک تو اپنے بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ جا۔ تب تک یہ ذرا سیانے بھی ہو جائیں گے۔" اور یوں چنن اور کرتار ہمارے گھر میں آ گئے۔

کرتار بڑا تیز اور ہوشیار تھا۔ بہن سے بڑا ہی الگ طرح کا اور چھپ والا۔ چنن بجھی بجھی سی اور دھیرج والی۔ جیسے بجھتے الاؤ میں بجھنے والی چنگاری سی ہو۔ دبی دبی اور سہمی سہمی سی جیسی اکثر لڑکیاں جن کی مائیں بچپن میں مر جائیں، ہوتی

ہیں۔ کرتار اس سے ایسا سلوک کرتا جیسے وہ اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس کی شکل پر ایسی ویرانی تھی جسے دیکھ کر رونا آ جائے۔ میری ماں کو وہ بوا کہتی اور کوٹھڑیوں، دالانوں میں اس کے پیچھے پھرتی رہتی۔ دادی اگر اسے پیار سے بھی بلاتی تو وہ رونے لگتی۔ اسے گڑیاں کھیلنے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ پرانے کپڑوں کے ٹکڑے اور رنگین کترنیں ڈھیروں جمع کرتی رہتی اور پھر جب گرمی کی دندناتی دوپہر میں چیلیں تک ٹھنڈک لگانے لگ جاتیں وہ ہمارے پکے کوٹھے کی ذرا سی منڈیر کے سایے میں اکیلی بیٹھی رہتی دیکھتی اور الگ الگ رنگوں کی ڈھیریاں لگاتی رہتی۔ گلی محلے کی عورتیں جب نیم تلے چرخے کاتنے بیٹھتیں تو اسے دیکھ کر کہتیں۔ "رب کرے کسی لڑکی ماں نہ مرے۔"

وہ بولتی بہت کم تھی۔ پہلے پہل تو دادی اسے کام نہ بتاتی یہی سوچ کر کہ ابھی دکھ نیا ہے اور لڑکی ہونے کے ناتے چنن کو اپنی ماں سے بہت پیار ہو گا۔ پھر جب وقت ہولے ہولے آگے کھسکنے لگا تو چوٹ پرانی ہونے لگی ہو۔ دادی کبھی کبھار آپ ہی آپ سے دانت پیس کر کہتی۔ "اچھی مصیبت ہے لڑکی کیا ہے سیاپا ہے۔ جوان ہے نو دس سال کی لڑکیاں تو گھر سنبھال لیتی ہیں۔ یہ ابھی کونوں میں بیٹھی رہتی ہے۔" پھر میری ماں سے کہتی۔ "کڑیے ایک تو ہے اسے سارا دن اپنے پیچھے پیچھے پھراتی رہتی۔ بھلا کوئی کام بتائے تو یہ تیرے

ساتھ سے اترے۔“یوں چنن پر کبھی کبھی ماں اور دادی کا تھوڑا تھوڑا جھگڑا ہو جاتا۔

رات کو جب ساری حویلیوں کے لڑکے لڑکیاں باہر جا کر آنکھ مچولی یا دھوپ چھاؤں کھیلتے تو وہ اپنی ویران اور خالی شکل لیے عورتوں کے جمگھٹ میں ماں کے ساتھ ہی کھڑی ہتی۔ کبھی کبھار کوئی ہمسائی بات کرتے کرتے کہتی۔ ”بھئی تیج کور تو نے تو اس لڑکی کو اپنا سایہ بنا لیا ہے۔ اس کو کہہ جا کر بچوں کے ساتھ کھیلے۔ اس کے سنگ کی لڑکیاں ہیں ان میں ملے ہنسے بولے۔“

اور ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی۔ ”نہیں بہن یہ تو بس کملی ہے ماں کا بہت دکھ کرتی ہے۔ ہماری باتیں کیا سمجھے گی تم قصہ پورا کرو۔“ اور یوں چنن ابھی چھوٹی ہی تھی جب عورتوں کی باتیں سنتی اور ان میں اٹھتی بیٹھتی۔

گڑھی میں سکول چار جماعتوں تک کا ہی تھا اور ہمیں آٹھ کوس چل کر شہر کے مدرسے میں جانا پڑتا۔ گرمیاں ہوتیں تو تاروں کی چھاؤں میں روٹیاں باندھ کر بستہ سر پر رکھ کر چل پڑتے۔ دوپہر گزارنے کے لیے باپو نے اپنے ایک جان پہچان والے کھوہ پر ٹھکانہ بنا دیا تھا۔ دن ڈھلے چلتے تو تارے نکلے گھر پہنچتے۔ روٹی کھا کر باہر چلے جاتے۔ سردیاں ہوتیں تو بھی دن کے چڑھنے کے ساتھ ماں پراٹھے پکا کر رومالوں میں باندھ دیتی اور سورج کی پہلی کرنیں ہمیں نتھا سنگھ

کے باغ سے پرے ملتیں۔ سبز سبز پٹڑی پر گرم ہونے کے لیے ہم دوڑ لگاتے اور پھر تھک جاتے اور ہولے ہولے چلنے لگتے۔ شام کو جب گھر پہنچتے تو صرف ماں جاگتی ہوتی۔ کبھی وہ سر پر ہاتھ پھیر کر، سینے سے لگا کر پیار کر لیتی اور کبھی جلدی کے اور دھندوں میں وہ ہمیں روٹی دے کر روتی منی کو سلانے کے لیے اس کے ساتھ لیٹ جاتی۔

اور اس طرح میں آٹھویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا جب میں نے دوبارہ چنن کو دیکھا ہے۔ اتنے سالوں میں چنن کا باپو بھی مر گیا تھا۔ اور وہ دونوں بہن بھائی سوائے کبھی کبھار اپنے ایک برادری کے چاچے کو ملنے جانے کے ہمارے پاس ہی رہے تھے۔ کرتار تو میرے جتنا ہی لمبا تھا۔ بلکہ مجھ سے دو انگل نکلتا ہوا ہی ہو گا۔ گبھرو جوان جس نے میرے باپو کا سارا بوجھ اپنے پر اٹھا لیا تھا۔ بیل بیمار ہوتے تو کرتار ہی ان کی دوا کرتا۔ میری چھوٹی بہنیں ماندی ہوں تو حکیم کے پاس وہی انھیں لے جاتا۔ دادی کہتی۔ ”کام ہر کسی کا پیارا ہوتا ہے۔ میرے اکیلے پوت کے ساتھ جس طرح کرتار بازو بن کر رہا ہے وہ مجھے تو وہی اچھا لگتا ہے۔“

خیر تو جب میں نے چنن کو دوبارہ دیکھا ہے تو وہ کوئی بھرپور جوان تو تب بھی نہ تھی۔ پر تیزی سے دالانوں سے کوٹھڑیوں میں جاتی اور کوٹھڑی سے آنگن میں

لگی پھرتی مجھے وہ اچھی لگتی۔ پہلے کی طرح اب اس کی ناک سڑ سڑ بہتی نہ تھی اس کے موٹے ہونٹوں کے کنارے بھرے ہوئے چہرے میں کچھ چھپ گئے تھے اور گہری سرخ چنری موٹے کھدر کی ہونے پر بھی بھلی لگتی تھی۔ اس کا رنگ سانولے سے کچھ اور نکھر کر گندمی کے قریب قریب ہو گیا تھا۔ اس نے اب ہنسنا سیکھ لیا تھا اور اس کی شکل کی ویرانی کبھی کبھی کی مسکراہٹ میں بڑی اداس لگتی۔ جیسے آندھی اور مٹی میں چھپے دن پر غبار کے اوپر سے اچانک دھوپ کا دھارا سا بہنے لگا۔

اس کے انداز میں وہ رکھ رکھاؤ نہیں تھا جو اس کی عمر کی عام لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ پر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ میرے لیے وہ کوئی بیگانی تو نہ تھی۔ ہم سب نے بہت سال اس گھر میں اکٹھے گزارے تھے۔ اپنے گاؤں میں ہی اگر کسی لڑکی سے بات کرو تو وہ سمٹ جائے گی تھوڑا شرم سے جھک کر اپنی چنری کو دانتوں میں پکڑنے لگے گی یا پھر بھاگ جائے گی۔ چنن کے لیے مانو تو میں تو تھا ہی نہیں۔ اسے کیا پتہ تھا میں نے اب آٹھویں جماعت کا امتحان دے دیا ہے اور ناول بھی پڑھنے لگا تھا۔ ڈوبی رات تک جب میں سرہانے سرسوں کے تیل کا دیا جلا کر کتاب پڑھتا رہتا تو ماں اچانک کروٹ بدل کر آنکھیں کھول لیتی اور

میری طرف دیکھ کہتی۔" بھاؤ کتنی رات چلی گئی ہے۔ اب بس کر کیوں اتنا سر کھپاتا ہے۔"

دادی کہتی۔"کاکا تو تو کہتا تھا اب چھٹیاں بھلا اب کیوں پڑھتا ہے۔" اور میں ان دونوں کی بات کا جواب دیے بنا یوں مسکراتا جیسے اس اُتم ودیا کا ان دونوں جاہل عورتوں کو کیا پتہ ہے۔ اگر چنن کبھی کبھار مجھ سے بات کر لیا کرتی تو شاید جو ہوا ہے وہ کبھی نہ ہوتا۔ مگر اسے تو سرے سے میرے ہونے ہی سے انکار تھا جیسے میں اسے دکھائی نہیں دے رہا ہوں جیسے اس گھر میں کہیں تھا ہی نہیں۔ کرتار تھک کر گھر آتا تو وہ اس کے آگے پیچھے پھرتی، بھاؤ کہتے کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔ اس کے لیے روٹی لیے جاتی ہے۔ دوڑ دوڑ کر اس کے کام کر رہی ہے۔ اسے پنکھا جھل رہی ہے۔ پہلے پہل میں نے سوچا آخر میں اس کا ماں جایا نہیں ہوں نا اس لیے مجھ سے یہ فرق ہے۔ پر جب جوگندر آتا تب بھی وہ ایسے ہی اس کے وارے جاتی۔ اسے پانی پلاتی پھر رہی ہے۔ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ جوگندر چوتھی جماعت سے ہی اٹھ بیٹھا اس کا دل کتابوں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیتوں میں ہل چلاتا اور کافی وقت نہر میں چھلانگیں لگاتا رہتا اونچے سے اونچے پل پر سے پانی میں کود جاتا اور ایسی جگہوں سے جہاں مجھے دیکھ کر بھی ہول آئے وہ تیر کر پار کر جاتا۔ کشتی لڑنے میں دور دور تک اس کا

کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جانوروں کی بیماریوں کا چھوٹا موٹا حکیم تھا۔ تھوڑی شد بد جو اسے ہو گئی تھی تو اس نے علاجوں کی ایک کتاب منگوائی تھی۔ گاؤں میں کسی کا بیل بیمار ہو، کسی کی گائے کو تکلیف ہو لوگ بھاگے بھاگے جو گندر کے پاس آتے اور میں اونچے تخت پر دیوتا کی طرح بیٹھا مسکراتا رہتا اور دالان میں بچھے پلنگ پر لیٹا ناول پڑھتا رہتا۔ عورتیں بہت پڑھا ہوا ہونے کی وجہ سے مجھ سے بات کرتے ہوئے ذرا جھجکتی تھیں۔

نتیجہ نکلا تو پاس ہو گیا اور پھر نویں جماعت میں میں ہوسٹل میں ہی رہنے لگا۔ چھٹیوں میں میں گھر آیا تو تھوڑے سے طور طریقے شہر والوں کے سیکھ گیا تھا۔ روز چلنے میں جو وقت لگتا تھا وہ میں نے پڑھنے سے بچا کر شہر گھومنے میں گزارنا شروع کر دیا۔ ان دنوں میں تاک جھانک سیکھی لڑکیوں کی باتیں سنیں اور بائیسکوپ کے لیے باپو سے بہانے بہانے پیسے لینے کے طریقے بھی آزمائے۔ چنن کو دیکھ کر لگا جیسے میں کسی بائیسکوپ میں کام کرنے والی چنچل ناری کو دیکھ رہا ہوں۔ تم سب لوگ جو یہ قصہ سن رہے ہو کہو گے کہ میں ان دنوں اس اجاڑ صورت والی چنن پر مر رہا تھا پر میں اتنے سالوں کے بعد آج بھی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے وہ کبھی ایسی نہیں لگی کہ میں اس پر مرتا۔ شام ہو رہی تھی۔ سردیوں کی خاموش، چپ چاپ سی اداس شام جب دھواں نیلی دھاریوں میں

پھیلتاہوا آکاش کی طرف جاتاہوا ذرا بھی خوشی نہیں دیتا۔ کرتار اور جوگندر ماں کے پاس چوکے میں بیٹھے تھے۔ چنن دودھ کی چاٹیاں ماں کے پاس رکھ رہی تھی۔ منی جو اب ذرابڑی ہو گئی تھی بار بار چنن کی چنری پکڑ کر کھینچتی اور کہتی۔ ''بہن مجھے گڈی کے لیے کرتا کاٹ دے۔'' میں آنگن میں اندھیرے میں کھڑا رہا اور تصویر کی طرح وہ گھڑی میرے دل کے اندر کہیں اتر گئی۔ وہ سارے خوش تھے۔ خوش اور مگن۔ کوٹھے کے اندر گائیاں اور بھینسیں کھڑی تھیں اور ناند میں منہ مار رہی تھیں۔ زور زور سے سانس لے کر وہ کبھی کبھی ایک دوسری کے سر سے سر ٹکراتیں تو گھنگرو بج اٹھتے اور پھر تیزی سے چارے پر منہ مارنے کی آواز آتی۔ اپلوں کی آگ اس شام کو کتنی خوش رنگ لگتی تھی اور کبھی کبھی اوپر پر سے چمکتے برتنوں میں پینگ کے ساتوں رنگ شعلوں کے ساتھ بھڑک اٹھتے۔ پھر نیم پر بیٹھی سردی میں ٹھٹھری کوئی چڑیا زور سے چوں چوں کرنے لگی۔ پتوں میں کھڑپڑ ہوئی اور پر پھڑ پھڑا میرے سر پر سے چکر کاٹتا ہوا دوبارہ شاخوں میں جا چھپا اور میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ الو کا گھر میں ہونا تو اچھا نہیں ہوتا۔ پھر میں نے سوچا میں پڑھا لکھا آدمی ہوں یہ جاہل عورتوں کے وہم ہیں۔ میں ان میں کیوں پڑوں۔ دوسرے دالان میں سے دادی نے کہا۔ ''کڑیے چنن ذرا گڑ تو دے جا۔'' چنن کے پیچھے کودتی ہوئی

منی بھی چلی گئی۔ کرتار اپنی بہن کو دیکھتا رہا اس اس کے جانے کے بعد کہنے لگا۔
"بوا چنن تو اب جوان ہو گئی ہے۔"
اور ماں نے کہا۔ "ویر تو کیوں فکر کرتا ہے۔ واہ گرو آپ ہی کوئی سبب بنا دے گا۔ مجھے تو خود اس کی فکر ہے۔ مجھے تو جس طرح منی ہے اسی طرح چنن ہے۔"
کرتار چوکے میں سے اٹھ کر باہر کی طرف آیا تو میں بھی آنگن میں کھنکارا جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہوں۔ جیسے خاموش اور ٹھہرے ہوئے پانی میں میں نے پتھر مارا ہو۔ جوگندر میرے گلے سے لگ گیا۔ کرتار بھی مجھے پیار سے ملا۔ منی کودتی ہوئی آ کر میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ماں نے مجھے کلیجے سے لگایا میرا سر منہ چوما۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ دادی نے کہا۔ "بھاؤ ذرا جلدی آ جاتے اتنی رات گئے آنے میں کیا مزہ آیا اوپر سے سردی ہے اور ہوا بنا رکے چل رہی ہے۔" پھر وہ سارے میرے گرد بیٹھ گئے اور مجھ سے شہر کی باتیں سننے لگے۔
چنن ادھر ادھر کاموں میں لگی تھی۔ بے پرواہ سی، جیسے میرا آنا اور نہ آنا اس کے لیے کوئی فرق نہ ڈالتا ہو۔ باپو اسی دن کسی کام سے ابھور گیا تھا۔ کرتار بیلوں کی کھوہ پر سونے کے لیے چلا گیا۔ جوگندر اور وہ دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے آنگن کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ پھر میں نے گلی کے نکڑ پر ان کے گانے کی آواز سنی جو خاموش گلیوں میں گونج رہی

تھی۔ گلی میں سے کوئی سادھو، بھگوان کے نام پر، رام کے نام پر مانگتا پھرتا تھا اور پھر ہر طرف ایسی چپ ہوئی جیسے پتہ نہیں کیا ہونے والا ہو۔ دادی نے مٹی کے تیل کا ذرا سا ٹمٹماتا دیا جلایا جو لمبے دالان کے ایک طاق میں جلتا رہا۔ ماں اور منی ایک کوٹھڑی میں سو گئیں۔ دادی سب سے پچھلی کوٹھڑی میں جس میں اناج اور مٹکے رکھے تھی چلی گئی اسے بہت سردی لگتی تھی۔ میں نے کہا۔ "مجھے زیادہ سردی نہیں لگتی۔ میں دالان میں ہی سوؤں گا۔"

پھر گرج کے ساتھ بادل سے اولے برسے اور تڑ تڑ دالان کے دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ ماں کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر بولی۔ "بھاؤ تجھے سردی لگتی ہو گی اندر آجا میرے پاس۔" میں نے کہا۔ "نہیں ماں تو ذرا فکر نہ کر میں بالکل ٹھیک ہوں تو بے فکر ہو کر سو۔"

ہوا گونج کے ساتھ چلتی تھی اور نیم کی شائیں شائیں دالان کے باہر اپنا سر مارنے لگی۔ مجھے لگا جیسے الو چیخ رہے ہوں اور شمشان سے مرنے والوں کی آتمائیں اندر آنے کا کہہ رہی ہوں۔ خالی گلیوں میں بھیگے ہوئے پتے ایک ہول دلانے والی آواز کے ساتھ اڑتے اور شور کرتے۔ میں ڈرنے لگا مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں کیوں نہ ماں کے کہنے پر اندر چلا گیا۔

سدا اسے تو یہ طریقہ تھا کہ چنن دادی کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں سوتی تھی اسے کوئی پرائی لڑکی بھی تو نہیں سمجھتا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ ہمارے ساتھ تھی، پھر دادی اپنی سختی کے باوجود اسے پیار کرتی تھی۔ ”بے ماں کی لڑکی تھی۔“

ہمارا گھر یوں تھا ایک لمبائی کے سرے پر سے دوسری لمبائی شروع ہوتی ہے۔ ایک طرف دالان ہے اور کوٹھڑیاں ہیں اور آخری کوٹھڑی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف پھر کوٹھڑیاں ہیں اور دالان ہیں۔ دونوں دالانوں میں ایک دروازہ ہے جو کھلا رہتا ہے۔ اناج کی کوٹھڑی جس میں دادی سوتی تھی اس کے بالکل دوسری طرف آخر میں ایک بڑی کوٹھڑی تھی جس میں صندوق اور بنے ہوئے کھدر کے ڈھیر ہیں۔ بڑے صندوقوں کے اوپر کی طرف چھوٹے اور پھر اس سے چھوٹے ایک چوٹی سی بنتی جاتی ہے۔ بڑی چیزوں کے اوپر چھوٹی چیزیں رکھنے کا شوق عورتوں کو کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

مجھے سردی کچھ زیادہ لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں میں نے دوسرے دالان کا دروازہ ٹٹولا اور دوسری طرف نکل گیا۔ دوسری طرف سوائے صندوقوں کے باقی کوٹھڑیاں الم غلم چیزوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں کسی میں نواڑی پلنگ ہیں۔ کسی میں کوئی شے گھر کے سو بکھیڑے ہزاروں دھندے ہیں۔ ان دنوں

مجھے کیا خبر تھی جب میں نے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا جس میں دیا مدھم جل رہا تھا تو اندر میں نے چنن کو بے سدھ سوئے ہوئے دیکھا۔ باہر کے مقابلے میں اندر گرمی تھی اور ہوا کا شور بھی کم تھا اور نیم میں سے الو کی چیخیں کم سنائی دیتی تھیں۔ اس کے گرد رنگ برنگ کی کترنیں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک ادھ سلا گڑیا کا کرتا بھی پڑا تھا۔

میں نے اپنا سانس روک کر آہستہ سے کہا۔ ”چنن۔“

اس کا سانولا رنگ جو اب نکھر کر چمک آیا تھا اور گندمی ہو چلا تھا جیسے سونا ہو، دیے کی لو گھٹتی بڑھتی تو میں شعلے کی طرح کانپتا لگتا تھا اور تب میں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کی ناک جو کسی زمانے میں سڑ سڑ بہا کرتی تھی اونچی اور بڑی اچھی لگی۔ نتھنے سانس کے ساتھ ساتھ پھولتے تھے۔ جوان عورت بڑا مدھر سپنا ہے۔

اس کے بال بہت کالے تھے اور ماتھا کھلا تھا۔ جیسے ہمارے یہاں اچھے نصیب والوں کا ہوتا ہے۔ مجھے لگا وہ سوئی ہوئی نہیں۔ یونہی مجھے دیکھ کر سوتی بن گئی ہے اور اس کی آنکھیں۔ میں بند آنکھوں کی بات کہہ رہا ہوں۔ کھلی آنکھوں کی نہیں۔ تم نے کھلی آنکھوں والا جاگتا ہوا سپنے جیسا روپ دیکھا ہو گا اور پھر میں نے تمھیں پہلے ہی بتایا ہے چنن ذرا بھی تو اچھی نہیں تھی۔ اگر تم اسے گھر

میں چلتے پھرتے دیکھ لیتے تو کبھی بھی اس کی طرف نہ دیکھتے۔ پر میری بات تو دوسری ہے۔

کوٹھڑی کے دروازے کو میں نے ہولے ہولے بند کرنا چاہا تو کواڑ چوں چوں کرنے لگے۔ میرا سانس یوں چل رہا تھا جیسے تیز آگ کے شعلے میں نے پھانک لیے تھے۔ پسینہ میرے سر کے بالوں میں مجھے گرم بوندوں کی طرح لگا اور سامنے اپنے سینے سے رضائی ہٹائے ادھ سلا کرتا سرہانے رکھے چنن ہی تو سو رہی تھی چنن جسے میں بہت دنوں سے جانتا تھا۔ جو ماں کے پیچھے پیچھے دالانوں اور کوٹھڑیوں میں پھرتی تھی۔ میں نے پھونک مار کر دیا بجھا دیا اور چنن کے کھلے ماتھے کا نصیب بھی بجھ گیا۔ میرے ذہن میں ناولوں کے فقرے، بائیسکوپ کی تصویریں اور لڑکیوں کی باتیں ابلنے لگیں۔ جیسے بہت سی چیزیں گڑبڑا جائیں جیسے زمین کے نیچے گائے نے ایک سینگ کا بوجھ دوسرے سینگ پر بدل لیا ہو جیسے دیے کا تیل ہولے ہولے کم ہوتا ہے اور لو مدھم ہوتی ہے ویسے میں نے اپنے سامنے چنن کو مدھم ہوتے اور پھر گھٹتے اور پگھلتے دیکھا ہے۔ اس کا بجھنا میں نے نہیں دیکھا۔

چنن کو اس کے بعد میں نے مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔ وہ کام کرتے ہوئے جیسے سپنے میں چل رہی ہو۔ مجھے ہوا پر تیرتی ہوئی لگتی۔ روز بروز اس کا وجود

جیسے کم ہو رہا ہو۔ دادی کہتی۔ ”چنن تجھے ایک دم سے کیا ہو گیا ہے۔ تجھ اکیلی پر نوجوانی نہیں آئی۔ پتہ نہیں کیا سایہ ہے کہ ہر شے کو گرا دیتی ہے۔“ پھر وہ ماں سے کہتی۔ ”کڑیے میں کہتی ہوں اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی سوچ۔ وا ہ گرو کرے اپنے گھر جائے۔“ اور میں باہر گھومتا پھرتا رات کے سپنے دیکھتے دیکھتے یہ بھی سوچتا اب چنن کا کیا ہو گا۔ اب میرا کیا ہو گا؟ مگر سب سے حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو یوں میرے سپرد کر دیا تھا۔ کیوں آخر کیوں؟

چنن اکثر دادی کے ساتھ سوتی تھا نا۔ مگر پتہ نہیں اس میں یہ ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ چھٹیوں بھر میں کئی دفعہ مجھے ملنے آئی۔

جب میں اس سے پوچھتا۔ ”چنن بتاؤ میں تمھیں اچھا بھی لگتا ہوں کہ نہیں۔“ تو وہ کبھی جواب نہ دیتی۔

اور یوں ہے کہ اس نے ان دنوں بہت کم باتیں کی ہیں۔ ان دنوں میں نے پہلی اور آخری بار یہ جانا کہ عورت کا ایک روپ آگ بھی ہے۔ وہ گرم لاوے کی طرح میرے چاروں طرف بہہ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد چنن نہیں رہی تھی۔ اس کا وجود۔ مگر میں تو یہ کتابوں اور پڑھی ہوئی سیکھی ہوئی

باتوں کی مدد سے چنن کو ایک سوال کی طرح حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بھلا ایسی کوششوں میں کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے۔

اس کی شکل پر پھیلتی زردی جب بڑھتی گئی تو کرتار کہنے لگا۔ ''بوا کچھ دن اسے چاچے کے یہاں نہ بھیج دیں۔'' جس دن تیاری تھی کرتار کو کسی کام سے ابھور جانا پڑ گیا۔ چنن کو پہنچانے جو گندر گیا۔

میں نے سوچا تھا اس کے جانے کے بعد میں پریشان ہو جاؤں گا جیسے ناولوں میں ہوتا ہے مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔ منی اور میں سارا دن گائے کے نئے بچھڑے میں لگے رہے۔ شام کو وہ زور زور سے روتی اور چنن کو یاد کرتی رہی۔ دادی نے کئی بار کہا۔ ''ہائے کتنی اداس ہے۔'' اور ماں چوکے میں بیٹھی برتن مانجھتی کہنے لگی۔ ''پتا نہیں چنن کو بیاہ کر میرا کیا بنے گا۔''

پتا نہیں دونوں کس کام میں لگے تھے کہ کرتار اور جوگندر کو نہیں، باپو نے چنن کو لینے مجھے بھیجا۔

میں راستے بھر میں کیا کیا کہانیاں بنتا گیا۔ چنن اگر سب کے سامنے نہیں تو دل میں مجھے دیکھ کر ضرور خوش ہو گی اور پتہ نہیں کیا کچھ۔ سوچ کی بھی عجیب منطق۔

چنن کے چہرے پر زردی اور زیادہ تھی۔ اس نے پیلے رنگ کا شنگھائی کا اپنی چاچی کا دیا ہوا سوٹ پہنا تو اس کی شکل پر سونا سا پھیل گیا۔ مگر وہ پرانی ویرانی اس کی آنکھوں میں پھر لوٹ آئی تھی۔ جب ہم گھوڑیوں پر چڑھے ہیں تو چاچی نے کہا۔ ''اچھا کاکی جیتے جی کے میلے ہیں۔ تو آئی تھی تو چار دن ٹکتی۔ وہ گھر اور یہ گھر دو تو ہیں نہیں واہ گرو کرے تیرا نصیب چنگا ہو۔ رب کسی نیک کے ماتھے لگائے۔'' چاچے نے کہا۔ ''بھاؤ ہم تو اس گھر میں اور اس گھر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ورنہ تم جانو اولاد کسی کو بھی دوسری میں ہوتی۔ پر ہم سوچتے ہیں جب کرم سنگھ بچوں کا ہاتھ تمھاری ماں کے ہاتھ میں جیتے جی دے گیا تو ہم کون ہیں دخل دینے والے۔''

میں جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور چنن نے زور سے گھوڑی کی لگام کھینچی۔ گھوڑی نے ایک چکر لگایا اور پھر گاؤں کے باہر راہ پر سرپٹ دوڑ گئی۔ میں نے بھی ''اچھا چاچا جی پیروں پونا'' کہہ کر اس کے پیچھے اپنی گھوڑی دوڑا دی۔ نہر کی پٹڑی پر میں نے اسے جا لیا ''تم نے یہ کیا کیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اور وہ اتنے زور سے ہنسی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ اسے اتنے سالوں میں میں نے کبھی اس زور سے ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ پھر میں نے جی ہی جی میں سوچا یہ خوش ہو رہی ہو گی۔

میں نے کہا۔ ”چنن آج میں کتنا خوش ہوں۔ کیا تم خوش نہیں ہو“ اور پھر مجھ کو ناول کے فقروں کا، بائیسکوپ اور سنی ہوئی باتوں کا ایک دھارا سا آیا۔ میں ہولے ہولے وہ باتیں دہرانے لگا۔ ایسی باتیں جو شاید وہ سمجھتی تھی اور نہ ہی اچھی طرح سن رہی تھی۔

میں نے پھر پوچھا۔ ”چنن کیا تم خوش ہو کہ کرتار اور جوگندر کی جگہ تمھیں میں لینے آیا ہوں۔ “ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا، صرف بڑی گہری نظروں سے جو نہ ویران تھیں اور نہ خالی۔ جن میں نہ محبت تھی اور نہ ہی نفرت بلکہ ایک عجیب شے تھی۔ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔ وہ کیا شے تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کالی موت کی دیوی کی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں۔ اس نے مجھے دیکھا۔

میں ڈر کر چپ نہیں رہتا۔ اصول ہے اگر ڈر کر چپ رہو تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اندھیرے میں اپنی آواز بھی دوسرے ساتھی کی طرح سہارا بنتی ہے اور یوں اس سے ڈر کر میں نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا مگر میں بولنے لگا۔ میں نے

سنے ہوئے گیتوں کے بول اونچی آواز سے دہرانے شروع کیے۔ بول پتھر کی طرح میرے گلے میں لگتے مگر میں ان پتھروں کو نگلتا رہا۔

دوپہر کا سورج بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ ابھی ہمارا آدھا راہ باقی تھا۔ درختوں کے سائے ہم پر سے اور ہم سایوں میں سے گزرتے گئے۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا چنن سے میں عشق کر رہا تھا۔'' میں نے شہر میں سنا تھا کہ لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں اگر ان سے محبت کے بول کہو تو مگر جس ناول میں میں سفر کر رہا تھا اس میں لڑکی جاہل تھی اور محبت کرنے کے طریقے سے بے خبر۔

میں نے کہا۔ ''چنن اگر تم کتابیں پڑھ لو تو کتنی ہی باتیں تمھیں پتہ چل جائیں۔'' مگر چنن نے میری بات کا جواب گھوڑی سے اتر کر دیا۔ درختوں پر کا سبزہ جلا ہوا تھا جیسے ہریالی کو کسی نے آگ میں ڈبو کر نکالا ہو۔ سائے میں بھی آگ سی تھی۔ بادلوں میں بھی گرمی تھی۔ ہر شے تپ رہی تھی۔ ابھی تین چار کوس راہ باقی تھا۔ نہر کے کنارے اونچے نیچے راہ پر کبھی گھوڑیوں کے پاؤں ڈول جاتے اور ہم گرتے گرتے بچتے۔

میں نے گھوڑیاں اس کوٹھے کے پچھواڑے باندھ دیں جو راہ سے ذرا دور ہٹ کر بنا ہوا تھا اور پتہ نہیں کیوں اب اس میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ میں دماغ پر زور

دیتاہوں پر کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اور چنن نے شب کیا باتیں کی تھیں۔ مگر اتنا یاد ہے چنن باتیں کرتے کرتے چیخ پڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس کے آنسوؤں کا رنگ ان کترنوں جیسا ہے جن کو وہ جانے کیوں اکٹھا کرتی رہتی تھی۔ شاید اسے مجھ سے محبت تھی۔ شاید ان آنسوؤں میں خون تھا۔ پھر ایک دم وہ اٹھی اور کہنے لگی۔ "مجھے گرمی لگتی ہے میں نہالوں" اور اس سے پہلے کہ میں اٹھتا وہ بھاگ کر کھیتوں کی منڈیریں پھلانگتی ہوئی نہر کے کنارے تھی۔ میں نے کہا۔ "چنن میں آتا ہوں۔ صبر کرو۔" اس نے کپڑے اتارتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور نہر میں کود گئی۔

کئی دنوں بعد جہاں نہریں ملتی ہیں ایک ڈھانچہ ملا۔ مگر اس پر کپڑے تھے۔ پھر ہم سب نے کرتار کو سمجھایا۔ "واہ گرو جس کا جیسا نصیب بنائے۔

پر اور بہت سی باتوں کی طرح مجھے پتہ نہیں چلتا۔ چنن کا مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہر انسان دوسرے کے لیے ایک اندھیرا ہے۔

کیا ہو اگر وہ باتیں مجھے یاد آجائیں وہ آخری باتیں جو راہ سے دور ہٹتے ہوئے اس کوٹھے میں میں نے اور چنن نے کی تھیں۔ مگر ان دنوں کی طرح آج بھی دماغ میں یادیں اور آوازیں رنگ اور کترنیں لہریوں کی طرح ایک دوسرے میں

ملے ہوئے ہیں۔ اس الجھے ہوئے تانے بانے میں سے میں ایک تاگا کیسے نکالوں ——— ”سادھو من کامان تیاگو۔“

سونے کا ذرہ

بارش کی بڑی بڑی بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر آکر لگتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی باہر کھڑا سہمے سہمے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے بلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں چونک پڑتا ہوں اور گزری گھڑیوں کے پرانے مدتوں پہلے بند ہوئے دروازے چپکے چپکے کھلتے ہیں۔ کیوں بلقیس کیا تم اب تک یہاں کھڑی ہو؟
یہ سائے سے میرے آنکھوں کے سامنے کیوں گزر رہے ہیں۔ رات خاموش ہے اور منا ابھی سویا ہے۔ پتہ نہیں صبح کب ہو گی۔ وقت یوں کیوں بیتتا ہے جیسے گھسٹ رہا ہو۔ بھکاری کی طرح دامن پھیلائے سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ مجھ سے کیا مانگتا ہے۔ میں تو پہلے ہی تہی دامن ہوں میرے دل میں ایک یاد نہیں یاد کا سایہ نہیں۔ تپتی دھوپ ہے تپش ہے اور ٹھہرنے کو ایک مقام نہیں جس کسی نے میرے دل کے اندر رکنا چاہا ہے میں نے اسے باہر دھکیل دیا ہے۔ بلقیس بانو جو شے میرے پاس نہیں، میں تمھیں کہاں سے دوں۔ میں مجبور ہوں بلقیس بانو۔ تم ماضی کے ایوانوں میں

اکیلی کب تک گھومتی رہو گی۔ اس بند دروازے سے لگ کر کب تک کھڑی رہو گی۔ مگر کھڑکی کے شیشوں پر بارش کی بوندیں آن کر لگتی ہی جاتی ہیں۔ کون مسلسل وقفوں کے بعد رک رک کر یہ کواڑ دھڑ دھڑا رہا ہے۔ میرے دل کے بند دروازے کے باہر یہ کون ہے؟

پھر صبح ہو گی تو منا جاگے گا اور سب سے پہلے بھاگ کر میری طرف آئے گا۔ اپنی نیند کے بعد شفاف آنکھوں کو میری طرف اٹھا کر کہے گا۔ ”چچا جان کہانی سنائیں وہی جس میں ایک پری ہوتی ہے اور لڑکے کے ساتھ پانی کے نیچے چلی جاتی ہے۔“

”مجھے تو کوئی کہانی نہیں آتی منے جس میں لڑکا پانی کے نیچے چلا جائے۔“

”آتی ہے، آتی ہے۔“ وہ اپنے پھول کی پنکھڑی کے سے ہاتھ سے میرے زمانے کے بوجھ تلے جھکے کندھے کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہے گا، ”سنائیں۔“

”نہیں منے روز تو تم مجھ سے کہانی سنتے ہو، آج تم سناؤ۔“ میں اسے اپنے سرد دل کے ساتھ لگا کر کہوں گا۔ ”ہمیں تو آتی بھی نہیں کوئی کہانی، بس ایک آتی ہے۔“ وہ جھک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہے گا۔ جو منے سے سارا وقت پیار کی بھیک مانگتی ہیں۔ جب سارے سہارے چھوٹ گئے ہیں تو میں نے

منے کا ہاتھ پکڑا ہے منے کے دل میں کوئی سایہ نہیں۔ وہ مجھے ٹھکراتا نہیں اور چند برس بعد اوروں کی طرح میرے دل کی راہ گزر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے خوشی، زندگی اور پرائی کہانیوں کی طرف لوٹ نہیں جائے گا۔ میں جو ابھی چالیس کی حدوں کو بھی نہیں چھو پایا، میں ایک راہ گزر کیوں بن گیا ہوں۔

منے کو ایک ہی کہانی آتی ہے۔ "ایک بطخ کا بچہ ہوتا ہے اس کی ماں کہیں چلی جاتی ہے۔ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ مر جاتا ہے۔" اکیلے رہ جانے سے مر جانے تک کا راستہ کتنا مختصر ہے! منے کے نزدیک یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں۔ پر بلقیس بانو پرانے مدتوں کے بند زنگ آلودہ دروازوں کو کھول کر یہ تم کیوں آئی ہو۔ میرے دل کے کواڑں کو مت دھڑ دھڑاؤ۔ جب یہ دروازے کھل گئے تو تم مجھے اور اسماء کو اندھیری راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتے بھی دیکھ لو گی۔ اور تمھیں دکھ ہو گا۔ تم غلط کہتی ہو کہ تم دوسری عورتوں سے الگ ہو، بلند ہو عظیم ہو، عورت نہ بلندی ہے نہ عظمت، عورت تو بس ایک نور ہے جس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ عورت تو روشنی ہے جو اندھی اندھیری راتوں کو یادوں کے دیوں میں جلتی ہے۔ عورت ایک خوشبو ہے جسے پکڑنے کی ناکام کوشش میں نے اسماء خانم میں کی تھی۔

تم چونک کر پوچھتی ہو کون اسماء خانم، دیکھا تم نے اسماء کا نام سنتے ہی تمھارا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ ہر عورت یہ کیوں چاہتی ہے کہ وہی مرد کی زندگی میں پہلا اور آخری نور ہو، جس کے بعد دیے بجھ جائیں، ستاروں میں روشنی نہ رہے۔ پتہ نہیں اسماء کو میں نے چاہا بھی تھا کہ نہیں یا یہ دل کے حاشیوں کی جلن تھی، آخر کیا تھا، جب میں اور اسماء اور بھیا ساتھ کھیلتے تھے تو وہ سدا میری ساتھی بنتی۔ ہم نے پریوں کی کہانیاں اکٹھی پڑھی ہیں۔ شہزادیوں کی مصیبتوں پر مل کر آنسو بہائے ہیں۔ گرمیوں کے تاروں بھرے آسمان کے نیچے خوش گوار ہوا میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے میں نے اسے کبھی پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم دونوں سدا ایک دوسرے کو بچاتے، وہ رونے لگتی تو میں ہی اسے چپ کراتا۔ جب بھیا دوسرے شہر چلے گئے تو ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ یہ نہیں کہ اسے دیکھے بنا مجھے چین نہیں آتا تھا۔ پر ہم دونوں اکٹھے رہتے بلقیس بانو! اگر بچپن کی یادیں دھول میں مل سکتی ہیں تو میں اسماء خانم کو بھلا دوں گا، پتہ نہیں وہ دن جب یاد آتے ہیں تو میرا دل یوں نیچے ہی نیچے کیوں بیٹھنے لگتا ہے۔ جیسے سمندر کی تہہ میں اتر کر اپنے پیارے ساتھیوں کے ساتھ ناچے گا؟ جب میں گھر سے دور شہر کے بورڈنگ اسکول میں چلا گیا تو بھیا کسی بڑے امتحان سے فارغ ہو کر گھر آ گئے تھے، اسماء رنگ برنگ کی چنریاں اوڑھتی اور ان سے

بہت ادب سے بولتی تھی۔ مجھے اس کے اس بہروپ پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ ہم دونوں ابھی تک بچپن کے ساتھی تھے۔

"کیا کہا، یہ کہانی بھی تو عام کہانیوں جیسی ہے۔" نہیں بلقیس بانو یہ کہانی عام نہیں۔ یہ کہانی میری ہے۔ منے کی کہانی کی طرح جس میں ایک بچہ اکیلا رہ جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ میں بھی اکیلا رہ گیا، بھیا ہوشیار تھے، مجھ سے بڑے تھے اور عورت کے دل کو ہاتھ میں لانے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ پر یہ کوئی مجھے سمجھا نہیں سکا۔ بلقیس بانو کہ اسماء کیسے بدل گئی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، ہم نے کبھی ایک دوسرے سے وعدے نہیں کیے تھے، ساری عمر نبھانے کی باتیں نہیں کی تھیں، پر میری زندگی اس کے بنا سونی ہو گئی۔ میرا دل آج تک ویران ہے۔ صرف اسماء کے قدموں کے نشان ہیں جو اس راہ گزر کے ایک طرف ایک امانت کی طرح میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ کیا کہتی ہو بلقیس بانو! ایک بول ایک نگاہ، ایک لفظ، کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

تم کہہ رہی ہو میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ میں نے تمھاری محبت کی قدر نہیں کی، میں مجبور تھا بلقیس بانو، جو کچھ کبھی دل میں تھا۔ میں نے شادی کے تحفے کے طور پر اسماء کے قدموں میں رکھ دیا۔ میں نے اسے کیا دیا تھا آج تو یاد نہیں پڑتا۔ جب باہر بارش ہو رہی ہو اور تیز ہوا درختوں میں روتی چلاتی پھرتی ہو تم

اندر کیوں نہیں آ جاتیں۔ کھڑکی باہر کھڑی تم ان پھولوں میں ایک پھول لگتی ہو بڑا سا کھلا ہوا پھول جس کی پتیوں پر بارش کی بوندیں کپکپا رہی ہوں۔

جب ماضی کے دروازے کھل ہی گئے ہیں تو بھلا تم خود کیوں اندر نہیں جھانکتیں۔ میری ماں کے سارے خواب ٹوٹ گئے اور میرے دل کی راہ گزر پر بکھر گئے۔ اسی لیے تو کوئی کبھی یہاں سے نہیں گزرتا۔ یہ کرچیں اتنی باریک ہیں کہ ایک بار چبھ جائیں تو خون کے آنسو رلاتی ہیں، پر نکالنے کی کوشش کرو تو اور بھی گہری چلی جاتی ہیں۔ بلقیس بانو کیا تم اس نوک کو ابھی تک اپنے دل کے کونے پر محسوس نہیں کر سکتیں۔

ماں ان دنوں کتنی اداس رہا کرتی تھی۔ اسے میری زندگی کی ناکامی کا افسوس تھا۔ پتہ نہیں وہ بھی میری طرح اسماء پر صرف میرا حق سمجھتی تھی۔ ماں بہت بھولی تھی اور بڑی دکھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ عورت ہوا اور خوشبو کی طرح بھلا کسی ایک کے ساتھ اپنا رشتہ تو نہیں باندھ سکتی نا اور پھر خواب کون سے سچے ہوتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں ہمیشہ الٹی ہوتی ہیں۔ میں نے اور ماں نے جو خواب مل کر دیکھے تھے وہ غلط نکلے اور میں نے ہولے ہولے اپنے دل کی تختی سے وہ تصویریں مٹا دیں جن کے رنگ کچے تھے اور جو حاشیے سے لے کر کاغذ کی لمبائی پر پھیلی تھیں۔

تب یورپ سے آنے کے بعد پہلی بار میں نے تمھیں دیکھا تھا۔ تمھاری شوخی جو اب بجھے ہوئے انگارے کی طرح روشنی کا ذرا سا نشان چھوڑ کر مٹ چکی ہے، ان دنوں آتشدان میں لپکتے شعلے کی طرح تھی اور پھر وہ میرے دامن سے آ لگی۔ تمھاری نگاہیں جو ہر وقت میرا تعاقب کیا کرتی تھیں۔ تمھارے خیال جو کسی وقت بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، ہسپتال کے پلنگ پر لیٹے لیٹے میں نے اپنے اکیلے دل کا سہارا تم میں ڈھونڈا، مجھے سہارے کی تلاش تھی، صرف سہارے کی، ان دنوں میرا کوئی گھر نہیں تھا اور جہاز سے اتر کر میں اپنے ڈھیروں سامان کے پاس ٹیکسی والوں کی باتوں کے شور میں سوچتا رہا تھا کہ میں کہاں جا سکتا ہوں، وہ سارے جن کو میری ضرورت تھی، جنھیں میری محبت کی ضرورت تھی سرخ لکیر کے دوسری طرف انگاروں سے دہکتی زمین پر بھسم ہو چکے تھے۔ میرے دل میں صورتیں محفوظ تھیں، نام نہ تھے، جس دوست کا خط میں لایا تھا وہاں جانے پر تم مجھے ملی تھیں۔ تم نے مجھے سہارا دیا ہے۔ ہم دونوں سمندر کے کنارے خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ تمھارے قریب ہونے سے میرا دل کانپتا نہ تھا۔ تمھاری نگاہوں سے نکلتی روشنی میں مجھے اپنی بچھڑی بہنوں اور ماں کی نگاہوں کی ٹھنڈک محسوس ہوا کرتی۔ میں نے کبھی تمھیں اس سے

زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ ان دنوں بھی آج کی طرح میرا دل اجاڑ تھا۔ ان ہونکتے ویرانوں میں بہار کے پھول اگتے تو کیسے ؟
بلقیس بانو! میں تو تمھارے بھائی کا دوست اور تمھارا مہمان تھا۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے اگر تم نے اندھیری راتوں اور تیر کی طرح جسم میں گھسنے والی ٹھنڈی ہوا میں میرے کمرے کے باہر دعائیں کی ہیں۔ میں خود سے تندرست ہونے کی کوشش کیوں کرتا۔ میرے لیے اس دنیا میں کیا تھا؟ مگر تمھاری نگاہیں مجھے ان سب کی یاد دلایا کرتی تھیں جو اب موت کی وادی سے اس طرف مجھے پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔
ٹھیک کہتی ہو، ایک طرح سے تو تم نے مجھے بچالیا ہے۔ پر کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم مجھے ان دنوں سہارانہ دیتیں۔ عورت صرف سہارا دے سکتی ہے محبت نہیں۔ عورت کو خود بھی شاید سہارے کی ضرورت ہوتی ہے مگر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں غلط باتیں کہہ رہا ہوں تو تم مجھے معاف کردو، بلقیس اس ٹھنڈی اور اندھیری رات کے بعد جب تم نے روشنی میں بھی میرا سہارا چاہا تو مجھے بتاؤ میں انکار نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس رات تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں تمھاری صورت میں اپنی بہنوں کی نہیں اسماء کی صورت کی جھلک دیکھتا رہا تھا۔ تمھاری ہنسی میں مجھے اس کی ہنسی کی آہٹ سنائی دیا کرتی تھی۔ اسماء میری کوئی نہ تھی اور اسی لیے

اپنے آپ سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے تمھیں بھی پرے دھکیل دیا۔ میں تمھارے ہاں سے چلا آیا۔ میں مہینوں چھوٹے شہروں، گندے ہوٹلوں اور عام آدمیوں میں بیٹھ کر اپنے آپ کو پرے دھکیلتا رہا۔ جو ہوا مجھے اس کا افسوس تھا میں اپنے کو سزا دے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو گم کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔

ایک دن کہیں سے پھرتے پھراتے بھیا مل گئے۔ اسماء کو ان کے ساتھ دیکھ کر بھی میں پہچان نہ سکا۔ اس کی صورت پر پہلے سے بھی زیادہ نرمی امنڈ آئی تھی اور اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر جب وہ میری طرف دیکھتی تو میرے لیے بھی وہاں وہی پیار ہوتا۔ زمین کی طرح اس نے اپنی آغوش کھول کر مجھے بھی اپنے پھولوں میں جگہ دے دی۔ کیا میں وہ جگہ پا کر خوش ہوں، اور اب تک میں یہ جان نہیں سکا، سمجھ نہیں سکا بلقیس بانو کہ عورت جب ماں بنتی ہے تو اتنی بلند کیوں ہو جاتی ہے، اتنی اونچی اور مقدس کہ تم ان بلندیوں کے سایے میں بیٹھ کر سکون حاصل کر سکو اپنے دکھ درد بھلا سکو۔

بہت دنوں بعد تمھارا خط آیا نہ جانے کس طرح تم نے میرا کھوج نکال لیا تھا اور لکھا تھا:

”جب تم گئے ہو تو میں بالکونی میں اکیلی تھی۔ مجھے کوئی کام نہ تھا۔ ہوا میں خوشبو سے بھرے جھونکے میرے گرد تیر رہے تھے اور پیڑوں پر پتے اچانک بے قرار ہو کر جاگ اٹھے تھے۔ میں نے بادلوں بھرے آسمان کو دیکھا جس پر سفید ٹکڑے تھم کر، رک کر تمھیں جاتا دیکھتے رہے تھے اور ہوا کی ہلکی سی جنبش سے میرے کھلے بال پریشان ہو رہے تھے، میں نے جھک کر تمھیں نہیں دیکھا۔ مگر وہ لمبی اور چمکتی سڑک تمھارے جانے کے بعد آہیں بھرتی رہی اور بادلوں کا دل کتنی دیر دھڑکتا رہا، اور تمھارے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ چاہت کے ان کہے بول میں جادو ہے، ساری دنیا ویسی ہی ہے۔ گرد و غبار اور خوشبو سے بھری ہوئی، پر میرے لیے اس میں کچھ نہیں اور اب یہ چاہت ایک بے کس، بے پناہ وجود کی طرح مجھ سے باہر چکر لگا رہی ہے۔ اس کے لیے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں اور زمانے کی دن رات کھلی نگاہوں کے سامنے اس کا عریاں وجود میرے لیے کسی خوشی کا باعث تو نہیں۔“

میں تمھیں کیسے سمجھاؤں بلقیس بانو کہ اس خط کے بعد میرے لیے کہیں قرار نہیں رہا۔ تم تو ایک دوپہر کو اپنی بالکونی میں اکیلی تھیں، پر یہ اکیلا پن، یہ سونا پن میرا مقدر ہے۔

آج جب سایوں کا میلہ سا لگ رہا ہے اور بارش کی دھند میں تم پرانے دنوں کی طرح میری کھڑکی کے باہر کھڑی ہو، مجھے بتاؤ میں اسماء خانم کو کیسے بھلادوں۔ منے کی ماں اسماء کو نہیں۔ اپنے خوابوں کی اس اسماء کو جس کے ساتھ میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ جس کی یاد کو میں مقدس سمجھ کر اپنے بورڈنگ سکول میں لایا تھا۔ آج بڑھتی ہوئی تاریکی میں جب نیند بھی نہیں آتی، میں منے کی کہانی کے لڑکے کی طرح اکیلا ہوں مگر اکیلے رہ جانے سے مر جانے تک کا مختصر راستہ اتنی لمبی رات میں سے ہو کر کیوں گزرتا ہے، جس کی سحر کبھی نہیں ہوتی۔

اسماء خانم! کاش تم میرے قریب ہوتیں اور میں اس بڑھتی تاریکی میں تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تمھارے لمس کو اپنی تنہائی کے ساتھ محسوس کر سکتا۔ کاش تم آ سکتیں اسماء۔ آج گزرے برسوں کے سفر کی تھکن میرے انگ انگ میں دکھی بن کر سما گئی ہے اور ڈھلتی زندگیوں میں ایک یاد کا سایہ اس گزری ہوئی سڑک پر پڑ رہا ہے۔ تم کہاں ہو اسماء؟ بلقیس بانو! تم کہاں ہو؟ میں نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا۔ زندگی روح بھی ہے اور جسم بھی۔ اگر تم اور میں ساتھ ساتھ چلتے تو دونوں کی نجات ہو جاتی۔ تمھارے ہاتھ کے لمس کے لیے، تمھارے جسم کی اس پاگل کر دینے والی خوشبو کے لیے، تمھاری سیاہ آنکھوں

سے نکلتی اس روشنی کے لیے جو انسان کو نگل لیتی ہے میں تمھیں چاہتا ہوں بلقیس بانو۔

مگر کھڑکی کے سامنے کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو میرے کمرے کی کھڑکی نہیں دھڑ دھڑاتا۔ ہوا آم کے درختوں میں رو رہی ہے، اور کوئل کی کوک گیت کے زیر و بم کی طرح دور ہٹتی اور قریب آتی جاتی ہے۔

صبح منا آئے گا تو پھر کہانی کے لیے ضد کرے گا۔ اسے کیا معلوم اس کا چچا خود ایک ایسی کہانی ہے، جس کو کہنے کے لیے لفظ نہیں ہیں۔ اسے کیا پتہ کئی کہانیاں ایسی بھی ہیں جو سنائی نہیں جا سکتیں۔ منے کی محبت تو سونے کا ذرہ ہے جس کو میں نے زمانے کی ساری ریت چھان کر وقت کے گزرتے دھارے سے نکالا ہے، پر منے کو کہاں معلوم کہ یہ انمول ذرہ کتنا قیمتی ہے جب اس کی معصوم محبت کو اس کی آنکھوں سے جھانکتے دیکھتا ہوں تو اپنا دامن پھیلا لیتا ہوں۔ جب بادل ہٹیں گے، تارے ہٹیں گے اور رنگوں میں لپٹا سورج افق سے سر نکالے گا اور پھر منا جاگے گا اور پھر ان گنت کہانیوں میں صرف ایک کہانی باقی رہ جائے گی۔ منے کو کیسے بتاؤں کہ اکیلے رہ جانے سے مر جانے تک کا فاصلہ بہت ہی طویل ہے اور اس راستے پر صرف ایک نشان ہے۔ اس سونے کے ذرے کی

روشنی کا نشان جو میں نے وقت کے دھارے کی ریت چھان کر نکالا ہے پر پھر بھی وہ میرا نہیں، اور کچھ بھی اپنا نہیں، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔

دو خط

شمس منزل

نور پور ـــــ جموں

عطیہ!

میری بڑی بیٹی گیتی کی شادی ہوئی تو اتفاقاً پرانے کاغذات میں کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے تمھارے خط بھی مل گئے۔ اور بیس سال کے بعد اسی عزم و ہمت اور استقلال کی تصویر نگاہوں میں گھوم گئی جسے سب عطیہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ آج سے چھ سال پہلے کسی پرانے ہم جماعت سے جسے تمھاری ذات میں بہت زیادہ دلچسپی تھی سنا تھا کہ تم راول پنڈی میں ہو۔ بس اسی سہارے خط لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے بالوں کی سیاہی میں اب سفیدی گھل گئی ہے۔ میں نے زندگی کے نشیب و فراز سے کیا سیکھا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا پر وقت گزر گیا ہے۔ گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارا اس سے کچھ سیکھنا یا نہ سیکھنا کتنا بے معنی لگتا ہے۔ مگر جو میں پوچھنے چلا تھا وہ تو بھول

ہی گیا۔ کیا اب تک تم عورت کو ماتھے کی بندیا اور مانگ کا سیندور بنانے کے ساتھ ساتھ اسے ان سب بندنوں سے اونچا اٹھانا چاہتی ہو یا تم نے اپنی نجات کی راہیں تعین کر لی ہیں؟ تم تو کہا کرتی تھیں تم کسی روشن مندر میں جاندار دیوتا کے سامنے اپنی آرتی اتارو گی۔ کیا اب تک پوجا کا تھال لیے گھوم رہی ہو۔ یا کسی دیوتا کے چرنوں کی اشیر باد سے تمھارا دل روشن ہو گیا ہے؟ عطیہ پرانا ساتھی ہونے کے ناتے مجھے ان سب سوالوں کے جواب پانے کا حق ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اول تو اتنا وقت نہیں ملتا کہ انسان تھم کر رک کر پیچھے دیکھے پر جب پیچھے دیکھو تو ماضی کے خلا میں صرف بہت پیاری اور عزیز صورتیں ہی دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں اور پھر بالوں میں گھلی سفیدی کے باوجود دل اسی گرمی اور پیار سے دھڑکتا ہے جس کو محسوس کر کے جوانی میں نبضیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ اور زیادہ لکھوں میں اپنے سوالوں کا جواب چاہتا ہوں۔

تمھارا بھولا بسرا ساتھی

ریاض شمس

ساوتری بھون

مری روڈ ـــــ راول پنڈی

ریاض

تمھارا اور اپنا بوڑھا ہو جانا ـــــ دونوں باتوں کو باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمھاری آواز سے، تمھارے چلنے کے انداز سے، تمھاری نگاہوں سے، ہر شے سے تو زندگی پکارا کرتی تھی۔ تم تو زندگی کا مجسمہ تھے۔ یقین کرنا مجھے بڑا دکھ ہوا یہ جان کر کہ تم ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گئے ہو جہاں وقت نے ان جانے، ان دیکھے ہی اپنا تسلط جما لیا ہے حالاں کہ آج سے بیس سال پہلے میں سمجھتی تھی وقت تم سے شکست کھا جائے گا۔ تمھارے قہقہوں میں کتنا جوش اور ولولہ ہوا کرتا تھا۔ مجھے تمھارے گرد یہی ہنسی سب سے زیادہ بھاتی تھی، جیسے پھول کے گرد اس کی ان دیکھی خوشبو کا ایک ہالہ سا رہتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہو وقت گزر جاتا ہے۔ پر نہ جانے کیوں ریاض میرے لیے وقت گزر کر ایک اندھیری اماوس کی رات کیوں ہو گیا ہے؟ نہ جانے کیوں! سنسان ہولناک ویرانے میں مندر کے باہر آرتی کا تھال لیے لیے میں نے کتنی پرارتھنا کی تھی کہ دوار کھلیں۔ کتنے زمانے گزر گئے اور پھر جب تیز آندھی کے تھپیڑوں سے مندر کا

دوار کھلا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا تو وہاں بھی اندھیرا تھا۔ ہوا مورتی کے خالی آسن پر رو رہی تھی۔ تب سے آج تک تھال اٹھائے اٹھائے میرے ہاتھ دکھ گئے ہیں مگر کوئی نہیں بتاتا کہ میں آرتی کہاں اتاروں اور اب تو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دیوتاؤں کے پاؤں مٹی کے ہیں۔ کیلاش پربت پر کوئی نہیں رہتا اس سے پرے بھی خلا ہے۔ اس خلا کا احساس اور اس تھکن کے بے چارگی کا احساس یہی تو زندگی کا المیہ ہے۔ اس المیہ سے گھبرا کر انسان کبھی کبھار دوسرے کے سہارے کی سوچا کرتا ہے۔ مگر جہاں اور بہت سی حسرتوں سے سینہ آباد ہے وہاں ایک کی زیادتی یا کمی سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پر ریاض تم مجھے آج سے بیس سال پہلے جانتے تھے۔ نئے لوگوں سے کچھ کہتے میں بہت گھبراتی ہوں۔ تم اگر میری بات سمجھو گے نہیں تو کم از کم چہرے کو ایک سوالیہ نشان تو نہیں بنالو گے نا جیسے میرے گرد یہ سب لوگ بنائے رہتے ہیں —— دنیا کو سنوارنے کی راہیں ایسی آسان نہ تھیں اور مجھ سے بہتر تو تم جانتے ہو کہ کبھی کبھار مشکلات میں جی الجھ جاتا ہے تو انسان کہتا ہے ہٹاؤ "مارو گولی" اس سارے خواب اور فلسفے اور نظریے کو میرا اپنا آپ بھی تو ہے۔ اور میں بتاؤں جب میں نے یہ فیصلہ کیا تو وقت گزر چکا تھا۔ اور وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ ریاض وقت کبھی واپس نہیں آتا اور جو عورت بہت استقلال اور بڑے عزم

سے بڑھتی ہے کہ ماتھے سے بندیا اور مانگ سیندور نوچ کر ان میں ستارے بھرے گی، شکست کھا جاتی ہے۔ میں آج سے بیس سال پہلے کی عطیہ عزم و استقلال کی تصویر جب تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں تو میری آنکھوں میں نہیں میرے دل میں آنسو ہیں اور میرے گرد پھیلا ہوا وہ ہولناک سناٹا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جس کو باہر کی ان گنت آوازیں مل کر بھی توڑ نہیں سکتیں۔ میری اس تنہائی کا کوئی ساتھی نہیں۔ صرف ایک عورت ہے جو پہلے برسوں میں کبھی کبھار آتی تھی پر اب رات دن میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ آج سے دس سال پہلے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کو بھی تیار نہ تھی پر اب وہ حکم دیتی ہے میں مانتی ہوں۔ میں اس کی غلام بن گئی ہوں ریاض۔ جب خشک پتے بڑی بے چارگی سے میرے چاروں طرف اڑتے ہیں، بگولے چلتے ہیں اور درختوں کی ننگی شاخوں پر دھیرے دھیرے قدم رکھتی خزاں گیت گاتی ہے تو وہ رونے لگتی ہے۔ اس کا حلق خشک سسکیوں سے گونجنے لگتا ہے۔ سفید ہوتے بالوں میں انگلیاں پھیرتی خلا میں تکتی وہ چپ چاپ بیٹھی آنسو بہاتی ہے نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہیں۔ کیسی کیسی حسرتیں ہیں؟ میں کیا جانوں؟ پر اس کے ہوتے میں انجان بن کر نہیں بیٹھ سکتی۔ ان ویران آنکھوں میں مجھے جھانکنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی کبھار وہ مجھے کہتی ہے عطیہ بانو میرے پائل میں کتنے

گیت تھے جو تمھاری وجہ سے مر گئے۔ میری مانگ تمھاری وجہ سے اجڑ رہی ہے۔ میرے گلے میں کتنے بول بند کے بند ہی رہے تمھارے عزم پر لعنت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے جو تم نے گزاری۔ کیا تم کو یہ وقت دوبارہ ملے گا کیا۔ میں پھر سے بیتی زندگی واپس بلا سکتی ہوں۔ پھر میرے قریب بیٹھی یہ عورت واویلا کرنے، رونے اور سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ کبھی پہروں گھٹنوں میں سر دیے یوں بیٹھی رہتی ہے گویا مر گئی ہو۔ مگر اب تنہائی میں مجھے اس کی رفاقت بھی عزیز لگنے لگی ہے۔ میں جھنجھوڑ کر اسے جگا دیتی ہوں۔ اور یوں ان خشک بالوں ویران آنکھوں اور اجڑی صورت والی عورت کے ساتھ یہ دن گزر رہے ہیں۔

کوئی اور ہوتا تو میں کبھی اعتراف شکست نہ کرتی مگر یہ تم ہو جس سے میں نے محبت نہیں کی مگر جس کی میں ہمیشہ عزت کرتی رہی ہوں۔ سچ کہنا ریاض تمھیں اتنے برسوں کے بعد یہ جان کر دکھ تو نہیں ہوا کہ میں نے تمھیں کبھی نہیں چاہا، ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بس تم مجھے اتنے اچھے ضرور لگتے تھے کہ میں تمھاری جگہ دوسروں سے الگ رکھوں۔ تمھاری بے پناہ ہنسی اور زندگی سے بھرپور قہقہے۔ تمھاری ہنسی نے ہی تو مجھے زندگی کے اس ان دیکھے ہاتھ پر یقین کرنے پر مجبور کیا تھا جو بنانے بگاڑنے سنوارنے میں بس ایک اشارہ کرتا ہے۔

تسلیم بھی کیا کیا کرشمہ سازیاں کرتی ہے؟ تمھیں شکتی اور ساوتری اور سیتا تینوں بہنیں تو یاد ہوں گی جنھیں اپنی موٹر میں پہنچانے جایا کرتے تھے۔ تینوں کتنی خوبصورت تھیں، اونچی ناک بڑی بڑی روشن آنکھیں وہ ہنسی جیسے کہیں ہولے ہولے چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ سارے لڑکے تم سے کتنے جلتے تھے مگر تم ایک دن بھی اس بات پر فخریہ انداز سے اکڑ کر نہیں چلے۔ بس تمھاری ایسی ہی باتیں تو مجھے اچھی لگتی تھیں پر جب شکتی کی شادی ہوئی ہے اور ہماری جماعت کے اس گورے لڑکے نے بہت کمینگی سے ہنس کر کہا تھا۔ ”کیوں ریاض یار۔“ اور تم نے اس کے منہ پر اس زور سے مکا مارا تھا۔ وہ آج کل کئی برس سے میرے گھر کے قریب ہی رہتا ہے مگر میں اسے پہچاننے کی کوشش نہیں کرتی۔ خیر یہ باتیں چھوڑو۔ ساوتری سنا ہے آج کل کالکا میں ہے اور سیتا اوٹا کمنڈ میں۔ وقت کتنا ظالم ہے یہ فاصلے ایک بار پیدا ہو جائیں تو بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ پر وقت گزر جانے پر بھی جو باتیں ہمیں پیاری تھیں وہ ویسی ہی پیاری رہتی ہیں۔ شکتی کا اماوس کی رات کا گیت مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ذہنی گیت جو وہ آنکھیں بند کر کے والہانہ انداز سے گایا کرتی تھی۔

آج ساوتری بھون بارش کی دھند میں اور بھی دبیز اندھیرے میں ڈوب گیا ہے۔ کئی برس سے تو مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے چاند سورج ستارے ایک ٹھنڈا

گہرا مخملیں اندھیرا پھیل گیا ہے اور میں خدا کی جنت سے جس میں گرمی، روشنی ، خوش چہرے، ہوا اور زندگی تھی نیچے پھینک دی گئی ہوں پر ابھی تک میرے پاؤں کسی تال کو نہیں چھو سکے۔ میں گر رہی ہوں مسلسل گر رہی ہوں اور نہ جانے کب تک گرتی ہی جاؤں۔ یہاں تک کہ موت کے سرد آرام دہ پر سکون دھندلکے کو چھولوں۔ کیوں ریاض کیا موت کے دھندلکے کے بعد ایک نیا سویرا ہو گا۔

زندگی میں انسان کی تمنائیں کتنی محدود ہوتی ہیں۔ ایک گھر، اچھے ساتھی، چند ملنے ملانے والے اور بس مجھے ہنسی آتی ہے کہ محدود دنیا میں سے بھی مجھے کچھ نہ مل سکا۔ گھر کے نام یہ ساوتری بھون ہے جس کے چار پانچ کمروں میں ہر ایک میں سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے پر نہ جانے کتنے لوگوں کے نام لکھے ہیں۔ اردو میں، ہندی میں، انگریزی میں۔ پیپل کا بڑا سا درخت ہے جس کے پتے ہر وقت کف افسوس ملتے روتے اور نہ جانے کس کا ماتم کیا کرتے تھے۔ ایک الو اس کی گھنی شاخوں میں بیٹھا کبھی کبھار اس زور سے کراہتا ہے کہ تنہائی کی عادی ہونے کے باوجود میں کانپ جایا کرتی ہوں۔ سامنے چھوٹی سی بارہ دری ہے جس کے درمیان ایک اجڑا ہوا ہون کنڈ ہو گا۔ مگر اب اس میں ایک ذلیل سا پودا جھانکا کرتا ہے جس میں نہ سامگری سی خوشبو ہے اور نہ ہی آگ کے شعلوں کی

لپک اور چمک اس پودے میں نہ پھول آتے ہیں اور نہ ہی خوبصورتی ہے۔ ایک زندگی کی جلن کے بعد جو شے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ شاید اس پودے کی طرح انسان کے چہرے پر اجاڑ طمانیت اور تنہا بے کسی بن جایا کرتی ہے۔ بارش کے دنوں میں پیپل پر پرندے چیختے الو نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ ہوا کا ریلہ کانپتا روتا پتوں اور شاخوں پر سے گزرتا ہے۔ ساوتری بھون کے سیاہ اور سفید فرش پر پانی کی لہریں ہوا کے زور سے آتی ہیں۔ اور کمروں میں نہ جانے کتنے ستیہ دان، کتنے بھیم، کتنے ارجن اور کتنے دریودھنوں کی روحیں کانپ اٹھتی ہیں؟

زندگی کی تگ و تاز میں محبت کبھی کبھار تو ایک ثانوی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ وقتی اور فنا ہونے والی۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں نے سوچا تھا میں ایک چٹان ہوں جس پر سردی گرمی بارش، طوفان اور آندھی کسی کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ چٹان جو دو دنیاؤں کے سنگھم پر ہے جس کی سر بفلک بلندیاں تم کو افق کے اتنا نزدیک کر دیں گی، اتنا نزدیک کہ تم ہاتھ بڑھا کر آکاش کو چھو سکو گے۔ پر زندگی آکاش کو چھونے کی نہیں اپنے سوالوں کے جواب پانے کی کوشش ہے۔ ایک اندھیرے سے کش مکش ہے۔ اس کرن کی کھوج ہے جو خوشی اور زندگی ہے۔ پر ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے

لیے ہر ایک کو آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ الگ الگ تا کہ جو کھوٹا ہے اور جو کھرا ہے وہ جدا ہو جائے اور مجھے معلوم نہیں ریاض۔ اماوس کی رات کے اس دبیز مخملیں اندھیرے میں مجھے نہیں معلوم کہ میں آگ کی محراب کے پار پہنچ گئی ہوں کہ نہیں؟

کوئی ایسی یاد نہیں، کوئی ایسی حسرت نہیں جس کی تڑپ اس مسلسل دھڑکتے دل سے الگ شمار کر سکوں۔ دوسروں کے لیے راہیں تعین کرتے کرتے میں خود ہی بھٹک گئی۔ تم مجھے دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ "دنیا کی پہلی عورت کے چہرے پر بھی صحت مندی۔ حسن۔ سادگی مل کر ایک ایسا ہی ملکوتی سا کیف پیدا کرتی ہوں گی۔" اور آج دیکھو تو کہو۔ دنیا کی آخری عورت کے چہرے پر بھی ایسی ہی شکست اور ایسی ہی تنہائی کا کرب اور ایسا ہی بے بسی کا رونا ہوتا ہو گا۔ شاید جمے ہوئے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی چمکیلی مگر نور سے خالی ہوں گی۔

ریاض شاید تم آخری انسان ہو جو اس سارے کرب کو بڑے خاموش طریقے سے سمجھ سکو گے کیونکہ تم سورج کی کرنوں کی طرح زندہ ہو اور زندگی پھیلاتے ہو۔ تم افسوس نہ کرنا کہ میں اب افسوس اور ہمدردی حاصل کرنے کی منزل سے گزر گئی ہوں۔ میں جو ساوتری بھون میں اکیلی رہتی۔ اپنے پہلے وجود

کا ایک سایہ سا ہوں میرے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ مت سوچنا کہ میں خود رحمی میں مبتلا ہوں۔ ”خود کردہ را علاجے نیست“ میں جانتی ہوں میرے لیے نجات کی سب راہیں مسدود ہو چکی ہیں پھر بھی دل کے ویرانے میں خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی نہیں صرف ہوا کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ تم جانتے ہو میں نے دل میں کبھی کسی کو آنے ہی نہیں دیا۔ یہ دروازے میں نے اتنی مضبوطی سے بند کیے تھے کہ جب میں نے ایک زمانے کے بعد ان کو کھولنا چاہا تو ہاتھ زخمی ہو گئے مگر دروازے کھل نہ سکے۔ میں سدا اپنے آپ سے باہر قید رہی ہوں۔ اس قید نے میرے اعضاء سے ساری گرمی اور ساری زندگی لے لی ہے۔

سدا کی خود غرض عطیہ آج بھی اپنے متعلق ہی سوچ رہی ہے یہی کہو گے نا۔ لو اب بتاؤ۔ گیتی کیسی ہے کیا اس کی آنکھوں میں زندگی اور نور ہے کیا اس کے گرد بھی قہقہے ایسے ہی تیرتے ہیں جیسے پھول کے گرد خوشبو۔ کیا وہ بھی آنکھیں بند کر کے ”اماوس کی رات“ گیت ویسے ہی گا سکتی ہے جیسے شکتی گایا کرتی تھی۔ شکتی کا یہ گیت تمھیں بہت پسند تھا نا تم تو اسے ”اماوس کی رات“ کہا کرتے تھے اور تمھاری بات کیسے پوری ہوئی اس عطیہ کو جسے تم بلند عظیم اور نہ جانے کیا کیا سمجھا کرتے تھے ”اماوس کی رات“ بننا پڑے۔ گہرے دبیز مخملیں

نرم ٹھنڈ سے موت کے سے آرام دہ پر سکون اندھیرے میں لیٹی تمھاری۔

عطیہ

لال آندھی

ایشر سنگھ بڈھا تو کیا، ہے تو دس جوانوں پر بھاری۔ ہمارے گاؤں کی ساری رونق اس کے دم قدم سے ہے۔ آواز میں ایسی گرج اور ہیبت ہے کہ منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں پھلا کر کسی کو زور سے پکارے تو پانچ میل تک پکارے جانے والا اس کو سن لے گا۔ لاٹھی پر چڑھا بلم گھماتا ہے تو دیکھنے والے کی جان ہوا ہونے لگتی ہے یہ نہیں کہ ہم میں سے کوئی بزدل ہے اور لڑنے سے ڈرتا ہو پر معلوم ہے ہنسی ہنسی میں بھی اگر کسی نے ایشر سنگھ کو کہہ دیا کہ لا پھر دیکھ لیں تیر انشانہ تو وہ سچ مچ اپنی جان گنوا بیٹھے گا۔ اس کے بال سفید ہیں اس کی لمبی داڑھی سفید ہے اس کی بھنویں سفید ہیں مگر اس کا دل کتنا جوان ہے۔ جب ہم میں سے کوئی اسے چاچا یا بابا کہنے کی کوشش کرے تو وہ اسے بری طرح گھورتا ہے۔ ”دیکھو جوان، بابا یا چاچا کہنا ہے تو کسی اور سے بات کرو۔ میں تو بس ایشر سنگھ ہوں۔ نرا ایشرا۔“ ہیر اس سے اچھی کوئی نہیں گاتا۔ پھر گورو کی بانیاں، جب جی کی پوڑیاں، ایسی لہک لہک کر پڑھتا ہے کہ گوردوارے میں اس کے بنا

بات ہی نہیں بنتی۔ گرنتھ صاحب کے سامنے آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے وہ کچھ ایسی درد بھری آواز سے شبد پڑھتا ہے کہ سب کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ مگر پرشاد بانٹنے کے لیے اسے کہو تو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا، منتیں کرو، خوشامدیں کرو، واسطے دو، قسمیں دو بس سر کو ہلاتا رہے گا، منہ سے کچھ نہ کہے گا۔ شادی بیاہ میں کبھی نہیں جائے گا۔

کاتک کے دن تھے مگر بڑے ہی اداس۔ فصلیں تیار کھڑی تھیں سنہری سی چمک جیسے کسی مٹیار کے حیادار چہرے پر گھونگھٹ کی اوٹ میں ہوتی ہے، کھیتوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہم سب اپنی اپنی فصلوں کی رکھوالی کرنے کھیتوں کے کنارے چھوٹی چھوٹی پھوس کی جھونپڑیاں ڈالے آن پڑے تھے۔ سارا دن بھی یہاں پر ہی گزرتا۔ ہم تین تھائی تھے۔ باری باری سے آتے اور گھر چلے جاتے۔ مگر ایشرا اکیلا تھا۔ اس کے بھتیجے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بھائی مر چکے تھے اس کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا اور اس لیے وہ تنہا ہی اپنے کھیتوں کی رکھوالی کرتا تھا۔ اگر وہ اپنے کاموں میں کسی کی مدد قبول کرنے کی بات آرام سے سن سکتا تو شاید میں اسے ضرور کہتا مگر یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ کسی نے کبھی کہا ”لا ایشرے تیرا کام کر دیں“ تو وہ کہتا ”کیوں یار میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت نہیں رہی کیا۔“ پھر کھدر کے کھلے کرتے کی

لمبی آستیں اوپر چڑھا کر وہ اپنی بانہیں دکھاتا جن میں مچھلیاں تڑپ رہی ہوتیں اور اس لیے میں نے کبھی اسے اپنی مدد کی بات نہیں کہی۔

مگر کاتک کے جس دن کی بات کر رہا ہوں وہ دن بڑا ہی اداس تھا۔ اداس اور ڈراؤنا، آسمان پر سیاہ بادل نہ تھے۔ میلا ملگجا غبار بھی نہ تھا۔ بس سفید بادل تھے، چتکبرے سفید جیسے تیتر کے پر۔ سورج کبھی ایک گڑھے میں گرتا اور کبھی دوسرے میں۔ اس کی روشنی بجھی بجھی سی تھی۔ کھیتوں کے کنارے اگے درختوں سے سوکھے پتے ہولے ہولے یوں گر رہے تھے جیسے کوئی عورت بین نہ کر سکے اور چپکے چپکے آنسو بہاتی جائے۔ ایسے دن ہوتے ہیں جب کسی گزرتی برات کے باجوں کی آواز سن کر دل پانی میں ڈوبتی کشتی کی طرح ہولے ہولے خوش ہو کر ہوا میں تیرنا چاہتا ہے پر تیر نہیں سکتا۔ اور ایک بوجھ کی طرح اور نیچے اور نیچے ان جانی زمینوں اور پاتال کی طرف کھنچتا ہے۔ گانے کی کوشش کرو تو آواز نہیں نکلتی زور سے کسی کو للکارو۔ کسی کوے کو غلیل کھینچ کر پتھر مارو تو الٹا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے اور کسی کو کنکری لگے بنا ہی رہ جاتی ہے۔ ہوا جب سرن سرن باجرے کے سنہرے سٹوں اور کھیتوں میں آدھے ڈوبے درختوں کے پتوں کو چھو کر گزرتی ہے تو جی چاہتا ہے کوئی نہ ہوتا۔ ہم نہ ہوتے یہ دنیا نہ ہوتی۔ دنیا کے دھندے نہ ہوتے۔ ایسی ان جانی خواہشیں جی کو گھیر لیتی ہیں

جیسے ان کے پورے ہوئے بنا ہی دم نکل جائے گا۔ اور پھر ایسے دن چانن سنگھ کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ چانن ہمارا تو کچھ نہیں تھا مگر ایشر سنگھ کا بھتیجا تھا سگا۔ ماں جائے کا بیٹا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ برات مان کھیڑے سے آنے والی تھی۔ چانن نے سمدھی اچھے اونچے ڈھونڈے تھے زور اور زر والے۔ یوں بھی مان کھیڑے کے سکھوں کا مقابلہ پنجاب میں بہت کم قبیلے کر سکتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی لڑکی یہاں بیاہی تھی۔ ان کی بہادری کی دھوم دور دور تک تھی۔ بانٹتے، حصے کرتے ہوئے بھی ایک ایک کے پاس کم از کم سو سو کھوہ تھے۔ مان کھیڑے والوں کے ہاں رتھوں میں جوتنے والے بیل ہزار ہزار روپے کے تھے۔ سینگوں پر سنگوٹیاں چڑھی ہوئیں۔ سفید رتھوں کے رنگ برنگے پردوں کے پیچھے کبوتروں کی سی اونچی پیشانیوں والی سوانیاں، مٹیاریں جو چلیں تو زمین پھولوں کی طرح نرم پڑ جائے۔ گلابوں کی نزاکت والی نرمی سے بات کرنے والی مان کھیڑے کی عورتوں کا مقابلہ بھی کون کر سکتا ہے۔ حسن ان کے گھر کا غلام تھا، دولت پانی بھرتی تھی۔ اور وہاں چانن سنگھ کی بسنت کور بیاہی جانے والی تھی۔

بسنتی کا قد اونچا تھا، رنگ دودھ کی طرح سفید، چلتی تو لگتا راج ہنس پانی پر تیر رہا ہے۔ کمر پر گھڑا ٹکا کر جب پنگھٹ سے پانی لینے جاتی تو گاؤں کے جوان اسے

چھپ چھپ کر دیکھتے مگر مان کھیڑے سے بات آنے کے بعد کسی کو ہمت ہی نہ پڑی کہ اس سے بات کرنے کا ڈھنگ نکالے۔ ہمارے گاؤں کا سب سے جیالا اور بہادر امریک سنگھ بھی دل چھوڑ گیا۔ ہم نے اس کا خوب مذاق بنایا۔ تو کہنے لگا یار اپنا کیا جاتا ہے پر مان کھیڑے والوں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے اور یہ ان کی امانت ہے۔ جب گرو ہی ساتھ چھوڑ دے تو چیلے کیا کر سکتے ہیں اس لیے ہم میں سے کسی نے سوائے بسنتی کو دور سے دیکھنے کے کبھی آگے بڑھ کر بات کرنے کی ہمت نہیں کی۔ اور ایسے اداس دن بسنتی کی شادی ہو رہی تھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا، ہار خریدے گئے، برات کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا، دریاں بچھا کر ان پر نئے سرے سے جھاڑ دی گئی۔ گاؤں کے سارے گھروں سے، برادری میں سے صاف ستھرے بستر اکٹھے کر کے برات گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دیا گا۔ بڑے بڑے کڑھاؤ حلوے کے پک چکے تھے۔ جن پر گھی تیر رہا تھا۔ زمین کو کھود کر بھٹیوں کی طرح چولہے بنائے گئے تھے جن پر نانی منڈے پک رہے تھے۔ ایندھن کے ڈھیر لگے تھے۔ چانن کے بڑے بھائی گوربچن سنگھ کا بیٹا بھگت سنگھ زور زور سے ہنستا باتیں کرتا دہی کے مٹکوں میں بڑے ڈلواتا کہہ رہا تھا یار میں تو آج اتنا کھاؤں گا کہ پیٹ پھٹ جائے۔ اور دیسی اتنی پیوں گا کہ سارے گھڑے خالی ہو جائیں۔ پاس سے روٹیاں پکاتے ایک نائی

نے کہا۔ ”مان کھیڑے والے کہیں گے سمدھیوں کو کھانے پینے کا ڈھنگ نہیں نہ بھاؤ ایسی بات نہ کرنا۔“ اور بھگت سنگھ نے کہا۔ ”واہ بڑے آئے مان کھیڑے والے زمین ان جتنی نہیں تو کیا ہے ہم کھاتے تو ان سے اچھا اور ستھرا ہیں۔ وہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنی بہن وہاں دی ہے۔ پر جو ان جھک کر نہیں، منت کر کے نہیں دی، جوتیاں گھس گئی ہیں ان کی پھیرے کر کر کے۔“ اور پرشاد کے کڑھاؤ میں چمچ چلاتا ایک نائی کہہ رہا تھا۔ ”اچھا بھئی واہ گرو لاج رکھے، کرتار سوہنی کرے جس گاؤں میں بیٹی دے دی باقی کیا رکھا۔“ چانن کے گھر میں کئی دنوں سے ڈھولک بج رہی تھی۔ اندر دالانوں میں گاؤں کی ساری کنواریاں اکٹھی رہتیں۔ بسنتی کی سہیلیاں اس کی سہیلیوں کی نندیں، بہنیں، بیاہی بے بیاہی لڑکیاں، کچی عمروں کے لڑکے، ایک میلہ سا تھا۔ کئی سالوں سے ایسی رونق والی شادی گاؤں میں نہیں ہوئی تھی اور سردارنی چانن کی بیوی کبھی اپنی ساری بدمزاجی بھول کر گویا بچھی جاتی تھی۔ آنے والیوں کی خاطر تواضع دودھ پانی سے کرتی، اور ویسے بھی ابھی سو کام باقی تھے۔۔ شادی والے گھر میں کام لڑکی کے رخصت ہو جانے کے بعد ختم ہو چکتا ہے۔

بدھائی دینے والیوں کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھنا۔ جوڑوں کا حساب رکھنا۔ چیزوں کو ٹھکانے لگانا اور پھر برادری میں آخری گھڑی تک روٹھے ہوئے رشتہ

داروں کو منانے کی زبردست ذمہ داری کا کام۔ کھانے پکانے کا سارا انتظام باہر
مردوں کے پاس تھا تو بھی ہزار کام پڑے تھے۔ برات گھر سے ہر گھڑی چانن آ
کر چیزیں مانگتا تو افراتفری سی پڑ جاتی۔ کنجیاں کہاں ہیں۔ ترازو کدھر ہے کس
کپڑے میں چینی تول کر باندھیں۔ ڈھول کی تھاپ کے اوپر سارا گھر اس للکار
سے گونج اٹھتا۔ برات اگلے دن آنے والی تھی مگر چانن کی بیوی کو اتنی فرصت
نہ تھی کہ چاچے ایشرے کے گھر کسی کو بھیج سکے یا خود جا کر دو گھڑی چاچی کو منا
لائے۔ چانن نے کہا تو سر دارنی بولی۔ "ایشر اچاچا ہے جا کر منالاؤ۔ دیکھتے نہیں
میں اتنے کاموں میں جتی ہوئی ہوں۔" اور پھر ہولے سے بولی۔ "اگر نہ بھی
آئے تو کیا بات ہے ان کے ہاں کون سی شادی ہونے والی ہے کہ ہم کو نہ لے
گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔" چانن نے بھی زیادہ زور نہ دیا اور گھی کا کنستر
ایک ہاتھ میں لٹکائے وہ گھر سے باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے ڈھولک کی تھاپ
مہندی کی خوشبو نئے جوڑوں کی مہک میں ملی اڑتی رہی۔

ایشر سنگھ روز کی طرح آج زور زور سے ہنس رہا تھا۔ پھوس کی کوٹھڑی میں کبھی
اندر جاتا کبھی باہر آتا۔ بیلوں کے چمکیلے سینگوں پر ہاتھ پھیرتا۔ اور ہیر گانے
لگتا۔ آج اس نے روز کی طرح پگڑی بہت اچھی طرح نہیں باندھی ہوئی تھی۔
سفید بالوں کے گچھے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر برف کے گالوں کی طرح

پڑے تھے کرتا ذرا میلا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں گرد سے اٹے ہوئے تھے جیسے عادت کے مطابق آج تین چار بار انھیں دھویا نہ ہو۔ شام ابھی دور تھی مگر اس نے ٹوکے کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ چاچی روٹی لائی تو شوق سے رومال کھول کر جلدی سے دیکھنے کی بجائے اسے ایک طرف رکھ کر وہ ٹوکے پر اسی طرح جھکا رہا اور اتنے زور سے گانے لگا کہ وہ جل گئی اور بولی۔ ”تجھے تو سارا وقت یہ آگ لگی ہیر گانے سے فرصت نہیں ہوتی۔ کبھی کوئی کام کی بات ہی نہیں سنتے۔“ اور ایشر سنگھ بڑی نرمی سے مڑ کر بولا۔ ”ہیر تو تیرا سہاگ ہے کملی۔ ہیر تو زمین کی نرمی ہے گندم کی بالوں میں دانے کی طرح ہے۔ تو مجھے کیا کہنے آئی ہے۔ جلدی بتا اگر کوئی کام نہیں تو جا جا کر چرخہ کات مجھے گانے دے۔“ پھر وہ اسی طرح ٹوکے پر جھک گیا۔ ”آگ لگے ٹوکے کو اور تیری ہیر کو۔“ چاچی چیخ کر بولی۔ ”تو ہیر گا گا کر بھوت بن گیا ہے میں کہتی ہوں روٹی کھا کر مجھے برتن دے تو میں گھر جاؤں گھر کو اکیلا چھوڑ کر آئی ہوں۔“

”بیٹھ دو گھڑی تیرے گھر سے کونسا کوئی زیوروں کا ڈبہ چرا لے جائے گا۔ سوت کے ڈھیر یہیں کات کات کر لگاتی جا۔“ ایشرے نے اسی طرح ٹوکے کی ہتھی کو ہاتھ میں لے کر اسے گھماتے ہوئے کہا۔

”آگ لگے بہاری پھرے۔ دشمنوں کو اجاڑ لے۔ میری زندگی میں سوائے کاتنے کے کیا کام رہ گیا ہے۔“

”دیکھ میری طرف دیکھ اور سن پھر کبھی ایسی بات نہ کہو کبھی نہ۔ کسی کا برا نہیں مانگتے اپنا برا ہو جاتا ہے۔“ میں کھرپا ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ ایشر سنگھ کی پیٹھ میری طرف تھی اور اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے وہ ذرا سا جھکا ہوا انگلی اور انگوٹھے کو اٹھائے ہوئے آنکھیں کھولے دیوانہ لگ رہا تھا۔ جیسے ایک دم پاگل ہو گیا ہو۔ اور پھر اس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ اتنے زور سے کہ میں بھی ڈر گیا۔ ”سن میں تجھے ہیر سناتا ہوں۔“

”ہیر آکھیا جو گیا جھوٹ بولیں تے کون وچھڑے یار ملاوندا ای۔“

اور چاچی گالیاں دیتی اٹھ کھڑی ہوئی تو تو سڑی ہو گیا ہے۔ ہر وقت ہیر۔ ہر گھڑی ہیر۔ میرے تو نصیب سڑ گئے۔ چل روٹی کھا ورنہ میں جاتی ہوں۔“ مڑا ہے تو اس نے مجھے دیکھا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ”یار اسے ہیر سے واہ گرو کی قسم ایسی دشمنی ہو گئی ہے کہ کیا کہوں۔ کوئی اسے یہ نہیں سمجھاتا کہ یہ زمین ہیر ہی تو ہے ۔ اگر اس ہیر کو پیار سے بونے گاہنے کا کام نہ کروں تو یہ کھائے کہاں سے۔“

چاچی خاموش ہو رہی۔ ایشر سنگھ نے ہاتھ دھو کر روٹی کھائی برتن وہیں رکھ دیے اور خود غلیل لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا زور سے ہو ہو کرتا دور تک پھیلے کھیتوں سے دوسری طرف مڑ گیا۔

دھوپ کہرے کی طرح ٹھنڈی اور دھوئیں کی طرح بوجھل تھی۔ چتکبرے تیتر کے پروں جیسے بادلوں کے آگے پیچھے ریت کے ٹیلوں کے سے بادل تھے۔ اور آسمان بہت اونچا لگ رہا تھا۔ ہمیشہ سے زیادہ اونچا۔ کئی دنوں جب سورج چمک رہا ہو، دھوپ کھلی ہوئی ہو۔ ہوا چل رہی ہو تو یوں لگا کرتا ہے کہ یہ نیلاہٹ نزدیک آ رہی ہے اور قریب اور قریب کہ اگر ذرا سا سر اونچا کرو تو بڑے پیپل کے ساتھ لگے آسمان کو چھو سکو گے۔ مگر آج آسمان بہت دور لگ رہا تھا۔ گہرا جیسے کنوئیں کی گہرائی ہو۔ چیلیں زور سے بولتیں اور پر سمیٹ کر کنارکنارے شہتوت اور بیری کے چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھ جاتیں۔ کوے تیر کی طرح سیدھے اڑ کر خاموش باغوں کے غمناک اندھیروں میں غائب ہو جاتے۔ دور سے سارچور کے آموں کا باغ نظر آ رہا تھا۔ اور دن ہو تو وہاں چمگاڈروں اور کوؤں نے ایک شور مچایا ہوتا ہے۔ مگر آج کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ پاس کے کھیتوں سے کبھی ہو ہو کی سنائی دے جاتی اور پھر خاموشی ہوتی میرا جی چاہتا تھا ایشر سنگھ سے ہیر سنوں۔

جسو دھا سنگھ اور چودھری شیرے کی کھوہ سے پرلی طرف میں نے نظر کی تو بابو کمہار گدھے ہنکاتا کھیتوں کی منڈیروں سے ادھر آ رہا تھا۔ میں نے زور سے آواز دی تو وہ کھڑا ہو گیا اس کے گدھے اس طرح سر جھکائے ہولے ہولے چلتے رہے۔ میں نے یونہی کہا۔ "یار کیا لا رہا ہے اور کہاں جائے گا۔" کہنے لگا لال دین دیال نے بی بی بسنتی کے بیاہ میں آٹا بھیجا ہے اور بدھائی بھی۔" اچھا "میں نے یونہی بات کرنے کی خاطر کہا۔ "تو پھر کیا کرو گے۔" ہنس کر اپنے دور جاتے گدھوں کے پیچھے تیزی سے بھاگتا ہوا بولا ۔ "بھاوؤ رات کی روٹی کھاؤں گا اور پھر اپنے گاؤں واپس۔ کیوں تو نے کچھ بھیجنا ہے۔" میں بنا جواب دیے لوٹ آیا اور اپنے کھیتوں کی طرف جاتے اتنے زور زور سے ہو ہو کرنے لگا کہ گلہریاں سہم کر خشک نالوں پر سے کودنے لگیں، اور کوے اور چیلیں درختوں سے پر پھڑ پھڑاتی اڑ گئیں، ڈھولک کی ہلکی ہلکی آواز اتنی دور بھی آ رہی تھی ہولے ہولے جیسے کوئی خواب میں چلتے چلتے دبے قدموں رک کر پھر چلنے لگے۔ ہوا کے رخ سے آواز آتی اور پھر تھم جاتی۔ میں نے سوچا بسنتی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری میری بہن چندر کی طرح شرما رہی ہو گی۔ کل اس کے مہندی لگے نازک پاؤں میں جھانجھریں پڑیں گی۔ چمکتے ماتھے پر ٹیکا ہو گا۔ نتھ رنگین ہونٹوں کو بار بار چومے گی، چوڑے سے اس کی گوری بانہیں

کلائیوں تک چھپی ہوں گی اور ان میں بندھے کلیرے ہوں گے۔ پھر اسے سچے کپڑے سے ڈھکی ڈولی میں بٹھایا جائے گا اور ڈولی کمہار اٹھائیں گے پھر بسنت کور جسے ہم سب پیار سے بسنتی کہتے تھے مان کھیڑے والوں کے ساتھ چلی جائے گی۔ اس گاؤں سے اس کا رشتہ بس یونہی سارہ جائے گا۔ برات آئے گی تو باجے بجیں گے۔ اس کی ڈولی پر سے آرسیاں، روپے، پیسے پھینکے جائیں گے۔ وہ موہ کی ماری مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہے گی اور دیکھ نہ سکے گی۔ پھر جب وہ مرے گی تو مان کھیڑے کے شمشان میں اس کا چاند کا جسم سفید راکھ بنے گا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے جھٹک دیے۔ سامنے سے میرا چھوٹا بھائی آرہا تھا۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگا۔ ''بھاوؤ۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ آج چانن سنگھ نے ہر گھر کا ایک آدمی مانگا ہے براتیوں کے سواگت کے لیے۔ تم جاؤ گے کہ میں چلا جاؤں۔'' میں نے کہا۔ ''تم چلے جاؤ۔'' وہ پھر کہنے لگا۔ ''تو کیا تم شام کو برات گھر روٹی کھانے نہیں آؤ گے۔ چانن نے ہمارے سارے خاندان کو بلایا ہے۔''

اور یکا یک تھکن میرے ذہن پر بادلوں کی اداسی کی طرح چھا گئی۔ میں کہیں جانا نہیں چاہتا تھا میں کسی بات کا جواب دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں بنا اس سے کچھ کہے ایک طرف کو مڑ گیا۔ سامنے سے ایشر سنگھ آرہا تھا مجھے دیکھ کر ہنسا اور بولا۔ ''کیوں گور بخش بھائی بابو کمہار کو چنگی والوں کی طرح کھڑا کر کے کیا

سوال جواب کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سارا دن جانوروں کو ہنکاتے ہم تم آدھے پنچھی بن گئے ہیں۔" "کیا کہہ رہا تھا بابو؟" میں نے جواب دیا۔ "وہ لالہ دین دیال کی طرف سے آٹا لا کر چانن کے گھر لایا ہے بسنتی بی بی کے بیاہ پر بدھائی دینے آیا ہے۔" "اچھا۔" میں نے کہا۔ "بھئی ایشر سنگھ ویسے یہ لالے دوسروں کی کھالیں اتار لیں۔ بدلحاظی کریں گے مگر کنیا کو دان بڑے کھلے دل سے دیتے ہیں۔ اب دیکھو ان پانچ گدھوں پر پندرہ من تو ہو گا نا۔ ویسے اگر لالہ دین دیال سے پندرہ پیسے مانگو تو بیاج کے بنا بات نہ کرے گا مگر سمجھتا ہے کہ بسنتی کے بیاہ میں دینے سے تو پن دان بن جائے گا۔ بس اپنی خوشی سے بھیج دیا اور بدھائی سوالگ۔"

ایشر سنگھ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ الوؤں کے چیخنے اور پرندوں کی آوازوں سے ہوا بڑی ڈراؤنی صورتوں سے بھری ہوئی لگتی تھی۔ ایشر سنگھ کے بیل پھوس کے کوٹھے کے نیچے بڑے بے چین تھے۔ بھینس کا دودھ بالٹی میں ایک طرف ڈھکا رکھا تھا۔ ایشر سنگھ بالٹی گھر پکڑانے بھی نہیں گیا تھا۔ مٹی کی انگیٹھی میں چنگاریوں کو اپلوں سے دبا دیا تھا۔ پاس کی نہر کا پانی بڑے زور سے راجباہ گر رہا تھا۔ آسمان پر غبار سے پرے پھیکے زرد رنگ کا چاند کسی نئی ودھوا

کے چہرے کی طرح بھیانک اور مایوس کن لگتا تھا۔ ہمیشہ ہنسنے، قہقہہ لگانے والا ایشر سنگھ چپ چاپ کھیس کی بکل مارے ننگی زمین پر خاموش بیٹھا تھا۔ میں کواڑ کو کھولنا اور باہر نکل کر اپنی اکیلی کٹیا میں جانا چاہتا تھا۔ ہر بار ارادہ کرتا تو منہ پر کوئی جیسے مٹھی بھر کر ریت پھینک دیتا۔ پگڑی کے پلے کو منہ پر کر کے میں نے دوسری بار کواڑ کھولنے کی کوشش کی تو ایشر سنگھ بولا۔ ”گور بخش یار بیٹھ جاؤ۔ آندھی تھم لے تو پھر چلے جانا۔“ میں نے کنڈی کو اسی طرح ہاتھ میں پکڑے پکڑے کہا۔ ”مگر میری کوٹھڑی اڑ جائے گی۔ میں تو اس کا دروازہ بھی اٹکا کر نہیں آیا۔ پھوس اڑ گیا تو نئے سرے سے مصیبت کرنی پڑے گا۔“ وہ پھر بولا۔ ”میری بات مان لے یار بیٹھ جا کوئی نہیں اٹھا کر لے جاتا تیری کُلی کو۔ واہ گرو خیر کرے۔“

میں بیٹھ گیا۔ باہر آندھی باجرے کے کھیتوں سے جنگ کر رہی تھی۔ جیسے انھیں گرا کر ہی دم لے گی۔ آندھی میں خوشبوئیں اور چیخیں ملی ہوئی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور شمشان کی راکھ تھی۔ درختوں کے مردہ پتے اور امرودوں کا شہد تھا۔ یہ آندھی ساری زندگی تھی۔ ایشر سنگھ نے اپنا منہ لپیٹ لیا اور سر کو گھٹنوں پر رکھ کر بے حس بیٹھ گیا۔ میرا دل یونہی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ بسنت کور کے بیاہ کے لیے گئے برات گھر میں جھنڈیاں اکھڑ

جائیں گی۔ دریوں پر منوں مٹی آ پڑے گی۔ لوگ کھانا کھا رہے ہوں گے اور کر کر ریت ان کے دانتوں میں آئے گی۔ اچھا ہی ہوا میں کھانے نہیں گیا۔ چندر کور کے بیاہ پر بھی آندھی آئی تھی پر ایسی زبردست نہیں پھر بھی کتنی ہوتی ہے۔ اب مان کھیڑے والے آ رہے ہوں گے اور ساری رات چانن سنگھ دریاں بچھواتا رہے گا۔ چندر اپنے گھر راضی خوشی ہے۔ اپنے بچوں میں گھری ہوئی اتنے بڑے گھر بار کو سنبھالنے والی اکیلی۔ میری وہ چھوٹی سی بہن جس کو میں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا کرتا تھا اور جس کے ہاتھ پر ایک دفعہ میں نے ایسا کاٹا تھا کہ لہو تھمتا نہ تھا۔ یہ بہنیں اور بیٹیاں ہی ساری زندگی کی خوبصورتی ہیں۔

ایشر سنگھ نے سر اوپر اٹھایا میری طرف دیکھا اور پھر اسی طرح گھٹنوں پر رکھ دیا۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ ایشر سنگھ کوئی بات کرو۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ کیسی بری رات آئی ہے۔ بیچارے چانن کی بسنتی کا بیاہ ہے اور ساری دنیا کی گرد اکٹھی ہو کر آج یہاں آ گئی ہے۔ یہ تو جمعے شاہ سے بھی زیادہ زوردار ہے بھئی۔ جیسے لال آندھی ہو۔“

”ہاں یہ لال آندھی ہی ہے۔“ اس نے اسی طرح سر کو گھٹنوں سے اٹھائے بنا کہا۔

”ایشرے بھئی میں نے تو سدا یہی سنا ہے کہ لال آندھی اس وقت آتی ہے جب کسی بے گناہ کو قتل کیا جائے۔ واہ گرو خیر کرے بیچاری بسنتی کا بیاہ خیر سکھ سے ہو جائے۔“

دور سے چیخیں سنائی دے رہی تھیں ہوا بین کر رہی تھی۔ پھر ایک آواز ان سب پر سے ہوتی ہوئی ہماری کوٹھڑی میں آئی جیسے دور بہت دور کسی نے کسی کو پکارا ہو۔ زور سے اور آخری بار کسی کا نام لیا ہو۔ سائیں سائیں کے شور، درختوں اور کھیتوں کے ملے جلے شور میں۔ پھر یہ آواز ہم سے دور چلی گئی۔ ایشر سنگھ ایک دم اٹھا جیسے کسی اور طاقت نے اسے اٹھایا ہو۔ اس کا چہرہ اس ٹمٹماتی لو میں مردے کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر بڑا ڈر لگا۔ کھیس کو اپنے گرد لپیٹ کر کچھ کہے بنا دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے تیزی سے اٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ ”کہاں چلے ہو، کہاں چلے ہو۔“ میں نے اس کے گرد اپنی باہیں لپیٹتے ہوئے ہولے ہولے کہا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ایک جھٹکا دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیتا۔ مگر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھ کر اس نے کہا۔ ”یہ آواز تم نے نہیں سنی تھی کسی نے مجھے پکارا تھا۔ مجھے جانا تھا۔“

”باہر لال آندھی چل رہی ہے اور میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔“ میں نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لال آندھی۔“ ”ہاں بیچارے چانن کا تو سارا کچھ خراب ہو گیا ہو گا۔ کاتک میں ایسی آندھی پہلے تو کبھی نہیں آئی تھی۔“

”جب کسی بے گناہ کا قتل ہوتا ہے تو ایسی آندھی ضرور آتی ہے۔ ایک بار پہلے بھی۔ ایک بار پہلے بھی آئی تھی۔۔۔۔۔“

”یہ منہ ہی منہ میں کیا کہہ رہے۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میں نے کچھ کہا ہے۔ میں کچھ بولا ہوں۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”تم نے تو ایسی کئی لال آندھیاں دیکھی ہوں گی۔ کب کی بات کر رہے ہو۔ پہلے کب آئی تھی ایسی آندھی کوئی بات کرو۔ ایشر سنگھ۔“ وہ اٹھا، اور زور زور سے کھر مارتے بیلوں کی پیٹی پر ہاتھ پھیر کر بھینس کی طرف گیا۔ اس کے سفید منہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنے منہ کے قریب کرتے ہوئے اسے چمکارنے لگا اور پیار کرنے لگا۔

باہر آندھی کے شور سے گھبرا کر میں نے پھر کہا۔ ”ہماری زندگی بھی کیا ہے۔ اس زمین کی خاطر جنگل میں بیٹھے ہیں اگر اب یہ کلی اڑ جائے تو ہم بھی اس کے

ساتھ اڑ جائیں۔ کوئی شے نہیں ٹک سکتی۔" کڑ کڑ کی آواز یوں آئی جیسے بڑ کا درخت ٹوٹ گیا ہو۔

"ٹھیک کہتے ہو زمین کی خاطر جنگل میں بیٹھے ہیں۔" ایشر سنگھ نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ "گور بخش سنگھ زمین کی محبت عورت کی محبت سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ عورت کے پیچھے دیوانے بنو تو وہ اور کچھ نہ دے ایک میٹھی نظر سے تو دیکھ لیتی ہے نا۔ جسے تم ساری عمر یاد رکھ سکو۔ پر زمین ایسی ہیر ہے جو کبھی رانجھے کو جوگی کے بھیس میں دیکھ لے تو اسے ملے گی ہی نہیں اس کی طرف دیکھے گی ہی نہیں۔"

"تم نے کبھی عورت سے محبت کی ہے ایشر سنگھ؟" میں نے باتیں کرنے کی خاطر اس سے پوچھا۔

"ہاں گور بخش سنگھ۔"

"کون تھی وہ ایشر سنگھ۔"

وہ بھینس کے چمکیلے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے یادوں کی لہروں میں بہہ گیا ہو کہنے لگا۔ "تھی ایک۔ بڑی ہی ظالم، بڑی ہی ظالم، بڑی ہی ظالم۔ اتنی سخت، اتنی سخت کہ میں آج تک اس کے لیے دیوانہ ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ سارا کچھ، زندگی کی ساری دولت دل کا امن چین، سارا اس کے لیے

بھینٹ کر دیا۔ میں جب بہت چھوٹا تھا اور باپو کی انگلی پکڑ کر پھرا کرتا تھا تب سے اس کے پھندے میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس کی خوشبو مجھے ان دنوں بھی پاگل کر دیتی تھی۔ گور بخش سنگھ بھئی وہ خوشبو اس کی میٹھی نظر سے بھی بڑھ کر تھی۔ مست کرنے۔ ہوش حواس چھین لینے والی۔"

"اس کا نام کیا تھا، وہ اب کہاں رہتی ہے؟"

اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "گھبراتے کیوں ہو نام بھی بتا دوں گا۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا اس کی چاہت میری رگوں میں دیوانگی بن کر تیرنے لگی۔ اس کی چاہت جیتنے کے لیے، اس کے پیار کے ایک بول کے لیے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ جب میں کھیتوں میں ہل چلا رہا ہوتا تو میری سانس تیز چلنے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ درختوں کی اوٹ میں کھڑی مجھے جھانک رہی ہے۔ اس کے بالوں سے وہی خوشبو نکلتی ہوئی اس کا جسم خوشبو سے مہکتا ہوا۔ اتنی نازک کہ لگتا چلے گی تو گر جائے گی، اپنے مہندی لگے ہاتھوں کی پوروں سے درخت کو تھامے ہوئے وہ چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی اور میں اپنی نظریں ہل کی پھالی پر لگائے پسینے میں بھیگا بیلوں کو زور زور سے ہانکنے لگتا۔" پھر تم کیسے کہتے ہو کہ وہ ظالم تھی۔ اس نے تمھاری طرف کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو تم کہتے ہو

تمھارے پیچھے آتی تھی اور تمھیں چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی۔" میں نے تیزی سے کہا۔ میری یاد میں پنگھٹ گھوم گیا۔

ایشر سنگھ بولا۔ "اس کا عشق بھوت کی طرح مجھ پر روز بروز چھاتا گیا میں یہ محسوس کرنے کے لیے کہ اس کی نگاہیں درختوں کی اوٹ میں سے میری طرف لگی ہیں۔ سارا وقت کھیتوں پر رہنے اور پوری طاقت سے کام کرنے لگا۔ باپو کہتا تیری مت ماری گئی ہے۔ جوان ساری دنیا ہی گاہنے بونے کا کام کرتی ہے تو عجیب ہے۔ چاہتا ہے کہ کھائے پیئے بنا ہی کھیتوں پر ہی گزارے۔ لوگ باقی دھندے بھی تو کرتے ہیں۔ ہولے ہولے میری اس بات کا چرچا ہونے لگا کہ مجھے کوئی سایہ ہے۔ میرے سر پر ایک جن ہے اور اس لیے دن رات کام کرنے کے باوجود میں تھکتا نہیں ہوں۔ میں من ہی من نہیں دیتا۔ بس ایک بار درختوں کی اوٹ سے چھپ کر دیکھنے والی کی نظریں میری نظروں سے مل جائیں۔ بس اس کی خوشبو سارا وقت میرے گرد تیرتی رہتی۔ کبھی کبھار اس کے قدموں کی چاپ مجھے اپنے اس قدر قریب لگتی کہ اگر میں گھوم کر کھڑا ہو جاؤں تو اس سے آنکھیں چار کر سکوں گا پر یہ ڈر کہ کہیں ایسا کرنے سے وہ روٹھ کر نہ چلی جائے مجھے پیچھے مڑنے سے باز رکھتا۔ میری اس حالت سے پریشان ہو کر باپو نے چانن کے باپ سے بھی پہلے میرا بیاہ کر دیا۔"

"اچھا تو چانن کا باپ تم سے بڑا تھا۔"

"مہر سنگھ جب پیدا ہوا ہے تو میں بہت خوش ہوا۔ باپو نے سارے گاؤں میں لڈو بانٹے۔ سوا مہینے تک ماں نے ڈھولکی بجوائی۔ جیسے آنند منگل ہوا ہو۔ یہی دن تھے ایسی ہی نمی نمی سردی تھی۔ خوشیاں سب طرف جیسے ان کی بارش ہو رہی ہو۔ ان دنوں چانن کا باپ کھیتوں کی رکھوالی کیا کرتا۔ میں گھر پر رہتا یا چارہ لے جاتا اور یا ڈیوڑھی میں لمبی تان کر سویا کرتا۔ ساری محبتیں میرے جی سے نکل گئیں۔ مجھے خوشبو کا کوئی انتظار نہ رہا۔

"کٹائی کے دن آ گئے ۔ میں سب سے زیادہ کام کرتا۔ سارے بھائی خوشی خوشی، جیسے ہم سے زیادہ خوش کوئی نہ ہو، گاتے بجاتے کام کرتے رہتے۔ پھر ایک رات میں نے اسے سپنے میں دیکھا۔ بڑی اداس، اپنے چہرے کو مجھ سے چھپائے ہوئے ہے۔ ننگے پاؤں درخت کی اوٹ میں کھڑی ہے۔ میں نے پاس ہو کر اس کے پاؤں کھینچ لیے اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"تیسرے بھائی کا بیاہ ہوا ہے تو دو مہینوں بعد باپو اچانک مر گیا۔ اور ہم تینوں نے کھیت بانٹ لیے اور اس کی چاہت نے مجھے اور زیادہ دیوانہ بنا دیا۔

"وہ کون تھی ایشر سنگھ۔ وہ تیرے پیچھے کیسے پھر سکتی تھی۔ گاؤں میں اس کو روکنے والا کوئی نہ تھا کیا؟" میں نے اس عورت کے لیے جی میں گویا سخت غصہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اور اس نے میری بات ان سنی کر کے کہا۔ "مہر سنگھ بڑا ہو گیا تو وہ بھی میری اس حالت پر ہنسنے لگا۔ لوگوں کے لیے یہ بات تو بس اب اتنی عام سی ہو گئی تھی کہ میں دن رات کام کرتا ہوں اور نیند اور تھکن مجھے ملی ہی نہیں، میں کبھی نہیں تھکتا۔ مہر سنگھ اور میں مل کر کام کرتے۔ وہ میرے بازو برابر میرا سہارا تھا۔ مجھ سے بھی اونچا اور بڑا۔ چلتا تو زمین دہلتی۔ اس کی ماں نے دودھ ملائی کھلا کھلا کر پالا تھا اسے۔ کیس کھولتا تو جیسے گھٹا چھا گئی ہو۔ ہنستا تو من موہ لیتا۔ وہ میرے پاس ہوتا تو میں درخت کے پیچھے اس کی آنکھوں سے بھی بے پرواہ ہو جاتا۔

"میرے تیسرے بھائی کے لڑکے بڑے جھگڑالو ہیں اور بڑے ہی ظالم ہیں۔ ذرا اونچے ہوئے ہوش سنبھالا ہے تو مہر سنگھ سے الجھنے لگے ہماری خوشیوں میں جیسے کسی نے سوراخ کر دیا ہو۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑا ہو جاتا کھیتوں کو پانی دینے پر۔ درختوں پر جو منڈیروں کے اوپر اگے ہوئے تھے۔ یونہی۔ بات بے بات۔ وہ لڑنے لگتے مجھے تو کچھ نہ کہتے مگر مہر سنگھ کو للکارتے۔ سارا وقت

لاٹھیوں کے سروں پر بلم تیز کرواتے اور اسے چڑانے کے لیے ہنستے رہتے لوگوں نے ان کی صلح کروانے کی کوشش کی تو جھگڑا اور بڑھ گیا۔ مہر سنگھ بڑا ہی سنجیدہ تھا اور بڑا ہی دھیرج والا۔ بالکل باپو کی طرح کا۔ ان دنوں ماں بھی زندہ تھی۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ بال نوچے۔ چانن کے باپ کو میرے بڑے بھائی کو گالیاں دیں۔ مگر بس یونہی بات بڑھتی گئی۔ اصل میں اسے مہر سنگھ سے بڑا پیار تھا۔ جیسے وہ اس کا سگا اور باقی سوتیلے پوتے ہوں۔ بوڑھی عورت تھی کھلم کھلا کہتی کہ کوئی بھی اسے مہر سنگھ کی طرح پیارا نہیں۔ یہ سارے جھگڑے اصل میں اس پیار نے پیدا کیے تھے۔ پیار بڑی ظالم شے ہے جوان!

"اور پھر ایک رات آئی۔ ایسی ہی ظالم اور خوفناک رات تھی۔ کھیتوں کو پانی لگانے کے وقت نہ جانے مجھے نیند کیوں آ گئی۔ مہر سنگھ مجھے سوتا چھوڑ کر اکیلا ہی چلا گیا۔ اس دن اس نے اپنی کیسری پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ اچل کے میلے سے واپس آیا تھا۔ اس کے سرہانے موتیے کے ہار بھی پڑے تھے۔ اس کی چارپائی کے پائے کے ساتھ لٹکتے ہوئے جو وہ میلے سے لایا تھا۔ اس کی دادی نے اس سے پہلے دن اس کے کیس دھوئے تھے اور ان میں اپنے ہاتھ سے تیل لگایا تھا۔ میں اٹھا ہوں تو میری بیوی کہنے لگی مہر سنگھ پانی لگانے چلا گیا ہے۔ کہتا تھا باپو

اٹھے تو اسے کہنا میں اکیلا ہی کام کر لوں گا۔ میں ذرا سا لیٹا ہوں تو آندھی آ گئی۔ لال آندھی۔ ہمارے صحن میں پیپل کا درخت کڑ کڑ کر کے ایک دم گر گیا۔ جیسے کسی نے اس کی جڑ پر چھری پھیر دی ہو۔ کوٹھے کی چھت ہل گئی۔ میری بوڑھی ماں بے قرار تھی کہنے لگی۔ ایشر سنگھ وے ایشر سنگھ جا تو بھی جا مہر سنگھ اکیلا ہی چلا گیا ہے۔

کتنی کالی بولی اندھیری ہے کتنی لال ہے توبہ توبہ کرتار چنگی کرے۔ واہ گرو خیر کرے۔ وہ زور زور سے شبد پڑھنے لگی۔ میرے پاؤں اکھڑ رہے تھے زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ گلیوں گلیوں میں تو دیواروں کا سہارا لے کر چلتا رہا مگر کھلی جگہ میں چلنا ناممکن ہو گیا۔ میں لیٹ کر، بیٹھ کر آگے جانا چاہتا تھا مگر دنیا کی ساری طاقتیں دیو بن کر مجھے پیچھے دھکیل دیتیں۔ ہوا میں چیخیں تھیں، الوؤں کی، جیسے ساری دنیا اجڑ گئی ہو۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ درخت گر رہے تھے۔ کوٹھوں پر رکھی پنچھٹی کے ڈھیر تنکوں کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ نہ جانے کیسی کیسی چیزیں میری راہ میں کھڑی تھیں جیسے پتھروں اور کانٹوں سے میری راہ بند ہو گئی ہو۔ پھر میں نے ایک چیخ سنی تھی۔ بہت دور سے آتی ہوئی۔ ایک دردناک چیخ۔ جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے بھاگنا چاہا تو کوئی شے میرے پاؤں سے الجھ گئی۔ میں بہت زور سے گرا۔ میرا سر پھٹ گیا۔ خون اور آندھی

کی گرد میرے چہرے پر مل گئی۔ اس رات ساری دنیا میرے خلاف تھی۔ مجھے نہ جانے کن ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔ میرا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھ سکتا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر جلدی سے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا۔ مہر سنگھ واپس نہیں آیا۔ ظالموں نے ریت ڈال کر اس کا گلا بند کر دیا تھا۔ اسے سوگے میں دھکیل دیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے ہوں گے۔ میرا مہر سنگھ ایک دو کے قابو میں آنے والا تو نہیں تھا اور پھر دوسری صبح نہر پر جھکے ہوئے سب سے اونچے درخت کی ایک موٹی سی شاخ سے اسی کیسری پگڑی کے ساتھ مہر سنگھ لٹک رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اس کی لاش یوں آگے پیچھے ڈولتی تھی جیسے وہ پلنگ پر چڑھا ہولے ہولے مزے میں جھونٹے لے رہا ہو جب اسے وہاں سے اتار کر گھر لایا گیا ہے تو دس گاؤں کے آدمی بوڑھے جوان عورتیں بچے اس کی برات کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس کی دادی کہا کرتی تھی کہ وہ تو کسی مہاراجہ کی بیٹی سے بیاہ کرے گا۔ مہر سنگھ کا بیاہ سب سے طاقتور مہاراجہ اوی ناشی کی بیٹی سے ہوا تھا جس کا حسن کسی نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

مہر سنگھ کی ماں اور میری ماں نے مجھے بہت بہت کہا کہ میں مقدمہ کروں اور ساری دولت لگا کر اس کی موت کا بدلہ لوں اور تب بھی وہی سوانی مجھے سپنے میں دکھائی دی۔ اس نے کہا میرا تمھارا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ گہرا اور پرانا۔ تمھاری ہڈیوں کے گودے میں میرا عشق ہے تمھاری گود میں میری خوشبو ہے۔ چھٹپنے سے آج تک تم میری محبت میں گرفتار رہے کیا اب مجھے چھوڑ جاؤ گے۔ مجھے دوسروں کے حوالے کر دوگے؟ کیا ان درختوں کو دوسروں کے حوالے چھوڑ دوگے جن کی اوٹ میں تم نے مجھے کھڑے دیکھا ہے۔ میری مہندی لگی پوریں کیا تم بھلا دوگے۔ مہر سنگھ واپس نہیں آسکتا۔ ساری دنیا کو بھی بیچ دو مگر اسے تم پھر سے بلا نہیں سکتے۔ اس ظالم کی محبت مہر سنگھ کے پیار سے جیت گئی۔ رتیں آئی ہیں رتیں گئی ہیں۔ گور بخش سنگھ، پر اس ہیر نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ سوچو تو سہی اگر میں پاگل نہ ہوتا تو مہر سنگھ کا بدلہ دستور کے مطابق ضرور لیتا۔ اپنے بڑے بھائی کے بیٹوں کو پھانسی پر چڑھواتا ان کی لاشیں بھی ہولے ہولے جھونٹے لیتیں۔ ان کی براتیں بھی مہر سنگھ کی طرح گاؤں میں آتیں پر اس سے فائدہ کیا ہوتا گور بخش سنگھ بیٹے اس سے کیا ملتا؟

اس کے منہ سے آج پہلی بار میں نے بیٹے کا لفظ سنا تھا۔

"یہ پیار زہر بن کر ساری زندگی میری رگوں میں چلتا رہا۔ اگر میں اس پیار کو بھلا سکتا۔ اگر سپنوں میں وہ صورت مجھے دکھائی نہ دیا کرتی تو چانن سنگھ کی بسنتی کے بیاہ پر آج اتنی رونق نہ ہوتی۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں لوگ میں دیوانہ ہوں میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ پھر وہ جس کی محبت نے جس کی چاہت نے مجھے ایسا بنا دیا ہے آج بھی جوان ہے وہ صدیوں سے جوان ہے وہ سدا ایسی تھی وہ ایسی ہی رہے گی اور اس کو چاہنے سے بھی مجھے کیا ملا ہے بھاوؤ۔ سردیاں گرمیاں، برساتیں، آندھیاں میں نے بنا آرام گزار دی ہیں کہ اس تھوڑی سی سکھان کو جو بس اوٹ سے بدلی کے پیچھے چھپے چاند کی طرح تھی اپنے لیے محسوس کر سکوں۔ ہم سارے اس کے عشق میں مبتلا ہیں کوئی کم اور کوئی زیادہ۔ تم بھی گور بخش بیٹے تم بھی نہ جاننے کے باوجود اسے چاہتے ہو ورنہ ایسی لال آندھی میں یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔

وہ بہت دیر چپ رہا۔ اور پھر بولا مگر آج اس گھڑی ابھی میں نے فیصلہ کیا ہے میں اس پیار کو اپنے دل سے نکال دوں گا۔ بالکل وہ اتنے زور سے ہنسا کہ میں ڈر گیا۔ اپنا پسینہ گراؤ، اپنا خون گراؤ۔ اپنی زندگی برباد کرو۔ سارا کچھ تج دو۔ آخر میں کیا ملتا ہے۔ مہر سنگھ جیسا بیٹا بھی دے دو اور کیا ملتا ہے۔ اس پیار سے کیا ملتا ہے۔ موٹے کھدر کے کرتے۔ پیروں کی بوائیاں پھٹی ہوئی۔ لال آندھی

اور پھر جس کی چاہت میں سارا تن من لگایا وہ بھی سب سے ایسی ایک سی گھلاوٹ سے باتیں کرنے والی۔ سدا سے جوان اور سخت ظالم۔ کسی سے نظریں نہ ملانے والی کٹھور۔ درختوں کی اوٹ میں سے جھانکنے والی مگر کسی سے نباہ نہ کرنے والی۔ وہ نہ کسی کی ماں ہے اور نہ کسی کی بیٹی، نہ کسی کی بہن ہے اور نہ کسی کی بیوی۔ میں نے ساری عمر اپنے پیچھے اس کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ ہمیشہ اس کی خوشبو کو پکڑنا چاہا ہے پر وہ آواز کی طرح کبھی کسی کے قابو میں نہیں آ سکی۔

آندھی تھم چکی تھی۔ ہوا میں پہلی سی تیزی نہ تھی، ایشر سنگھ کی بیوی باہر کھڑی کہہ رہی تھی۔ "اس سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ گھر ذرا دودھ کی بالٹی ہی پکڑا جائے۔" میں نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ گئی۔ سر پر لسی کا دوہنا اٹھائے چنگیز میں روٹیاں اوپر دھری ہوئی تھیں۔ اور جلدی جلدی کہنے لگی۔ "چانن کی بیوی ابھی آئی تھی کہتی تھی پچھلے جھگڑوں پر اب مٹی ڈالو۔ کنیا کنواری تو سارے گاؤں کی ہوتی ہے بسنتی کے بیاہ پر آؤ۔ برات آنے والی ہے مجھے فرصت نہ ملی تھی ورنہ میں پہلے ضرور آتی۔ اپنوں سے غصہ کیسا جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میں کہتی ہوں اب کیا صلاح ہے۔" وہ چپ ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ "ہم کونسے زندہ ہیں اگر وہ ہمیں غصے ہی رہنے دیتے نہ مناتے تو

کیا تھا۔ کونسی ہمارے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے کہ انھیں نہ بلا کر ہم بدلہ اتار سکتے۔ کیوں پتر ابات ٹھیک ہے نا۔" وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"ہاں میں کہتا ہوں چلے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

میں بسنتی کے بیاہ پر نہ بھی جاتا تو بھی اسے کنیا دان تو دیتا ہی نا۔ سارے قبیلے کی بیٹی ہے پھر میں تو اس کا دادا لگتا ہوں۔

"کیا صلاح کی ہے تو نے" دینے کی بیوی نے پوچھا۔

"سن بھگوان" اس نے اسی طرح انگوٹھے اور انگلی کو اٹھا کر ہوا میں لہرایا اور آنکھوں کو زیادہ کھول کر کہنے لگا۔ "یہ زمین نہ تیرے کسی کام کی ہے اور نہ میرے۔ نہ میرے بعد میرے پوتے ہیں اور نہ تیری پوتیاں۔ اپنی زندگی کا کیا ہے ساری بیت گئی اب کس لیے اس کو سینے سے لگائے رکھیں۔ کیوں نہ یہ کھیت کنیا دان میں بسنتی کو دے دیں۔ تیری کیا مرضی ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی۔ "پہلے تو روٹی کھا لے۔ اگر تجھے بسنتی کو یہ ساری زمین دینی ہی ہے تو مجھے کیا کہنا ہے۔ ٹوٹی ہوئی برادری سے میل کرنا ہو تو اس طرح سہی۔"

وہ خاموشی سے روٹی کھاتا رہا اس کی سفید بھنویں اور سفید داڑھی ہولے ہولے ڈول رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا وہ دونوں ابھی جوان ہیں۔ ان کے دلوں میں

دکھ سکھ کو سہنے اور دوسروں کو معاف کر دینے کی کتنی طاقت ہے کتنی زندگی ہے۔

برتن سمیٹ کر دودھ کی بالٹی لیے چاچی واپس چلی گئی۔ باہر چاندنی پھیلی تھی۔ ایشر سنگھ کھیت کے کنارے ہو ہو کر چلتا گیا اور پھر دور پرے اس کی آواز سنائی دی۔

"ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ بولیں تے کون وچھڑے یار ملاوندا ای۔"

گوشۂ بساط

نہروں والے علی وال سے گاؤں کی طرف گھومیے تو کچے سرکنڈوں کی
دیواروں سے محفوظ راستہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک تو چوہڑوں کی پتی
سے ہو کر جولاہوں کے وہڑے کی طرف اور دوسرا مولوی محمد کی حویلی کے
سامنے سے ہو کر لمبرداروں کی پتی کو، جدھر ڈاک خانہ اور مدرسہ ہے اس
طرف کو چھوڑ کر باقی سب طرف ڈھاب ہے۔ جس نے نئے چاند کی کمان کی
طرح گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔ مولے وال کوئی بستی نہیں ہے، بس ایک اونچے
تھیہ کے ساتھ کئی چھوٹے ٹیلوں اور ایک خشک نالے کے مٹتے نشانوں کا نام
ہے۔ ہمارے گاؤں سے اتنا نزدیک کہ چاندنی راتوں کو سارے گاؤں کی
مٹیاریں یہاں بلا خوف آتی ہیں اور دائرے بنا کر ناچتی ہیں گاتی ہیں، باتیں کرتی
ہیں۔ ناچتے ناچتے ان کی لمبی چوٹیاں کھل جاتی ہیں۔ اور جب وہ بہت زور سے
ہنستی ہیں، تو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں۔ "شاداں، بالاں، ہروئی، سکھو، ایشری تم
کو ہوش نہیں کیا ہی ہی لگا رکھی ہے۔ تھیہ کے اتنا قریب ہو کر بھی زور زور سے

قہقہے لگاتی ہو۔ رب کا نام لو۔ موت کو یاد کرو۔" اور ذراہٹ کر بابو کے باغ سے پرلی طرف لڑکیاں قبرستان اور شمشان کو دیکھنے لگتی ہیں۔ پھر یہ گھڑی دو گھڑی کی رونق ہولے ہولے کم ہونے لگتی ہے۔ گاؤں کی بہو بیٹیاں، مائیں سب اپنے گھروں کو واپس چلی جاتی ہیں۔ اور سونی راہوں پر سانپ پھرتے ہیں یا باہر والے غول کے غول تماشے کرتے، شور مچاتے، لڑکیوں کے ناچ کی نقل کرتے، تھیہ اور مولے وال پر گھومتے ہیں اور صبح مرغ کی اذان تک یہ ٹیلے پھر اسی طرح ویران ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں یہاں پہلے ایک گاؤں تھا، بھرا پرا آباد اور خوش حال پھر نہ جانے کیا بات ہوئی رات رات میں ساری بستی مٹ گئی۔ زمین ٹیلے بن گئی، گاؤں غرق ہو گیا۔ سنا ہے یہاں ایک کنوئیں میں مولوی صاحب نے اپنے جلال اور طاقت کے زور سے ایک جن قید کر رکھا تھا، اتفاق کی بات ہے ایک دن وہ باوضو نہیں تھے اور کہیں جارہے تھے۔ جن کی ڈوری ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تو تھا ہی۔ اس نے ساری بستی الٹ دی، یوں آنکھ جھپکتے میں جیسے جوان بلم گھماتے ہیں۔

اب مولوی صمد کی حویلی بھی سنسان ہے، پیپلوں والی مسجد بھی ویران ہے، لمبر داروں کی پتی کے لوگ مدرسے کے کنوئیں سے پانی لاتے ہیں اور کوئی مسجد کے کنوئیں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ برسات کے دنوں میں جب ڈھاپ

بڑھ کر ان دو لکڑیوں کو چھونے لگتی ہے جو حویلی کے عین سامنے والی نالی کی حد بندی کو رکھی گئی تھیں تو یہ کنواں بالکل بھر جاتا ہے۔ ان دنوں دلاور علی کے شکاری کتے اس گھر کی پکی بیٹھکوں میں بندھے ہوتے ہیں، اور اونچے دالان کے ساتھ چمٹی عشق پیچاں کی جھاڑ جھنکار بڑی سر سبز دکھائی دیتی ہے۔ اس میں کاسنی رنگ کے اتنے پھول کھلتے ہیں کہ سبز پتیاں چھپ جاتی ہیں۔ ساری رونق جو اس گلی کے راستے بہتی تھی منجمد ہو کر عشق پیچاں کی بیل کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس بیل نے پھیل کر اب چھت پر بھی اپنے پاؤں جما لیے ہیں۔ بیتے ہوئے سال جو ہولے ہولے بڈھوں کی طرح لاٹھی ٹیکتے اس حویلی میں آ ٹکے ہیں، یوں نہ ٹکتے تو بہن جی آج بھی دالان کے باہر کھڑی ہو کر مولوی جی سے کہتیں۔ ”جی میں نے کہا کسی کو بلا کر اس بیل تو تو ٹھیک کراؤ۔ عرس کے دن نزدیک ہیں۔ مجھے سو دھندے ہیں آخر ہر طرف میں کیسے دھیان کروں؟ آپ باہر بیٹھک میں بیٹھے ان نکمے مریدوں سے کیا الجھتے رہتے ہیں، کبھی گھر کی خبر بھی لیا کریں۔“ اور مولوی صاحب جلدی جلدی وضو کے آخری دور میں سے گزرتے لوٹے کو دالان میں رکھتے ہوئے کہتے۔ ”نیک بخت تجھے میرے مریدوں سے کیوں خدا واسطے کا بیر ہے ان میں سے کسی کو حکم دے تو وہ ہمارے پسینے کی جگہ اپنا خون بہا دے۔ اس بیل کی کیا بات ہے کہے تو باہر کے

سارے پیپل ایک دم کٹوا دوں۔" اور بہن جی خفا ہو کر دالان میں بچھے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ جاتیں۔ جیسے یہ بات انھوں نے کہی ہی نہ ہو۔ عینک نکال کر اپنی اونچی ناک کے سرے رکھ کر، کمانیوں کو دو تین بار کانوں کے پاس جماتیں اور "قبر کے عذاب" کا صفحہ نکال کر پاس بیٹھی شاگردوں سے کہتیں "چل لڑکی تو سبق سنا ان کی تو باتیں ہی ختم نہیں ہوں گی۔" مگر آج حویلی ویران ہے اور وہ گدی جس کے لیے عائشہ بی بی نے اتنا کچھ کیا تھا اس گاؤں کے پیروں کا گھر مٹ چکا ہے اور حویلی میں دلاور علی کے شکاری کتے بندھتے ہیں۔

بہن جی گدی والے سیدوں کی بڑی بیٹی تھی۔ سید صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی اسی لیے انھوں نے اپنے بعد اپنے بڑے داماد مولوی صمد کو اس گدی کا جائز وارث قرار دے دیا۔ ان کے ہوتے ہی بہن جی اور مولوی جی نے یہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی سیدانی اللہ بخشے بڑے دل والی تھیں۔ سارا گھر ان سے دبتا اور ڈرتا تھا۔ ہم نے انھیں گاؤں میں کسی کے گھر جاتے کیا کبھی ڈیوڑھی تک آتے نہ سنا۔ مگر گاؤں کے کسی گھر میں بیاہ ہو اور سیدوں کے گھر سے لڑکی کے لیے جوڑا اور بہو کے لیے سلامی کے لیے روپے نہ آئیں ناممکن۔ کسی کو روپے پیسے کی ضرورت ہو بے کھٹکے ان کا دروازہ جا کھٹکاؤ، بی بی جی کسی کو خالی ہاتھ نہ پھیرتیں۔ گاؤں میں ساس بہوؤں کی لڑائیاں ہو جائیں تو معاملہ ان تک

پہنچتا، وہ گاؤں کی بادشاہ تھیں۔ دھان پان نازک سی عورت، ان سے باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا جیسے کوئی بڑی خوبصورت کہانی سن رہے ہوں۔ ماں نے بتایا تھا کہ میرا نام بھی بی بی جی نے رکھا تھا۔ انھوں نے مجھے گود میں لے کر کہا تھا " یہ لڑکا بھاگوان ہو گا، اور پھر کہا تھا کیوں لڑکی اس کو یہ کہہ کر کیوں نہ پکارا جائے بھلا!" بی بی جی کسی کا نام رکھیں اور بچے والے کو خوشی نہ ہو۔ پھر جب میں بڑا ہو گیا، پاؤں چلنے لگا تو ماں مجھے ان کے ہاں لے گئی۔ بی بی جی نے مجھے گود میں لیا تھا اور پیار سے کہا تھا کیوں میاں کیا کھاؤ گے اور میں سرخ چڑیوں کے ایک پنجرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ پھر وہ سرخ ننھی منی چڑیوں سے بھرا پنجرہ میرے پاس بہت دنوں رہا۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تب بھی وہ پنجرہ میرے پاس تھا۔ بی بی جی پان بہت کھاتی تھیں۔ پان دان پاس رکھا ہے، ہاتھ میں سروتہ ہے، باتیں کرتی جاتی اور چھالیا کترتیں۔ میں پاس پڑی پیڑھی پر بیٹھا سوچا کرتا، یہ اتنا تیزی سے قینچی کیسے چلاتی ہیں۔ کیا ان کے ہاتھ نہیں کٹتے۔ ملنے والیوں کو پان کبھی نہیں دیتیں۔ کہتیں " بی بی یہ بد عادت مجھے تو یونہی پڑ گئی۔ بارہ میل دور شہر ہے پان منگوانے میں بہت مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ کوئی اچھی شے تو ہے نہیں کہ تم لوگ بھی اسے چکھو۔" حویلی ہر وقت عورتوں، لڑکیوں، ننھی منی شاگردوں سے بھری رہتی۔ اور باہر مردانے میں

سید صاحب کے پاس دور دور سے آنے والے مردوں، عقیدت مندوں اور فارسی، عربی کے سبق پڑھنے کا ہجوم رہتا۔ جو شخص بھی دوپہر کے کھانے تک بیٹھتا سید صاحب اسے کھانے میں ضرور شریک کرتے۔ کہتے "میاں میرا کیا ہے اللہ کا دیا ہے تم بھی شامل ہو جاؤ۔" اور حویلی کے اندر کھانے کا کوئی اتنا اہتمام بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ بڑی روانی سے وقت پر کام ہو رہا ہے۔ کوئی نوکروں چاکروں، اوپر کا کام دھندا کرنے والوں کی بھرمار نہ ہوتی۔ شاگرد لڑکیاں پڑھ کر منٹوں میں ہنڈیا چولھا کر دیتیں۔ یہ صرف برکت ہی ہوتی ہو گی۔ ورنہ اب سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ سید صاحب کے پاس چالیس آدمی بیٹھے ہیں، سیر ہو کر کھانا کھا رہے ہوں اور اندر یوں ہے جیسے بس گھر کے لوگوں کا کھانا پکا ہو۔

عائشہ بی بی بھی میری ہم عمر ہی ہوں گی۔ مگر بلا کی شوخ اور طرار تھیں۔ بی بی جی کہتیں عائشہ سر پر دوپٹہ رکھا کرو تو وہ اتار کر پھینک دیتیں، زمین پر لوٹ جاتیں، جب ذرا بڑی ہوئیں تو حویلی کی ریت کے عین خلاف بڑی بڑی کھلی چھتوں پر کدکڑے لگاتیں اور بی بی جی کے پان دان سے پان چرا کر خوب کھاتیں۔ بڑی بہن بی جتنی حلیم الطبع اور غریب طبیعت تھیں، عائشہ اتنی ہی آفت تھیں۔ بی بی جی سے کہتیں ہمیں یہ قید خانہ اچھا نہیں لگتا ماں۔ چندو کی

آوی تک جانے کی اجازت دے دیں۔ اپنا سبق دھیان لگا کر نہ پڑھتیں اور بڑی بہن جی کی کتابیں پھاڑ دیتیں۔ یونہی موج میں آ کر ان کے دو ہتڑ لگا دیتیں، چٹیا کھینچ کھینچ لیتیں۔ ان دنوں میں نے بی بی جی کو سخت فکر مند اور پریشان دیکھا ہے۔ ان کی پیشانی پر شکن ہوتے۔ سروتہ ہاتھ سے رکھ دیتیں، اور پھر اندر کوٹھڑی میں جا کر بڑے بڑے صندوق کھول کر الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیتیں۔ جب میں ہائی اسکول پاس کر کے ماں کے ساتھ علی وال سے سرکنڈوں والے راستے گاؤں آیا تو میں نے سنا عائشہ بی بی کی شادی ہے۔ اور پھر عائشہ بی بی بیاہ کر کوئی دس شہر پرے اپنے سسرال چلی گئیں۔

مولوی صمد جوان ہی تھے جب گھر داماد ہو کر سید صاحب کے ہاں آئے تھے۔ میں گاؤں آتا تو بچپن سے سیکھے ادب آداب کے مطابق حویلی میں حاضری دینے ضرور جاتا۔ بی بی جی مجھے اندر بلا لیتیں، دعا دے کر پاس چارپائی پر بٹھا لیتیں اور خیر خیریت دریافت کرتیں۔ گاؤں میں صرف ہمارے بوڑھے نانا رہ گئے تھے جن کا سید صاحب سے بہت دوستانہ تھا۔ آہ بھر کر کہتیں۔ ”میاں مقدر کی بات ہے تمھارے ننھال کو آباد کرنے کے لیے کوئی نہ ہوا، اور ہمارے لیے بھی خدا نے داماد کو آسرا بنا دیا۔“ مولوی صمد کو میں نے گھر میں کبھی نہیں دیکھا۔ سید صاحب کے پاس بیٹھک میں رہتے اور قرآن کا درس دیا

کرتے تھے۔ ان کے آنے سے دور دور کے گاؤں سے بھی لوگ درس سننے پکی مسجد میں آنے لگے۔ ان دنوں پیپلوں کے سایے میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ مسجد کے پرلی طرف بھی حجرے تھے جن میں مسافر اور دور دور سے طالب علم آ کر ٹھہرتے۔ نہ جانے صحن کے پکا ہو جانے پر بھی اس کا نام کچی مسجد ہی کیوں رہا۔ نمازیوں کی بھیڑ رہتی۔ خدا بخش لمبر دار جس کو لوگ چھٹا ہوا بد معاش سمجھتے تھے مولوی صمد کے پاس آنے لگا۔ ہولے ہولے اس نے داڑھی بھی رکھ لی اور پانچوں وقت مسجد میں حاضر ہوتا۔ کیسر سنار جس کی نیچی گلی میں اداس کن دکان تھی پیپل کے نیچے آ بیٹھتا۔ گرمیوں میں گاؤں سے بچے آ کر ان درختوں کے نیچے کھیلتے۔ عجیب نور برسا کرتا تھا۔

میں مزید تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا۔ زندگی کتنی تیزی سے گزرتی ہے اور زمانے کی ریت کیسے ہولے ہولے ماضی میں گھلتی جاتی ہے۔ واپس آیا تو نہروں والے علی وال سے کچے راستے پر چلتا سوچ رہا تھا نہ جانے گاؤں کتنا بدل گیا ہو گا۔ دلاور علی جس کو ہم سب ماما جی کہتے تھے کیسا ہو گا۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی میں نے یہی سوچا تھا۔ جب یورپ میں تھا تو شہروں کے شور و شغب سے دور کھلے کھیتوں کی سرسبزی اپنے گاؤں کی یاد دلایا کرتی تھی۔ مجھے ایشر سنار کی دکان یاد آجاتی تھی جس کے چبوترے پر چڑھ کر میں ایک دفعہ بھینس

کے سینگوں سے بچا تھا۔ اپنے گھر کے پچھواڑے میں ہر دلی کا گھر یاد آتا جس میں اس کی ساس کا بھوت ٹاہلی کے درخت پر رہتا تھا اور وقت بے وقت اسے تنگ کرتا تھا۔ پھر بچپن کے وہ دن آتے ہیں جب کوٹھوں ہی کوٹھوں ہم دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ منشی کھوجے کا چندھی آنکھوں والا باپ مجھے کبھی نہیں بھولا جو گندم اور روٹی کے بدلے گاؤں کی مٹیاروں کو تیل، صابن اور مکھانے دے کر ان پر احسان کیا کرتا تھا اور پھر منشی کھوجا جس نے دو تین سالوں میں ہی اپنا پکا مکان بنالیا تھا، اور منشی کے چندھی آنکھوں والے بچوں کی ایک پلٹن، پھر بابو کی لڑاکا اور بہت تیز عورت جس کے ہاں سے دودھ چرا کر پیا کرتے تھے اور جو دوپٹہ پھیلا پھیلا کر ہر روز کوسا کرتی تھی۔ اور ماں مادو جو نانی کی بہت سہیلی تھی۔ صبح ہی صبح ہمارے گھر چلی آتی اور میں تیزی سے اس کے گھر پہنچ جاتا۔ اس کا بیٹا ڈیوڑھی میں لوہار کی دکان لگاتا تھا۔ ہلوں کے پھل اور درانتیاں ہتھوڑے بناتا تھا۔ چکر سا چلتا اور بھٹی میں آگ جلتی۔ نیلے شعلے اٹھتے۔ میں ان شعلوں کو دیکھتا ہوا چاچے سے دو چار باتیں ادھر ادھر کی پوچھتا اور پھر آنکھ بچا کر ماں مادو کے گھر میں گھس جاتا۔ اس کی بہو لڑ کر میکے ہی میں رہتی تھی۔ اس لیے چرخے کی رکھوالی اور سوت کی کاتی ہوئی اینٹوں کا گھور بنانے سے مجھے کوئی منع نہ کر سکتا تھا۔ تائی جھیوری کی دیوار کے ساتھ سیڑھی

تھی۔ اس پر چڑھ کر کوٹھوں ہی کوٹھوں اکٹھے گھر پہنچ جاتا اور ماں مادو کو خبر بھی نہ ہوتی۔ وہ بھی بابو کی عورت کی طرح روز یہ ساری بربادی جا کر دیکھتی تو جی بھر کر بد دعائیں دیتی اور میری نانی سے آ کر قصہ کہتی ”نہ جانے کون مردود روز میرا سوت برباد کر جاتا ہے بھین۔ میرے گھر میں تو سایہ ہو گیا ہے۔“ اور نانی اسے پڑھنے کے لیے دعائیں دیتی جو میرا خیال ہے ماں مادو نے کبھی نہ پڑھی ہوں گی۔ پھر اس شرارت سے خود ہی میرا دل اکتا گیا کیونکہ ڈھاب میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے مجھے گگڑی روشو کا لڑکا ساتھ لے جانے لگا۔ گگڑی روشو بڑی وضعدار عورت تھی۔ کلیوں کے موسم میں ہر روز ہار بنا کر محلے میں دے جاتی پر اس نے کسی سے کبھی آٹا مانگا نہ دانے کسی نے دے دیا تو خاموشی سے لے لیا۔ نہیں تو گلہ نہیں۔ اپنے پھٹے پرانے گھگھرے کی گوٹ اپنے پاؤں سے دھکیلتی وہ تیزی سے چلتی اور ہر گھر میں گھس کر لڑکیوں بالیوں کے پہننے کے لیے ہار دے جاتی۔ ایک دن دوستی کے جذبے میں میں نے گگڑی روشو کے گھر روٹی بھی کھالی۔ دلاور علی کے سالے اقبال نے جو اس کے پاس رہتا تھا آ کر گھر بتایا تو میری بڑی درگت بنی۔ گھر سے باہر جانا ایک دم بند اور مجھے بی بی جی کے گھر پہلا سپارہ دے کر بھیجا جانے لگا۔ عائشہ بی بی میرے ساتھ بیٹھ کر پڑھتیں تو مجھے چٹکیاں کاٹتیں۔ میں تنگ آ کر رونے لگتا تو سیدانی بی بی مجھے

پوچھتیں، چپ کراتیں اور اندر کوٹھڑی میں لے جاتیں جہاں دیگوں میں مکھانے، مصری، کھانڈ، شکر، گڑ اور نہ جانے کیا کیا رکھا ہوتا تھا۔ اس حویلی میں سارا سال آنے والے عرس کی تیاری بڑے زور شور سے ہوتی رہتی۔

میرا ایمان ہے عائشہ بی بی کو اگر اللہ میاں بھائی دیتا تو وہ ضرور اس کو مار دیتیں۔ شاید دنیا کے ہر مرد کے ساتھ انھیں ساری عمر ایک دشمنی رہی ہے۔ بربادی سے پیار۔ یکا یک والد نے مجھے اور ماں کو بمبئی بلا لیا، میں پہلا سپارہ بھول بھال گیا اور جب ہائی اسکول پاس کر کے میں اور ماں گاؤں لوٹے تو عائشہ بی بی کی شادی ہو گئی تھی۔

یورپ سے آتے ہوئے اتنے عرصے بعد مجھے وطن بڑا عزیز، بڑا ہی پیارا اور بڑا ہی پر کشش لگا۔ گاڑی جن راہوں سے گزرتی میرا دل ایک کیف اور نشے سے سرشار ہو تا جاتا۔ یہاں تک کہ جب میں نہروں والے علی وال پہنچا ہوں تو میں نے جھک کر اپنے گاؤں جانے والی راہ کو چوم لیا، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اصل میں کائنات تو بہت کم بدلتی ہے۔ انسان ہی بدل جاتا ہے۔ وہی چھوٹی سی نہر پر جھکا ہوا نیلا آسمان تھا۔ گنے کے کھیتوں کے گرد کانٹوں کی باڑیں تھیں اور ہوا کے جھونکوں سے سبز لہروں کی طرح جھومتے اور بہتے ہوئے کھیت تھے۔ جن میں گندم ابھی کچی تھی۔ گھر سے نانا کی آنکھوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے

کسی نے سارے گاؤں کے لیے کوئی مفصل خط نہ لکھا تھا۔ اور میرے دل میں بے چینی تھی۔ بس یونہی سی۔ جیسے منزل کے قریب آنے پر وفور شوق سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چندو کی آوی سامنے نظر آرہی تھی اس کے بعد حویلی تھی۔ میں نے اس لیے گھر خط نہیں لکھا تھا کہ کہیں نانا خود مجھے لینے نہ پہنچ جائیں۔ میں اپنا چھوٹا سا غیر ملکی صندوق اپنے کندھے پر خود ہی اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے کیل سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ حویلیوں کے سامنے گنوں کے ڈھیر لگے تھے، بیلنے چل رہے تھے۔ رس نکالا جا رہا تھا، کڑھاؤ چڑھے تھے، کھیتوں میں سے نیلا دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں وہ پرانا لڑکا تو نہیں تھا جو ڈھاب میں روشو لگڑی کے لڑکے کے ہمراہ مچھلیاں پکڑتا تھا اور پھر میں نے نئے بوٹ پہنے ہوئے تھے، انگریزی سوٹ میرے بدن پر تھا۔ چوہڑوں کی پتی کے پاس سے گزرتے ہوئے نئی نویلی بہوؤں اور مٹیاروں نے مجھے دیکھا تو گھروں کی نیچی دیواروں پر ٹھوڑیاں ٹکائے وہ مجھے اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک میں نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہی پرانی بڑی بڑی لکڑیاں گلی کے درمیان حویلی کے سامنے نالی تھی۔ پیپل کے درختوں کے سامنے وہ رونق نہ تھی۔ مسجد نہ جانے اتنی سنسان ہی تھی کہ یونہی میرا وہم تھا۔ گلی میں گھسا ہوں تو پرانے آبادی اور زندگی کے نشان حویلی کی بیٹھکوں میں نہیں تھے۔ کتوں کے بھونکنے

کی آوازیں اندر سے چلی آتی تھیں مجھے اپنا دل سرد ہوتا لگا۔ سرد اور بے حس، جیسے اچانک کسی نے یخ کی سل میرے دل پر رکھ دی ہو۔ کیسر سنار کی دکان جو ہر وقت کھلی رہا کرتی تھی، پرانے بڑ کے نیچے بند پڑی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا بات ہے گاؤں پہلا سا کیوں نہیں ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے حویلی سے نکل کر سائے میرا تعاقب کر رہے ہیں اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی گلی میں مڑ گیا۔

نانا کوٹھڑی میں لیٹے تھے، نانی گھر پر نہ تھی۔ صحن میں ایک طرف سیڑھیوں کے نیچے چولہے کے سامنے ہماری بہشتن رحمتے روٹی پکا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھی اور جلدی سے اپنے سر پر چادر سمیٹ کر بولی۔ ''بسم اللہ بسم اللہ بیٹا تم کیسے چلے آئے نہ خط لکھا نہ پتا دیا۔ بہن جی دلاور علی کے گھر کسی کام سے گئی ہیں۔ میں دیوار پر سے آواز دے دیتی ہوں۔ تیرے نانا اندر کوٹھڑی میں لیٹے ہیں جا پہلے ان سے مل لے۔'' نانا نے میری آواز سن لی تھی بولے۔ ''آؤ آؤ بیٹا اندر آؤ۔۔ ارے نہ خط نہ پتر تو نے مجھے اتنا اپاہج جان لیا تھا۔ کیا میں تیرے لیے اسٹیشن تک بھی نہ آسکتا تھا۔ نالائق تو یورپ سے آیا ہے، سات سمندر پار سے اور میں تجھے ہار پہنا کر گھر نہ لاتا۔ ادھر آ میرے سینے سے لگ جا۔ میں تو تیری راہ دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ

مری شکل ٹٹول ٹٹول کر "دیکھ" رہے تھے۔ انھوں نے میرے ماتھے پر ان گنت بوسے دیے اور پھر زور سے کہنے لگے۔ "رحمتے جا اس کی نانی کو دلاور علی کے گھر سے بلا لا۔" مگر رحمتے پکتی روٹی کو توے پر چھوڑ کر دلاور علی کے گھر جا چکی تھی۔ جب میں مڑا تو نانی کے ساتھ دلاور علی کی بیوی، مامی فاطمہ اور خدا بخش کی بیوی برکتے، بہوئیں، بیٹیاں، جوان لڑکیاں سب کوٹھڑی میں گھس آئی تھیں۔ سب نے باری باری میرے سر پر پیار دیا۔ بہوئیں بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھتی رہیں جو میرے سامنے بیاہ کر آئی تھیں انھوں نے حال پوچھا۔ نئی لڑکیاں جو بہوئیں بن کر گاؤں میں آئی تھیں گھونگھٹ نکالے کھڑی تھیں اور نانی میرے سر منہ کو چوم کر رحمتے کو کہہ رہی تھیں کہ چارپائیاں لا کر سب کو بٹھانے کا بندوبست کرے۔ جلدی جلدی لالٹین صاف کی گئی اور شام کے بڑھتے سایوں میں نانا کی بالکل دھندلی آنکھوں کے سامنے ہم سب بیٹھ گئے۔ میرا سوٹ اور نئے بوٹ اس ساری فضا میں کتنے اجنبی لگ رہے تھے۔

میں نے ان مامیوں، چاچیوں سے خیر خیریت دریافت کی، پھر وہ سب چلی گئیں تو میں نے اپنا نیا سوٹ کیس کھول کر نانا کو وہ تحفے دکھائے جو میں ان کے لیے اور نانی کے لیے لایا تھا آخر میں میں نے سفید ریشمی ململ کی پگڑیاں نکال کر الگ رکھتے ہوئے کہا۔ "نانا جی یہ میں سید صاحب اور مولوی صمد صاحب کے

لیے لایا ہوں، دیکھیں تو سہی کتنی اچھی ہیں۔" مگر پگڑیوں کو نہ ہی نانی نے ہاتھ بڑھا کر دیکھا اور نہ ہی نانا جی نے، دونوں یوں خاموش ہو گئے گویا مجھ سے کوئی ایسی بات سن لی ہے جسے کہنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا یا جس بات کے لیے میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ میں نے پہلے نانا کی طرف دیکھا اور پھر نانی کی طرف اور پھر بولا۔ "کیوں کیا بات ہے آپ لوگ چپ کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا مجھے ان کے لیے کچھ لانا نہیں چاہیے تھا۔"

نانا بولے۔ "بتائیں گے ابھی جلدی کیا ہے۔ ہم نے کب کہا ہے بیٹا۔ اس حویلی کے ہم پر بڑے احسان ہیں پر کاش! وہ حویلی والے بھی تو ہوں۔ سیدانی بی بی نہیں تو بہن جی ہی زندہ ہوں۔ مولوی صمد، سید صاحب کوئی تو ہو۔" وہ چپ ہو گئے۔ نانی جلدی سے اٹھ کر دالان کے نیچے چولہے کی طرف رحمتے کے پاس جا بیٹھیں اور میں دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں میں لٹکائے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح یہاں بتی کی مدھم روشنی میں اپنے چہرے پر زندگی بھر کی شکنیں اور پیچیدگیاں لیے کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا سوال پوچھوں۔

نانا بولے۔ "بیٹھ جاؤ بیٹا کھڑے کیوں ہو۔ میں تمھارا چہرہ نہیں دیکھ سکتا پر اس تکلیف کو پڑھ سکتا ہوں جو تمھاری روح میں غلطاں ہے۔ حویلی والے سب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ان چند سالوں میں زندگی اپنے محور پر الٹی گھوم گئی

ہے۔ موت کتنے ہولے قدم بڑھاتی ہے مگر حویلی والوں کو تو اس نے ہڑپ کر
لیا ہے۔ نہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھی تھی۔"
"پر یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے۔" میں نے بے یقینی سے یہ لفظ کہے۔
نانا نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "بتاؤ کس راہ سے آئے ہو، کیا تم نے
کیسر سنار کی دکان بند نہیں دیکھی۔ کیا تم نے حویلی کے سامنے مسجد کی ویرانی
کو محسوس نہیں کیا۔ کیا تم نے پیپل کے درختوں کے نیچے اداسی کو روتے نہیں
سنا۔ کیا تم نے ان پکی اور اونچی شان والی بیٹھکوں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز
نہیں سنی؟ اگر یہ سب دیکھ آئے ہو تو میں کیا بتاؤں؟"
پھر دلاور علی اندر آ گیا اور مجھے گلے لگا کر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے
قریب بیٹھتے ہوئے نانا جی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "تو پھر میں عائشہ بی بی کو کیا
جواب دوں۔ آپ ہی کوئی تجویز کریں۔ میرے گھر میں سارا وقت جنگ ہوتی
رہتی ہے۔ میں کیا کروں۔ آپ بزرگ ہیں، حویلی کے بعد مجھے آپ پر بھروسہ
ہے۔" اور نانا بولے۔ "میاں جس نے سیدانی بی بی جیسی ماں کی لاج نہ رکھی
جس نے بہن جی جیسی محبت کرنے والی بہن کا لحاظ نہ کیا وہ عورت تم سے کیا نباہ
کرے گی۔ آگے تم اپنا بھلا برا خوب سمجھتے ہو۔ اگر اس کے بنا کوئی چارہ کار نہیں
تو خیر شرع کی راہ کھلی ہے۔ کس بات کی دیر ہے۔"

دلاور علی شرمندہ سا ہو کر بولا۔ ”شرع کی راہوں کا سہارا میں نہیں لینا چاہتا ایک عورت مدد مانگتی ہے کیا یہ مردانگی کے خلاف نہیں کہ میں اس کی مدد نہ کروں۔“

نانا تھوڑے غصے میں آکر بولے۔ ”جس حویلی کی بیٹھکوں میں کتے بندھوا چکی ہیں عائشہ بی بی اس کو آباد کرنے کے لیے اتنی پریشان نہیں ہو سکتیں۔ میاں بات کو سمجھو۔ جو گدی ایک بار ویران ہو چکی اب اس کے گرد عقیدت مند کب جمع ہوں گے۔ بھولے نہ بنو۔ عائشہ بی بی آخر سیدانی بی بی کی بیٹی ہے آل رسولؐ ہے اسے تو خدا معاف کر دے گا پر تم بچ نہ سکو گے میاں اللہ کا قہر برا ہوتا ہے۔ خوف کھاؤ بچو، اسے کہو شہر واپس چلی جائے۔“

دلاور علی بولا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ سیدانی بی بی کی بیٹی ہے۔ اسے تو خدا معاف کر دے گا پر میرے لیے دوزخ میں بھی جگہ نہ نکلے گی۔“ ”ماں جی“ اس نے نانی کو آواز دے کر کہا۔ ”میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ برخوردار سے بھی دو چار باتیں کر لوں آپ جا کر عائشہ بی بی کو سمجھا دیں۔ میں مجبور ہوں خدا کی عدالت میں جواب دہی کرنی بڑی سخت ہے وہ مجھے معذور ہی رکھیں۔“

نانی کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر بڑے دروازے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے کہا۔ ”آخر کیا بات ہے۔ عائشہ بی بی دلاور علی کے ہاں کیسے آگئیں۔ میرا دماغ ماؤف

ہوا جا رہا ہے سمجھ نہیں آتا آخر یہ سب باتیں کیا ہیں۔ مجھے تو سمجھائیے۔" دلاور علی ماما نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھ کر سر نیچے جھکا لیا۔ وہ بڑا اشر مندہ اور پریشان لگتا تھا۔

نانا بولے۔" دلاور علی میاں، جس دن حویلی کا سودا چکایا گیا تھا۔ تمھیں اسی دن اس بات کا پتہ لگ جانا چاہیے تھا کہ جس عورت نے اپنے بزرگوں کی نشانی کو تین سو روپے میں بیچ ڈالا اس کی نیت کیا ہو گی۔ غضب خدا کا سیدانی بی بی کی بادشاہت کو اس طرح سے خراب ہونا تھا کہ عائشہ بی بی ان کی اپنی بیٹی تمھارے پاس ٹھکانہ چاہنے کے لیے آئے۔ اللہ اللہ۔۔۔" اور وہ چپ ہو گئے دونوں میں سے دیر تک کوئی بھی نہ بولا۔ نانا کا دل غم سے بھرا ہوا تھا اور دلاور علی ماما نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

لالٹین کو مدتوں بعد جلایا گیا تھا اس میں تیل کم تھا۔ بتی پر پہلے ایک بڑی نامعلوم زردی سی چھانے لگی پھر لو کے کنارے پھٹ گئے اور روشنی کم ہوتی چلی گئی۔ کوٹھڑی میں بڑا عجیب سا اندھیرا کہیں کونوں کھدروں سے بڑھنے لگا، دبے پاؤں نامعلوم قدموں سے جیسے ویرانی ہولے ہولے اپنے قدم دھرتی ہوئی ہوا کے کندھوں پر جھولتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو۔ سامنے وہی ریشمی پگڑیاں پڑی تھیں جو میں سید صاحب اور مولوی صمد کے لیے یورپ سے لایا تھا۔ کپڑا سفید

نہیں زرد لگ رہا تھا اور بجھتی لالٹین کی روشنی میں کسی کفن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ میرے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر نانی اندر آئیں آہستہ چلتی ہوئیں جیسے بیماری سے اٹھی ہوں، کہنے لگیں۔ ”برخوردار میں نے عائشہ بی بی کو سید صاحب کی روح کا واسطہ دیا ہے، میں نے اسے کہا ہے کہ تمھاری جان بخشی کر دے۔ شہر میں اسے ایسے بہت لوگ مل جائیں گے جو نکاح کرنے کو تیار ہوں۔ گاؤں پر کوئی آفت نہ ٹوٹے۔ مگر وہ کہتی ہے بس دلاور علی کو ایک بار بھیج دو۔ میں اس کے منہ سے انکار سننا چاہتی ہوں۔ سو برخوردار جب سر پر آہی پڑی ہے تو ڈرنا کیسا؟ گھوڑیاں تیار کرواکر آج ہی اس کے بھجوانے کا بندوبست کر دو۔“ دلاور علی ماما اسی طرح سر کو جھکائے اٹھ کر بنا کچھ بولے باہر نکل گیا۔

دروازے میں ماں مادو دہلیز سے پرے کھڑی تھی۔ وہ اندر آگئی اور بنا کچھ کہے اس چارپائی پر بیٹھ گئی جو وہاں ماميوں، چاچیوں کے لیے بچھی تھی۔ نانی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بہن مادو عائشہ بی بی میں نہ جانے کون سی خبیث روح گھس گئی ہے ورنہ سیدوں کی بیٹی اور ایسی سمجھ نہیں آتا۔ اللہ ہی اللہ ہے، زمانہ ہی پلٹ گیا سارا۔“

ماں مادو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”بہن جی اگر مولوی صمد صاحب کو باسی روٹیاں کھلا کھلا کر اندھا نہ کر دیتیں تو حویلی کے دن اچھے ہوتے۔ اصل میں ان کی کنجوسی نے ہی یہ ساری کایا پلٹی ہے۔ میں نے کتنی بار آ کر بتایا تھا کہ ناشتے میں باسی روٹیاں اور لسی کا گلاس پی کر بھی مولوی صاحب نے کبھی اف نہیں کی۔ کوٹھڑیاں مکھانوں اور مصری سے بھری ہوئی تھیں مولوی صاحب کو کبھی گڑ ہی کھانے کو ملتا۔ وہ نہ مرتے تو عائشہ بی بی کو کیسے ہمت ہوتی کہ بہن جی کو دوائی کے بہانے زہر کھلا دیتیں۔ صرف گدی کا حق لینے کی خاطر۔ خدا کسی کو بے اولاد بھی نہ کرے۔“

نانا بولے۔ ”یوں نہ کہو مادو بہن۔ بڑے گنوں کی تھیں بہن جی بھی بس ذرا سیدھی تھیں اور پھر انھیں عائشہ بی بی سے محبت بھی بہت تھی۔“

نانی کہنے لگیں۔ ”جب جالندھر جانے لگی ہیں۔ اپنے دیور کی بیٹی کی شادی پر تو بڑی رنجیدہ تھیں۔ میں انھیں ملنے گئی، جاتے ہوئے کہہ رہی تھیں ماسی جی عائشہ بی بی نے زبردستی گھر کی چابیاں لے لی ہیں پیار سے لیتی تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ دس دن کے بعد واپس آئی ہیں تو گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ صندوق خالی ہر شے ختم کس سے کہتیں، اس دکھ سے بیمار پڑ گئی تھیں، انھیں کوئی مرنا تھوڑی تھا؟“ ——— مادو بولی۔ ”میں بھی بیٹوں والی ہوں، خدا سے ڈرتی

ہوں، پر بہن اس دلاور علی کو خدا کا خوف نہیں آیا۔ اتنی بڑی حویلی تین سو روپے میں خرید لی اور ان بیٹھکوں میں جہاں سید صاحب درس دیتے تھے کتے باندھے۔ دیکھنا اس کے بدن میں کیڑے پڑیں گے۔"

نانا بولے۔ "خدا کرے اب عائشہ بی بی اپنے اس خیال سے باز آ کر شہر لوٹ جائے اور سب ٹھیک ہے پر گھر کی یہ بربادی کہ سید زادی ایک جاٹ کے گھر آ پڑے نہیں دیکھی جاتی" ——— نانی مادو سے مخاطب ہوئیں، ان کی آواز میں جیسے آنسو تھے۔ "یہ دیکھو یہ پگڑیاں سید صاحب اور مولوی صمد کے لیے سات سمندر سے لایا ہے ہے مادو!"

اور ماں مادو اداس ہو کر بولی۔ "اب کس کام کی یہ باتیں بیٹے۔ حویلی میں کتے باندھتے ہیں۔ عائہ بی بی نے وہ حویلی دلاور علی کے پاس بیچ دی۔ مسجد کے کنوئیں میں سامان پھینک دیا، پیپل اجڑ گئے، اب کیا رکھا ہے وہاں؟"

نانا آہ بھر کر رضائی کو اپنے گرد لپیٹ کر کہنے لگے۔ "بیٹے اب مسجد ویران ہو گئی ہے، پیپلوں کے نیچے دن دہاڑے بھی جا کر کوئی نہیں بیٹھتا، کنوئیں سے پرے سارے حجرے ڈھے گئے ہیں۔ حویلی دوسرا مولے وال بن گئی ہے۔ اب تو اس گلی میں سے گزرتے بھی لوگ ڈرتے ہیں۔"

نانی کو جیسے کوئی بعد کی بات یاد آئی ہو بولی۔ "ہائے ہائے میری یاد دیکھو ابھی تک اس چکر میں پڑے ہیں۔ اپنے بچے کو پانی تک نہیں پوچھا۔" وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ماں مادو نے میرے سر پیار دیا۔ اور ماتھے کو چوما۔ اور پوچھنے لگی کہ میں کب آیا ہوں اور میں سوچ رہا تھا ڈھاب ایک کمان ہے جس کے دونوں سرے ٹوٹ چکے ہیں، پر وہ کونسی شے ہے جو انسان کی مرضی بنا اسے طوفانوں کے حوالے کر دیتی ہے جو بدی کے بیج اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ بدی کیا ہے اور سیدانی کی بیٹی عائشہ جو دلاور علی سے نکاح کر کے حویلی کو پھر سے آباد کرنا چاہتی ہے کیوں ایسی ہے؟ آخر کیوں۔۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔۔؟ حویلی آخر کیوں ویران ہو گئی ہے؟ میرے سامنے نانا کی پائنتی پر پڑی سفید ریشم کی پگڑیوں پر بجھتی بتی کی روشنی میں کیڑے رینگ رہے تھے۔ زرد اور سیاہ سروں والے جو خون کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور شاید بدی کے کیڑے ہیں۔ پر یہ بھی کون جانے انھیں کس نے پیدا کیا ہے۔۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔۔ آخر کیوں؟

خالی گھر

اس دن ننگل میں دوپہر کے بعد سے ڈھول پٹنا شروع ہو گیا۔ پرواہوا اچل رہی تھی۔ مٹی مٹھیاں بھر بھر جیسے کوئی منہ پر پھینکے۔ ہمارے گرد اڑ رہی تھی۔ لوگ خوشی سے گھوم پھر رہے تھے۔ عورتیں اونچی جگہوں میں کھڑی ہو کر اچک اچک کر اس طرف دیکھ رہی تھیں۔ جدھر کشتی ہونے والی تھی۔ ڈھول متواتر بنار کے ایک ہی تال پر بجایا جا رہا تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے ڈھیلی ڈھالی قمیضوں والے اکڑی مونچھوں والے، لاٹھیوں والے سرخ آنکھوں والے، کیسری پگڑیوں والے جوان اکھاڑے کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ ڈھول والا لمبا کرتا پہنے گلے میں ڈھول لٹکائے بجاتا جا رہا تھا۔ گاؤں کی خاموشی میں ایک زلزلہ سا آ گیا تھا۔ پکوڑے بیچنے والے زور زور سے آواز لگاتے جلدی جلدی اونچی نیچی گلیوں کو پھلانگتے آ رہے تھے۔ اصل میں آج مجھے گاؤں کے پہلوان موتا سنگھ سے کشتی لڑنا تھی۔ میں نے اسے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند دن ہوئے ملایا سے لوٹا تھا۔ میرے بھی ایک دو یار اس گاؤں میں

تھے۔ چوپال میں موتا سنگھ ان سے ملا تو شیخی بگھارنے لگا۔ میں نے یوں انگریزو ں سے کشتی لڑی ہے۔ یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ میرے یاروں کو بھی تاؤ آگیا۔ کہنے لگے جوان چانن سنگھ چھوٹے ننگل والا پہلوان بڑا تکڑا جوان ہے اس کو پچھاڑ دو تو جانیں۔ اور یوں بنا میرے کہے سنے مقابلے کی بات ہو گئی۔ چھوٹا ننگل بڑے ننگل سے یہی کوئی پانچ مربوں کے فاصلے پر ہے۔ پنڈتوں کے گھر سے ذرا آگے چل کر اونچی گلی کے آخری سرے پر کھڑے ہوں تو چھوٹے ننگل کے گھر نظر آتے ہیں۔ ڈاک خانے والوں کو بڑی غلطی لگ جاتی ہے۔ کئی دفعہ ڈاک ایک گاؤں کی دوسرے گاؤں میں چلی جاتی ہے اور ایسا ہی ہوا تھا کہ ایک بار موتا سنگھ نے ملایا سے اپنی بہن کے نام منی آرڈر بھیجا تو کئی دن تک وہ ہمارے چھوٹے ننگل میں گھومتا رہا۔ مگر یہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ ان دنوں مدرسے کا منشی جو ڈاک بابو بھی ہے۔ نیا نیا آیا تھا اور موتا سنگھ کو جانتا ہی نہ تھا۔ یوں بھی وہ پندرہ سال بعد ملایا سے لوٹا تھا اور جن دنوں وہ گیا ہو گا ہم ایک دوسرے کو کیا جانتے ہوں گے۔ میں شہر میں بڑے چاچا کے پاس ہوتا تھا۔ میرے باپو کو مجھے بابو بنانے کا بڑا شوق تھا۔ انھوں نے چاچا کے پاس مجھے شہر بھجوا دیا پانچ سال وہاں رہنے کے بعد بھی جب میں لٹھ گنوار جاہل رہا اور

انگریزی کا قاعدہ پانچ حرفوں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ آخر چاچی بھی میرے زیادہ روٹیاں کھانے سے تنگ آگئی تو باپو مجھے گاؤں لے آیا۔

مگر بات تو میں جب کی کر رہا ہوں جب مجھے موتا سنگھ ملایا والے سے کشتی لڑنا تھا۔ یاروں نے میرا بڑا دل بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ہماری لاج رکھ لینا۔ وہ سات سمندر پار سے آیا تھا۔ تو شیخیاں بگھارتا ہے۔ اس نے انگریزوں سے کشتیاں لڑی ہوں گی۔ کبھی چھوٹے ننگل والے ہمارے چانن سنگھ کے ہاتھ نہیں دیکھے ہوں گے ۔ اسے مزا چکھا دینا۔ ہماری ہیٹی نہ ہو۔ شام سنگھ نے میرے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملا تھا اور پھر وہ سارے داؤں مجھے پہلے سے یاد تھے۔ اور بات بھی کوئی نہ تھی۔ میں ہنستا کھیلتا اپنے ننگل سے بڑے ننگل کی طرف چلا۔ جو گھوڑی میرے نیچے تھی۔ اس کی کمر میرے بوجھ سے جھکی جاتی تھی۔ میں نے آتے ہوئے گھر کے چھبیس سال کے پرانے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ میری بہن نے سر پر سے تیل ماش وارے تھی۔ اور جب میں دروازے سے نکلا ہوں تو مجھے ماں نے بڑی دعائیں دی تھیں۔ پھر جب تک میں گلی کا موڑ مڑ نہیں گیا۔ ہمسائے کی عورتیں، ماسیاں، چاچیاں ساری کوٹھوں پر سے مجھے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں اور ڈھول کی آواز ہمارے گاؤں میں بھی آرہی تھی۔ دور جیسے مکھیوں کا چھتا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے

گاؤں کے اوپر سے گزرے یا ٹڈیوں کی فوج اڑتی ہوئی گزر جائے۔ گاؤں سے باہر نکلے تو ہیں کلر میں سے گزرتے ہوئے ایک سانپ گھوڑی کے سموں تلے نہ جانے کس طرح آ گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ دم اور سر کے عین بیچوں بیچ دو ٹکڑے۔ اور دونوں حصے الگ الگ تڑپتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے موتا سنگھ کون سے داؤں جانتا ہو۔ وہ کس طرح کا آدمی ہو۔ اگر میں نے اسے گرا لیا تو کہیں وہ میرا دشمن ہی نہ بن جائے۔ دوست بنانا بہت شکل ہے۔ میرے دونوں یار شام سنگھ اور کرتار سنگھ خواہ مخواہ ہر ایک سے الجھ پڑتے ہیں۔ اب یہ دیکھو بنا کسی بات کے یہ جھگڑا کھڑا کر لیا۔ ایسی باتیں رہ رہ کر میرے دماغ میں آ رہی تھیں۔ ہوا چل رہی تھی۔ گاؤں کے راستوں اور پگڈنڈیوں پر پتے اڑ رہے تھے۔ گندم کے کھیتوں میں کچی بالیں جھونکوں سے دوہری ہو رہی تھیں۔ درختوں کے ٹھنڈے سایوں تلے اندھیرا سا لگتا تھا۔ نہر کے پانی کی آواز کبھی ہوا کی لہروں سے قریب اور دور ہوتی جاتی تھی۔ ڈھول برابر بج رہا تھا۔ چھوٹے ننگل کے لوگ، میرے خاندان والے، میرے یار اور ان کے یار۔ جوان ہوتے ہوئے لڑکے۔ ننگل کے لوگ، یہاں تک کہ تین چار گاؤں دور کے لوگ تھے۔ میں کوئی ایسا پہلوان نہیں تھا جس کی دھوم دور دور ہو۔ موتا سنگھ پندرہ سال بعد وطن لوٹا تھا۔ پھر بھی لوگ اسے جانتے تھے۔

سفید داڑھیوں والے کہہ رہے تھے کہ بھئی وہی پنڈتوں والا موتا سنگھ۔ بھئی وہی ایشر داس والا۔ اکھاڑے کے پاس کھڑے بوڑھے اپنے ننگے پاؤں سے مٹی جھاڑتے۔ اپنی تیل والی جوتیاں بغلوں میں دبائے ایک دوسرے کو موتا سنگھ کی بات نئے سرے سے سنا رہے تھے۔ موتا سنگھ ابھی تک نہیں آیا تھا اور سورج ہولے ہولے نیچا ہونے لگا تھا۔ اکھاڑے کی نرم مٹی سے سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اور گرد کے ساتھ نتھنوں میں جا رہی تھی۔ پاس ہی ٹھہرے ہوئے پانی ک اایک ٹکڑا تھا۔ پانی پر لہریں اٹھ رہی تھیں اور لہروں کے ساتھ آسمان بھی ہلکورے لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ذرا اور دور سفید بطخیں قطار باندھے ہولے ہولے نازک کشتیوں کی طرح پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ سیاہ پانی پر سفید بطخیں۔ کنارے ایک اجڑا سا کھجور کا درخت تھا۔ یہ سب کچھ کتنا پر سکون اور صدیوں پرانا لگ رہا تھا۔ بطخیں اور یہ پانی۔ یہ درخت۔ یہ سب چیزیں کتنی خاموش اور ہمارے وجود سے کس قدر بے خبر تھیں۔ میں سوچتا بھی جاتا تھا اور باتیں کرتے ہوئے ان سب چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے ننگل میں طاقچے میں رکھے پرانے شیشے میں اپنی شکل مجھے کسی اجنبی کی شکل کی طرح مدھم مدھم یاد آ رہی تھی کیا میری شکل پر رعب تھا؟

پھر ایک طرف سے آدمیوں کی ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ لوگ موتا سنگھ کو لے آئے تھے۔

اس نے انگریزی فیشن پر اکھاڑے سے باہر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر ہم دونوں اکھاڑے میں اترے۔ چپ چاپ خاموش ہم دونوں لوگوں کے شور میں بڑے سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ کے لیے زور لگا رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور پھر بھی اپنی طاقت کا آخری داؤں لگانے کے لیے بے قرار تھے۔ ہولے ہولے جیسے کسی مشین کے پیچ کھولے جارہے ہوں ۔ میری طاقت کے بند ڈھیلے پڑنے لگے۔ بظاہر میں اسی طرح طاقت ور تھا۔ ہوشیاری سے اپنے دشمن کو پچھاڑنے کی سوچ رہا تھا مگر دراصل چاہتا تھا کہ وہ جیت جائے۔ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا۔ پندرہ سال بعد وطن لوٹ کر اس کا غرور کیوں ٹوٹے۔ موتا سنگھ میرے دل کی بات سمجھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”چانن سنگھ جوان میں سستی جیت نہیں لینا چاہتا کیا تم مجھے اپنے مقابلے کا نہیں سمجھتے جو ہولے ہولے مجھے جیتنے کا موقعہ دے رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم سے کس نے کہا میں جیتنا نہیں چاہتا جوان؟“

”تو پھر زور لگاؤ۔“

”میں سارا زور لگا چکا ہوں۔“

ہم ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔ اس نے مجھے گرا دیا۔ میرے یار میری طرف دوڑے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں چانن وہ تو بڑا پرانا پہلوان ہے۔ آج سے بیس سال پہلے کشتیاں لڑتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا پھر کیا ہوا۔ انھوں نے میرے گلے میں بھی ہار ڈالے اور موتا سنگھ کے گلے میں بھی۔ پھر موتا سنگھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مجھے گلے لگایا۔ یہ سارے طریقے اس نے دوسرے ملکوں میں انگریزوں سے سیکھے تھے۔۔

جب شور تھم گیا اور میں اپنے گاؤں جانے کے لیے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ میرے یار میرے ساتھ جانے کے لیے اپنی اپنی گھوڑیوں کی باگیں موڑنے لگے تو موتا سنگھ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا چانن سنگھ جوان آج رات میرے گھر کی مٹھائی کھاؤ۔ تم بھی اور تمھارے یار بھی۔ کیوں جوانو۔ اس نے ان سے پوچھا۔

کیوں بھاؤ پھر کبھی سہی آج ابھی اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو۔

یہ طریقہ ہے جوان۔ یہاں پر ہوٹل تو نہیں ہے کہ میں تمھیں کھانا کھلا سکوں ہاں تم لوگ آج ضرور میرے مہمان ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ بھئی کیا سوچ رہے۔ اترو آؤ نیچے آؤ۔ میں گھر کہہ آیا تھا تمھاری روٹی پک چکی ہو گی۔ میں بنا کچھ کہے گھوڑی سے نیچے اتر آیا میرے یار بھی اتر آئے۔ موتا سنگھ نے میری

گھوڑی کی باگ اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور ہم اونچی گلیوں اور نیچی گلیوں، روڑی کے ڈھیروں، نالیوں کے گندے پانی کو پھلانگتے کچی دیواروں کا سہارا لیتے اس حویلی کی طرف جانے لگے جو پنڈتوں کے ویران گھر کے پاس ہو کر آگے کی طرف ذرا گاؤں کے کنارے ہے اور ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ آباد بھرے گاؤں میں صرف یہ گھر ہے جس میں کوئی نہیں رہتا۔ سخت سے سخت بارشوں نے بھی جس کی دیواروں میں سوراخ نہیں کیے۔ چھتیں اسی طرح ہیں۔ کوٹھوں پر گھاس اگ آئی ہے۔ باہر کی دیوار اب تقریباً ڈھے گئی ہے اور کھلے دروازوں سے کوٹھڑیوں میں نظر جاتی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو پٹ کبھی بند ہوتے اور کبھی کھلتے ہیں۔ جیسے روحیں آپس میں گلے مل کر بین کر رہی ہوں۔ نکڑ پر چھوٹا سا گھر۔ دو کوٹھڑیاں آگے۔ آنگن اور اس کے ساتھ کسی زمانے میں مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں ہوں گی۔ ایک طرف نیچی سی پھوس کی چھت کے نیچے جو کا بنا ہوا۔ آباد ہو گا تو اس گھر میں ذرا سی خوشی سے بھی طوفان آجاتا ہو گا۔ روشنی طغیانی کی طرح دیواروں سے ابلنے لگتی ہو گی۔ کوئی زور سے بات کرتا ہو گا تو گلی میں سے گزرنے والوں کے کانوں میں بھی ہر بات پڑتی ہو گی۔ ہم موڑ کے قریب پہنچے ہیں تو گہرا اندھیرا ہو چلا تھا۔ شام کا تارا زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ آسمان پر اور بھی اکے دکے تارے گاؤں کے لڑکوں کی طرح آنکھ

مچولی کھیلنے نکل آئے تھے۔ اور نیلی چھت اور قریب آگئی تھی۔ ہماری گھوڑیاں ہنہناتی مورنیوں کی سی چال چلتی ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ گلیوں کی نالیوں کو بڑی شان سے پھلانگتی ہوئی ان کے گرم سانس بھی ہمارے منہ پر اور کبھی کانوں کے قریب آ لگتے۔ ہوا میں اناج کی خوشبو تھی اور گرد بھی تھی۔ ہمارے پاؤں اور گھوڑیوں کے پاؤں کی آواز سن کر شاید پنڈتوں کے گھر میں ایک الو چیختا اور پر پھڑ پھڑاتا ہوا ایک کوٹھڑی سے نکلا۔ اور ہمارے سروں پر سے چکر لگاتا دوسری کوٹھڑی میں گھس گیا۔ میرے یار شام سنگھ نے کہا۔ ''مائی درگی کی آتما ابھی تک روتی پھرتی ہے۔'' میرے دوسرے یار نے زور زور سے جپ جی کی ایک دو پوڑیاں جو اسے یاد تھیں پڑھنی شروع کر دیں۔ موتا سنگھ نے قدم تیزی سے بڑھائے۔ شام سنگھ پھر بولا۔ ''کیوں موتا سنگھ جوان یہ مائی درگی کی آتما ہی ہے نا۔ میں نے سنا ہے تم پر بھی اس سلسلے میں مقدمہ بن گیا تھا۔ بات تو بڑی پرانی ہے۔ پر کیا بات تھی۔'' موتا سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ شام سنگھ بھی چپ ہو گیا اور ہم نیچی دیواروں والے گھروں کے پاس سے گزرتے رہے۔ اندر کوٹھڑیوں میں دیے جل رہے تھے۔ عورتوں کے بولنے، بچوں کے رونے، آدمیوں کے کھنکارنے، بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کے بجنے اور روٹیاں پکنے کی ملی جلی صدائیں ہمارے آگے پیچھے تھیں۔

موتا سنگھ کا گھر آ گیا۔ حویلی کے باہر ہی اس کے بھائی نے ست سری اکال کہہ کر ہماری گھوڑیوں کی باگیں پکڑ لیں اور انھیں صحن میں لے جا کر ایک طرف باندھ دیا۔ بہت سے جوان اکٹھے ہو گئے جو آج سارے کشتی دیکھنے گئے ہوں گے۔ سب نے چارپائیوں سے اٹھ کر باری باری ہم سے ہاتھ ملائے۔ آنگن میں رنگین پائیوں کے بڑے بڑے پلنگ تھے اور ان پر نئے کھیس بچھے تھے۔ ہمیں سب سے اونچے پلنگ پر بٹھا کر موتا سنگھ چوکے کی طرف گیا۔ جہاں چولہے میں تیز آگ جل رہی تھی اور اس کی بہن کچھ پکا رہی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں نے آ کر ہمارے سروں پر پیار کیا اور ہمیں اشیر باد دے کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ دونوں ہاتھ پیچھے اپنی پیٹھ پر رکھ کر جھک کر چلتی تھی۔ اس کے بالوں میں دیے کی روشنی سے چمک اٹھی تھی جیسے چاندی ہو۔ پرے بڑی بڑی کوٹھڑیوں میں لالٹینیں جل رہی تھیں اور موتا سنگھ کی ملایا کی بیوی اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ جن سے وہ انگریزی زبان میں بات چیت کر رہی ہو گی۔ اس کی بہن کے بچے پیچھے سے ایک دوسرے کے کرتے پکڑے گھوڑیوں کے قریب ریل گاڑی کھیل رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ نائن کوٹھڑی میں سے تھال لا کر ان میں کھانا پروس رہی

تھی۔ کنبے کی اور عورتیں بھی چوکے میں بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں لگی تھی۔ پیڑھیوں پر بچے سو رہے تھے اور عجیب گہما گہمی تھی۔
پھر موتا سنگھ نے ہمارے ہاتھ دھلائے اور اس کے بھائی نے ہمیں ہاتھ صاف کرنے کے لیے تولیہ دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر کھانے کے تھال ہمارے سامنے رکھنے شروع کر دیے۔ کنبے والے بھی دوسرے پلنگوں پر بیٹھے تھے۔ اوپر تک بھرے تھالوں میں چاولوں پر پسی ہوئی بورا چینی پر گرم گرم گھی کے پڑنے سے سوندھی خوشبو بھوک اور بھی تیز کر رہی تھی۔ سویاں تھیں اور کھیر تھی۔ ٹھنڈی جمی ہوئی مزے دار۔ پر اٹھے تھے اور بھاجیاں تھیں۔ دہی بڑے تو بہت ہی لذیذ تھے۔ موتا سنگھ میرے پاس بیٹھا تھا بار بار اصرار کر کے مجھے اور کھانے کو کہتا جاتا تھا۔ دوسروں سے بھی کہتا۔ اس کا بھائی دوسرے پلنگوں پر بیٹھے کنبے والوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ نائی ساتھ ساتھ پانی دے رہا تھا۔ سب لوگ ڈٹ کر کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں ملایا کی چائے بڑے بڑے شیشوں کے گلاسوں میں پلائی۔ چھوٹے ننگل اور بڑے ننگل کی باتیں ہونے لگیں۔ گاؤں میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا ہے۔ شام سنگھ کہنے لگا۔ ”اچھا بھئی مجھے تو اب گھر جانا ہے۔ سویرے سویرے مجھے جنڈیالے کر کسی کام سے جانا ہے۔“
موتا سنگھ کہنے لگا۔ ”چھوڑو جوان آج رات مل کر بیٹھے ہیں کون جانتا ہے اگلا دن

کیسا آئے اور سورج ہمیں کہاں ملے۔ آ سارے یار مل کر بیٹھے ہیں چار گھڑی باتیں کریں۔" مگر شام سنگھ نہ مانا۔ جب اس نے اپنی گھوڑی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اور موتا سنگھ اسے رخصت کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ "جوان پنڈتوں کے گھر کے قریب سے نہ گزرنا۔ ذرا چکر تو پڑے گا دوسری طرف سے ہو کر جانا۔"

"اچھا" شام سنگھ نے زور سے کہا۔ اور پھر موتا سنگھ سے کہنے لگا۔ "کبھی یہ بھی سنا ہے کہ چھوٹے ننگل کے جوان مائی درگی کی آتما سے ڈریں۔ تیرا کیا خیال ہے میں کدھر سے جاؤں۔"

موتا سنگھ کہنے لگا۔ "اگر کسی جوان کا بھوت ہو تو اس سے نہ ڈرو تو بھی کوئی بات نہیں۔ پھر یہ عورت کا بھوت ہے۔ عورت زندہ ہو تو بھی اور مر گئی ہو تو بھی ڈرنے کی شے ہے۔ جوان۔ میرا تو خیال ہے۔ بھگت سنگھ کی بات مان ہی لو۔ ذرا چکر پڑے گا تو کیا ہے دوسری طرف سے ہی چلے جاؤ۔"

"تم بھی تو ڈر کر ہی ملایا چلے گئے تھے نا۔ اور اب پندرہ سال کے بعد لوٹے ہو۔" شام سنگھ نے گویا چڑانے کے لیے کہا۔

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔" موتا سنگھ نے کہا۔ "پندرہ سال بعد اگر اب بھی مجھے رام دئی دکھائی دے تو میں پھر بھاگ جاؤں گا۔ میں مائی درگی کی آتما سے نہیں ڈرتا۔"

"بھئی موتا سنگھ" پلنگوں پر بیٹھے ہوؤں میں سے کسی ایک نے کہا۔ "تم ملایا چلے گئے تھے پر ہمیں اس بات کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ جب مقدمہ ختم ہو گیا تھا پھر یکایک تمھیں کیا ہوا تھا تم گراں کیوں چھوڑ گئے۔ اب یہ بات چل ہی پڑی ہے تو ہمیں بتاؤ آخر کیا بات تھی؟"

شام سنگھ گھوڑی سے نیچے اتر آیا۔ بولا۔ "چلو بتاؤ پھر۔ لو میں بھی نہیں جاتا۔ جنڈیالے کا کام بڑا ضروری ہے۔ پھر اب یہ بات سن کر ہی جاؤں گا۔" موتا سنگھ چپ چاپ آکر واپس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بھائی نے حویلی کے بہت بڑے صحن میں چارپائیاں دوسری طرف بچھا دیں۔ بھگت سنگھ بولا۔ "نہ جانے ہماری باتیں کب ختم ہوں۔ بچے بے آرام ہوں گے۔ کیوں نہ باہر والی حویلی میں چلو۔"

حویلی میں ہوا بہت میٹھی لگ رہی تھی۔ غبار میں پہلے دنوں کا چاند ڈوب رہا تھا۔ ہوا میں کوئی آواز نہ تھی۔ پھر بھی لگتا تھا جیسے کہیں سے سہانی بانسری کی میٹھی دھنیں کان میں پڑ کر شہد بن کر خون میں گھلی جاتی ہیں۔ ملایا کی شراب کی دو

بوتلیں کسی کنواری کے ہونٹوں کی طرح جادو کر رہی تھیں ہم ہولے ہولے
گھونٹ پی رہے تھے۔ ہوا کے ساتھ نشہ تیز ہو رہا تھا۔
موتا سنگھ نے بوتل اپنے قریب کھسکا لی۔ ایک چسکی بھری اپنی بڑی بڑی
مونچھوں کو مروڑا۔ اور خاموش ہو کر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔
شام سنگھ کہنے لگا۔ ’’کیوں موتا سنگھ چپ کیوں ہو۔ رات بیت رہی ہے جوان
اگر تو بول نہیں سکتا تو چل پھر میں تو جاؤں۔‘‘ موتا سنگھ نے بڑے دکھ سے سر
اٹھا کر ہولے ہولے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر
کہنے لگا۔ ’’سن یار راتیں تو بیت ہی جاتی ہیں پھر نہ جانے کیوں دکھ نہیں بھولتا۔
اور دکھ کے ساتھ مرنے والے کی آنکھیں کیوں یاد آجاتی ہیں۔ ست دیو کو تم
سب نے ہی دیکھا تھا۔‘‘ وہ پھر خاموش ہو گیا۔
’’اوئے یار بجھارتیں کیا ڈال رہا ہے۔ ست دیو کو تو ہم سب نے دیکھا تھا پھر
آگے بھی تو کوئی بات کر۔‘‘ بھگت سنگھ چڑ کر بولا۔
’’پنڈت جی کو بھی تم سب جانتے ہو۔ پر سمجھ نہیں آتا۔ رام دئی کو درگی نے کیا
کھا کر پیدا کیا تھا۔ کبھی منشی کے ہاٹ پر۔ کبھی سادھو کے کوہلو پر، کبھی چنت
سنگھ کے خراس پر بے جھجک ہنستی ہنستی لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
باتیں کرتی۔ گاؤں میں گلیوں میں گھوما کرتی تھی۔ ان دنوں سادھو کا لڑکا چندھا

روشن کتنا اکڑ اکڑ کر اصیل مرغ کی طرح چلتا تھا۔ یہ سارارام دئی کا جادو تھا۔ ماں اور نانی کی طرف سے پھٹکار کو رام دئی نے کچھ جانا ہی نہیں۔ بڑی ڈھیٹ تھی۔ دال لینے آئی ہے تو جھولی میں مکھانے ڈالے تیزی سے نکلتی جاتی ہے۔ میری ماں کہا کرتی تھی جان ہار ڈاچی پر ماتما جانے کس کس کو خراب کرے گی۔ پنڈت جی آپ مر گئے، اس جنگلی بیل کو چھوڑ گئے۔ دوسری بیٹیاں بھی تو ہیں، نہ کبھی چرخے کو ہاتھ لگاتی ہے نہ کوئی اور کام کرتی ہے۔ جہاں دو چار مامیاں چاچیاں بیٹھتیں بس درگی کی غریبی اور اس کے دکھ کے ساتھ ساتھ رام دئی کا ذکر ضرور آتا۔ دوپہروں کو جب ہماری ڈیوڑھی میں ساری حویلی کی عورتیں اپنے اپنے چرخے لاکر آبیٹھتیں تو درگی وہاں سے گزرتی۔ کبھی سفید گائے کے لیے چارا لاتی اور کبھی گیہوں پسوانے جاتی۔ کبھی سر پر اپلوں کا ڈھیر رکھے ہوئے۔ کانوں سے بہری تھی کسی کی بات بھی نہ سنتی۔ اور پھر اگر کوئی آواز دیتی۔ ”ماسی درگی۔ بات تو سن۔“ اس نے کبھی ٹھہر کر، رک کر کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایسی دوپہروں کو رام دئی لمبی تان کر سوتی۔ یا پھر گلی میں سے گزرتی تو لڑکوں کو دیکھ کر یوں رک رک کر چلنے لگتی۔ گویا کوئی پیچھے آرہا ہو۔ آنکھ میچ کر اشارہ کرنا۔ سینے کو ابھار کر چلنا۔ یہ ساری باتیں نہ جانے اس نے کس سے سیکھی تھیں۔“

بھگت سنگھ بولا۔ ”یہ باتیں تو سب کو معلوم ہیں یار۔ کیا مجھے نہیں پتہ وہ کنوئیں پر آنے جانے والوں سے بھی یارانہ گانٹھتی تھی۔ چوڑیاں بیچنے والے اسے گچھے کے گچھے مفت دے جاتے۔ دنداسہ، سرخی کی ٹکیاں، سب کچھ بس یوں اگلے کے پلے سے جھاڑ لیتی تھی۔ کبھی دین دیال سے الجھی ہوئی اور کبھی کسی سے۔ انھیں دنوں تو نہ جانے کہاں سے اس نے بڑا چمک دار اور پھولوں والا ریشمی کرتا، دوپٹہ لیا تھا۔ اور پہن کر میری بہن کے پاس دکھانے آئی تھی۔ میری ماں نے اس کے جانے کے بعد بہن کو گالیاں دی تھیں اور کہا تھا ”اگر میں نے پھر تجھے اس رنڈی سے بات کرتے دیکھ لیا اور تیری سہیلی بن کر یہ میرے گھر آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“

”ہاں تیری بہن کا آدمی سنا ہے مارا گیا تھا۔“ موتا سنگھ نے کہا۔ ”مجھے ملایا میں کسی نے بتایا تھا۔“

”عورت کا چکر بڑا ظالم ہوتا ہے بھئی۔ اس کا پہلے سے جس عورت سے تعلق تھا اس کے خاوند نے میرے بہنوئی کو مار دیا۔ یہ عورت ذات اس سے پرماتما بچائے رکھے۔ بچاری میری بہن ایک بچے کو لیے بیوہ ہو کر زندگی گزار رہی ہے۔“

موتا سنگھ بولا۔ "صبر اور شرم کی حدیں ہوتی ہیں۔ تمھاری بہن اسی طرح زندگی گزار دے اور رام دئی نے ست دیو کے بعد بھی صبر نہ کیا۔ اصل میں اس کا بیاہ میری ماں اور ماسی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو محفوظ رکھنے کے لیے پنڈت جی کے لحاظ کی خاطر ایک پن کا کام کرنا ہی اچھا سمجھا۔ درگی کا بہرہ پن اس کے بیاہ کے بعد اور بڑھ گیا۔ وہ اپنے ننگے پاؤں کی بوائیوں کو بھول کر گھاس چارہ لاتی۔ اور رام دئی کو مکھن ملائی سے روٹی کھاتے دیکھ کر اپنی روکھی سوکھی روٹی نگلتی ہی خوش رہتی۔ سفید گائے کی طرح اسے گھر اور گھر کے آدمیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔"

"ایسا ہی بڑا لگاؤ ست دیو کو رام دئی سے تھا۔ اس کے لیے رام دئی کے سفید چہرے کی آنکھیں ہی سب کچھ تھیں۔" بھگت سنگھ بولا۔ "مگر یہ بتاؤ تم آخر کس طرح پھنسے تھے؟"

"رام دئی کی بڑی لڑکی پانچ سال کی تھی۔ جب میں پہلی بار پنڈتوں کی ڈیوڑھی میں گیا ہوں۔ ست دیو دوسرے گاؤں سے دھان جھاڑنے کے بعد لوٹا تھا۔ اور گیانی ٹھاکر سنگھ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کو حویلی میں رک گیا تھا اور جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگا چل یار آ تجھے کھیر کھلاوں۔ گھر میں پہنچے ہیں تو چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ لڑکی پیڑھی پر بیٹھی اپنی گڑیا کو کپڑے پہنا رہی

تھی اور رام دئی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے درگی کو رام رام ست کیا۔ مگر اس نے نہ آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور نہ ہی جواب دیا۔ ست دیو نے دھان زور سے چوکے کے اوپر پھینک دیے۔ کپڑے اور سر جھاڑتا ہوا چولہے کے پاس بیٹھی لڑکی سے کہنے لگا۔ "نی منی" تیری ماں کہاں ہے۔ منی نے اپنی گڑیا کو پیار سے پیڑھی پر رکھ دیا اور ڈری ڈری باپ کی طرف آکر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ پھر بولی بھاوؑ دیلو اور بی بی اندر ہیں۔ اس نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ بی بی کہتی تھی اگر میں اندر آئی تو وہ میرا گلا گھونٹ دے گی۔

"ست دیو نے بڑی پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گھبرائی ہوئی اور شرم سے جھکی آنکھوں سے اور پھر ہولے ہولے بیمار کی طرح چلتا کوٹھڑی کی طرف گیا۔ دورازہ اندر سے بند تھا۔ ست دیو نے کواڑ بجا کر کہا۔ دئی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں چوکے کے پاس حیران تھا۔ درگی چرخہ کات رہی تھی۔ اور چھوٹی لڑکی آنگن میں کھڑی کوٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ دوسری بار پھر اس نے کہا۔ دئی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ دروازہ چوں چوں کر کے اپنی چوتھی پر گھوم گیا۔ اور بھڑے ہوئے پٹ کو پہلے ذرا سا کھول کر دئی نے جھانکا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ کرتا پیٹ کے اوپر اٹکا ہوا تھا اور دوپٹہ کندھے پر سے ہو کر دوسری طرف لٹک

رہا تھا۔ اس نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ ست دیو بولا کیوں اندر کون ہے دروازہ کھول۔ اس کا سانس اس کے گلے میں اٹکا ہوا لگتا تھا۔ اور آواز سینے کے اندر سے کہیں جیسے پاتال سے آ رہی ہو۔ بڑی بوجھل تھی۔ دئی نے میرا ابھی لحاظ نہ کیا۔ ہنس کر بولی۔ "تجھے اس سے کیا کہ اندر کون ہے۔ بڑا آیا رعب ڈالنے۔" اس نے آنکھ میچ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے وہ اس وقت ایک مسلا ہوا مگر تازہ پھول لگ رہی تھی۔ اس کے گرد تازہ خوشبو تھی جیسے دودھ کی بالٹی سے آیا کرتی ہے۔ ایسی سفیدی جیسے دودھ دوہتے ہوئے جھاگ میں ہوتی ہے۔ اس میں زندگی ابلی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مستی تھی۔ جو ہر شراب اور ہر دارو سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے اس میں کیا تھا۔ اس کا کرتا پیٹ پر اٹکا ہوا۔ پریشان بال۔ لٹکتا دوپٹہ۔ اگر تم میں سے کوئی اس گھڑی اسے دیکھتا تو اپنا سارا کچھ واری کر دیتا۔ وہ درگی کے چرخے کے قریب آ گئی اور بولی اس ڈائن نے بتایا ہو گا۔ تمھیں بلا کر لائی ہو گی۔ یہ میری جان کی دشمن ہے۔ کتی مرتی بھی نہیں۔ چڑیل نہ جانے میری جان کب تک کھائے گی۔ اور اس نے چرخے کو زور سے لات ماری۔ درگی نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اوپر اسے، مجھے اور ست دیو کو دیکھا۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکا ہوا تاگے کا تار ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ بس بس میں صرف یہی

کہہ سکا۔ ست دیو چوکے کی طرف گیا۔ اور وہ ایک لمحہ کاش وہ ایک لمحہ نہ آتا۔ جب میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنی ساری خوبصورتیوں، خوشبوؤں اور شوخیوں سمیت میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ وہاں دیے کی مدھم لو کے سنگھم پر ایک گھڑی میں، درگی اور ست دیو کے ہوتے ہوئے میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ مجھے کتنی شدت سے احساس ہوا تھا کہ بس رام دئی ہی وہ عورت ہے جس کے لیے میں دیوانہ ہوں۔ جس کو ڈھونڈتے ہوئے میں آج تک گاؤں کی کتنی لڑکیوں کے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔

”دوسرے لمحے ست دیو نے چولہے کی راکھ کی ایک مٹھی اس کے پریشان بالوں میں ڈال دی اور کہنے لگا۔ ”تم نے جو کچھ کیا ہے۔ برا کیا ہے۔ میں تمھیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تجھے سنبھال نہیں سکتا۔“

”رام دئی ہلی نہیں اس نے آگے بڑھ کر ست دیو کو اسی طرح لات نہیں ماری جس طرح اس نے درگی کے چرخے کو ماری تھی۔ بس بال جھاڑنے لگی اور بولی میں اس کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گی۔ درگی نے تار چھوڑ دیا۔ اور رام دئی کو گلے لگا کر زور زور سے بین کرنے لگی۔ پھر ہمسائے کی عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر دیکھنے لگیں۔ چودھرائن اپنا لہنگا سنبھالتی آئی اور تھوڑی دیر میں سارا آنگن عورتوں سے بھر گیا۔

”چھوٹی لڑکی اپنی گڑیا کو لیے صحن میں یوں کھڑی تھی جیسے پتھر ہو گئی ہو اور گائے اس سارے شور سے گھبرا کر بار بار سر کو زور سے جھٹکتی اور پھر منہ مارنے لگتی۔ ست دیو بڑا خاموش دھان کے ڈھیر کے پاس بیٹھا تھا۔ جیسے اس سارے تماشے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ دلیو نہ جانے کب کا کوٹھڑی سے نکل کر جا چکا تھا۔

”میں مہینوں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رات کو مکئی کے کھیتوں میں۔ کڑکتی سردیوں میں۔ برستی بارش میں نہ جانے کیسے کیسے جتنوں سے رام دئی سے ملتا رہا۔ ہر بار اسے دیکھ کر میرا دل ایسے دھڑکتا جیسے باہر نکل جائے گا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ بیاہتا عورت ہے۔ کھائی کھیلی۔ زمانے کی اونچ نیچ سے واقف، مردوں کے دل اپنے ہاتھ میں لینے والی۔ میں ان دنوں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کنواریوں سے زیادہ سچی اور پتی روتا عورتوں سے بھی اونچی لگتی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ جنڈیالے سے ہر حیلے رات کو لوٹ آتا۔ سارچور کے باغوں کے پاس سے گزرتے کالے پل پر سے بھی مجھے ڈر نہ لگتا۔

”سیدھا سادا اور بڑا ہی دکھی ست دیو ہم سب کو دوست سمجھتا تھا۔ اس کے جی میں دکھ گھن کی طرح اس کے سارے وجود کو چاٹ رہا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور گیانی ٹھاکر سنگھ سے چہلیں کرتا۔ اس کے پھکڑوں کا جواب دیتا۔

"وہ اکثر دوسرے گاؤں میں کام ڈھونڈنے چلا جاتا۔ اور ایک ایک ماہ لوٹ کر نہ آتا۔ گھر میں اس کے نہ ہونے سے کوئی کمی نہ ہوتی۔ صرف اس کا کالا کتا اس کی غیر موجودگی میں بہت کم بھونکتا اور ڈیوڑھی میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔ رام دئی کو میں نے ساڑھیاں لا کر دیں۔ دل پیاس کے چمکیلے پھولوں والے سوٹ جو میری بیوی کے پاس بھی نہ تھے۔ خوشبودار تیل۔ میموں کے استعمال کی جتنی بھی چیزیں جنڈیالے کے دکاندار بڑے شہر سے لاتے ہیں اس کے لیے لے جاتا۔ ہر نیا کپڑا پہن کر اس کے چہرے پر ایک نیند سی اتر آتی۔ دیسی شراب کے جھاگ کی طرح اصلی اور پھر بھی نقلی۔ درگی اسے نیا کپڑا پہنے دیکھتی تو بس دیکھتی ہی رہ جاتی۔ وہ اسے کبھی کچھ نہ کہتی۔ رام دئی کو دیکھ کر ان دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ صرف اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ اچھے کپڑے پہنے اور زور زور سے ہنسے یا پھر چیزوں کو ٹھوکریں لگائے۔ مجھے تماشے میں کام کرنے والی عورتوں سے بھی زیادہ وہ اس وقت اچھی لگتی جب میرے پاس آنکھیں میچ کر بیٹھ جاتی اور کہتی بوجھو تو میں کیا سوچ رہی ہوں۔"

بھگت سنگھ بولا۔ "اس سے زیادہ بے شرم عورت دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ لگتا ہے تم اب تک اس کے جادو میں بندھے ہو۔"

موتا سنگھ نے شراب کی بوتل اٹھا کر بہت سی اپنے حلق میں انڈیل لی اور پھر منہ بند کر کے ہولے ہولے اسے گلے سے نیچے اتارنے لگا اور پھر بولا۔ ''بس رام دئی اس شراب کی طرح تھی۔ صرف میں اسے پی نہ سکا۔ میں اسے حلق سے نیچے اتار نہ سکا۔ وہ بہت تیز تھی اور بہت نشہ آور۔''

''اور اسی نشے میں تو تم نے ست دیو کو مار دیا تھا۔'' بھگت سنگھ نے تلخی سے کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔ اور ایشر داس اسے بہانے بہانے بیاس پار لے گئے تھے۔''

''پر بات تو تب تھی جو تم رام دئی کو اپنے ساتھ ملایا لے جاتے اسے یہاں دوسروں کے لیے چھوڑ گئے۔''

موتا سنگھ پھر نشے میں بہکے ہوئے آدمی کی طرح بولا۔ ''دوسرے اس کے لیے بنے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے نہ تھی۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا۔ اگر مجھے اپنی زندگی کا اتنا خیال نہ ہوتا تو شاید میں آخر دم تک اس کے ساتھ رہتا۔ مگر میں سدا کا ڈرپوک ہوں۔ بھگوڑا۔ رام دئی مجھ سے بہت اونچی تھی۔ آخری دن وہ حویلی کی دیوار سے لگی ہولے ہولے ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی ست دیو کی موت کے چھ ماہ بعد تم مجھ سے آج پوچھ رہے ہو کہ میں نے اسے کیوں مروایا تھا۔

"چاند کی مدھم روشنی میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہی دیوانہ کر دینے والی خوشبو —— زمین کی سوندھی خوشبو دودھ کی میٹھی باس اڑ رہی تھی۔"

"اور جب تم نے ست دیو کو مارا تھا تب بھی تمھیں یہ خوشبو یاد ہی ہو گی۔" بھگت سنگھ ہولے سے بولا۔

"ست دیو کو میں اور ایشر داس کام کرنے والی باقی ٹولی سے دور لے آئے تھے۔ شام کے سائے بیاس کے پانی پر اندھیرا اور سرخی بنے ڈول رہے تھے۔ وہ جیسے آنے والی گھڑی کے قریب آنے سے گھبرا رہا تھا۔ کہنے لگا یار موتا سنگھ میرا تو دل ڈر رہا ہے۔ چلو واپس چلیں۔ میں تھک گیا ہوں میری ٹانگوں سے مانو جان نکل رہی ہے۔ مجھ سے اور کام نہیں ہو سکتا۔ ایشر داس اس کے قریب گیا۔ ہنسا اور اس نے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال کر اسے گرا لیا۔ کہنے لگا آؤ یار ٹانگوں سے جان تو نکل گئی ہے۔ باقی جان بھی نکال دیں۔ گرنے کے بعد تک ست دیو یہی سمجھتا رہا کہ ہم اس سے مخول کر رہے ہیں۔ مگر جب ایشر داس نے اسے دبوچ لیا۔ اس کا گلا دبانے لگا تو رکتی سانسوں میں ست دیو نے کہا۔ "جانے دو یار میرا کیا ہے جو کہو گے وہی کروں گا۔ عورت کے پیچھے میری جان کیوں لیتے ہو۔ کہو گے تو واپس گاؤں بھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ مارو۔" میرے ہاتھ

کانپ رہے تھے اور میں ان جانے ہی ہولے ہولے ایشر داس کو پیچھے سے کھینچ رہا تھا کہ ست دیو کو چھوڑ دے۔ مگر انسان کی محبت کے مقابلے میں عورت کی محبت جیت گئی۔ رام دئی کی جادو کرتی ہوئی آنکھیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ وہ آنکھیں کہ جب روتی تھیں تو ان پر واری ہونے کو جی چاہتا تھا۔ میری ساری جان نہ جانے کہاں بیٹھی کانپ رہی تھی کہ میں ایک آگ تیرتی ہوئی اپنی رگوں میں محسوس کر رہا تھا۔ رام دئی سے ملنے کے لیے میرا دل تڑپ رہا تھا ۔اور ایشر داس کے نیچے ست دیو بے قابو ہو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ ایشر داس نے کہا۔ "اوئے موتا سنگھ تو بھی تو رام دئی میں میرا شریک ہے۔ سالے کتے کو مارنے میں میرا ساتھ دے۔"

میری کانپتی جان اور رگوں کی آگ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی۔ جیسے مجھے متلی آگئی ہو۔ میں نے کہا۔ "چل یار میں رام دئی میں حصہ نہیں لگاؤں گا۔ تو اس کا کام ختم کر۔ گلا تو تو نے پکڑا ہوا ہے۔ میں اس کا کیا کروں۔ جلدی کر جلدی۔" ایشر داس اور ست دیو برابر کے جوان تھے۔

"ہمارے قریب ست دیو کا جسم پہلے تڑپتا رہا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم وہیں کھیتوں میں چھپے آنے والی ریل کا انتظار کرتے رہے۔ جب گاڑی کی بتیاں دور سے دکھائی دیں تو میں نے اور ایشر داس نے ست دیو کو اٹھا کر پٹڑی پر رکھ دیا۔

انجن کی سیٹیاں سنائی دیں۔ نیچے دریا میں تینوں کا عکس پڑتا رہا اور لہروں میں سائے ڈولتے رہے۔ جیسے پل پر سے جنوں کی فوج گزر رہی ہو۔ کیسے انوکھے وقت مجھے اپنا بچپن یاد آرہا تھا۔ مجھے ڈھاب یاد آرہی تھی۔ اور کنارے کے کھیت یاد آرہے تھے۔ میرے دل پر جیسے کسی نے منوں بھاری پتھر رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا یہ پتھر کوئی اٹھا دے۔ اور میں ہلکا ہو کر بھینس پر بیٹھ کر ننگ دھڑنگ ایک چھوٹا سا لڑکا بن جاؤں۔ بیریوں پر چڑھ کر بیر اتاروں۔ امرود چراؤں۔ مگر یہ ساری باتیں پیچھے رہ چکی تھیں۔ میرے جی میں دکھ تھا۔ اور اپنے بیتے دنوں کی یاد تھی۔ پر ہر یاد کے پیچھے جیسے اس کا سایہ ہو۔ رام دئی کی آنکھیں ابھر آئی تھیں۔ سانپ نے چڑیا کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ گاڑی رک گئی۔ انجن کی نیچے آکر ست دیو کی لاش کے دو حصے ہو گئے تھے۔ پر ریل ایسے جنگلوں میں کب ٹھہرتی ہے۔ اپنے راستے پر چلی گئی۔ ہم نے ست دیو کا سر اٹھا کر وہیں پل کے نیچے گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اور خود واپس آگئے۔"

"وہ مقدمہ کس نے چلایا تھا یار۔" میرے یار شام سنگھ نے بہت دیر کے بعد پوچھا۔

"تھا ایک رام دئی کی برادری کا آدمی اسے نہ جانے کیسے شک ہو گیا کہ ست دیو کو رام دئی نے مروا دیا ہے۔" موتا سنگھ نے ہولے ہولے سے کہا۔ "چھ ماہ میں

نے ایک شراب کے نشے میں بہکے ہوئے آدمی کی طرح گزارے ہیں۔ تم میں سے کسی نے رام دئی کو ایسے قریب سے نہیں دیکھا۔ وہ جادوگرنی تھی۔ مقدمہ ہونے کے بعد پتہ چلا ہے کہ سادھو کا لڑکا چندھا منشی ایشر داس۔ گیانی تیج سنگھ۔ چودھری بلندا، سنت سنگھ۔ سارے ہی کسی نہ کسی وقت رام دئی کے جادو میں آ چکے ہیں۔ جب میرا نام بھی آیا تو میری ماں نے کہا تھا یہ ڈائن ہے۔ ڈائن میرا گھر بھی کھائے گی۔ مقدمے کے دنوں میں جب مجھے اپنی زندگی اور موت کا پتہ نہیں تھا۔ جب ہمارے دو مربعے بک گئے تھے اور باپو سارا وقت مجھ سے کبھی آنکھیں ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ رام دئی سے ملنے کی سوچا کرتا تھا۔ پاگلوں کی طرح ہر وقت اس کے سپنے دیکھتا رہتا تھا۔ جیل کی کوٹھڑی میں اور باہر بھی میرے دماغ میں سوائے اس کے کچھ نہیں تھا۔"

"مگر تم تو بہت جلدی جیل سے نکل آئے تھے۔ تمھاری ضمانت ہو گئی تھی۔ بھئی۔" بھگت سنگھ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں پھر ایشر داس کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور میں وعدہ معاف گواہ بن کر چھوٹ گیا۔ تب ایک رات رام دئی نے ہنس کر مجھے کہا۔ "تمھیں ست دیو کبھی یاد نہیں آتا۔ اور میں نے اپنے آپ کو بھی ست دیو کی طرح ایشر داس کے نیچے تڑپتے اور پھر ریل کے انجن کے نیچے دو ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ میں ایک دم

ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے بالوں میں سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔ ہنستے ہنستے میں چپ ہو گیا۔ اور پھر دوسرے دن کے چڑھے سورج نے مجھے ننگل سے دور، جنڈیالے سے بھی دور ریل میں بیٹھے ان جانی زمینوں سے پرے بھاگتے پایا۔"
بڑی دیر کے بعد بھگت سنگھ نے کہا۔ "تمھارے جانے کے بعد رام دئی جیسے بجھ گئی تھی۔ چند روز وہ بالکل خاموش رہی۔ پھر اس نے مانڈی کے جوان چودھری کو نہ جانے کیسے پھانس لیا۔ بس ان دنوں درگی کو میں نے روتے اور لڑتے سنا ہے۔ ماں بیٹیاں الجھتی رہتیں۔ سفید گائے رام دئی نے بیچ دی تھی۔ اور ہولے ہولے گھر کا سامان بھی ٹھکانے لگا رہی تھی۔ چودھری کو مانڈی سے آتے بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"ارے یار جو آدمی روز رات کو مانڈی سے آسکتا ہے اور پھر دن چڑھے واپس بھی اس کے پاگل ہونے میں کیا شک ہے۔" بھگت سنگھ نے کہا۔ "گاؤں میں ان دنوں کتنی پنچائتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر روز چوپال میں سارے بڑے بوڑھے اکٹھے ہوتے پھر رام دئی اور درگی سے کون بات کرتا۔ دونوں ودھوا اور بے سہارا تھیں۔ لوگوں کو ان دونوں سے زیادہ مرے ہوئے پنڈت کی آتما کی شرم تھی۔ انھوں نے سنتو کے کی بھابی سے انھیں کہلوایا تھا۔ جو بڑی زبان دراز اور تیز بے لحاظ عورت تھی۔ اب تو بوڑھی ہو گئی ہے نا۔ پر مرنے میں چند

سال اور لے گی۔ درگی نے چپ چاپ یہ بات سنی اور جواب دینے کی بجائے ڈیوڑھی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ رام دئی نے کہا تھا۔" بھابی میں تو آپ ہی گاؤں چھوڑ رہی ہوں تو نے یہاں آنے کی ناحق تکلیف کی ہے۔"

"چوہدری کے گڈے آئے اور بیچنے سے جو سامان باقی بچا وہ رام دئی اپنے ساتھ مانڈی لے گئی۔ گڈے پر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے اور نہ چہرے پر رنج لگتا تھا۔ جیسے وہ مسافروں کی طرح آئی تھی۔ چند دنوں ننگل میں رہی اور اب اپنے راستے جا رہی ہے۔ جب درگی کا چرخہ بھی گڈے پر رکھنے لگے تو وہ ٹوٹ کر رو دی۔ اس نے ڈیوڑھی کی مٹی اپنے سر پر ڈال لی اور بین کر کر کے ماں کو ماں اور پنڈت کو آوازیں دینے لگی۔ اس کے لیے یہ گھر ساری دنیا تھا۔ اور یہ گاؤں مرنا جینا وہ نہ کبھی کسی کے ہاں مہمان گئی اور نہ ہی کسی دوسرے گاؤں میں۔ اس مٹی سے پیدا ہوئی تھی اور اسے اس مٹی میں ملنا تھا۔ سارا گاؤں رام دئی کے گھر کے باہر اکٹھا تھا۔ پنڈتوں کی ڈیوڑھی کے آگے کتنی بھیڑ تھی۔ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بولا۔"میں نے درگی کا چرخہ اتار کر پھر ڈیوڑھی میں رکھ دیا۔ رام دئی اپنی لڑکی کو جو چھ سات کی ہو چلی تھی۔ گود میں لے کر روئی کی ایک گٹھڑی پر بیٹھ گئی اور گڈے والے نے گڈا چلا دیا۔ نہ اس نے کسی کو گلے مل کر وداع لی اور نہ کسی نے اسے گلے لگا کر رخصت

کیا۔ عورتیں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ اور بڑی اداس تھیں۔ سنتو کے
کی بھابی کہہ رہی تھی۔ "رام دئی جیسی لڑکی واہ گرو کسی کو نہ دے۔ سارا گاؤں
اجاڑ کر چلی گئی ہے۔ کئی کمزور دل والیاں درگی کی گم سم صورت دیکھ کر اپنے
آنسو خشک کر رہی تھیں۔"

جگت سنگھ بولا۔ "اور پھر درگی دو دن ڈیوڑھی میں یوں بیٹھی رہی جیسے اسے
سانپ سونگھ گیا ہو۔ نہ بولتی تھی اور نہ ہلتی تھی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی پھرتی تھیں
اگر یہ مر گئی نہ جانے گاؤں پر کیا مصیبت آئے پھر جب اس کی آس ٹوٹ گئی
اور رام دئی کی صورت دکھائی نہ دی تو بہری درگی آپ سے آپ کہیں چلی گئی۔
ست دیو کا کالا کتا ڈیوڑھی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ کبھی کبھار آکاش کی طرف منہ کر
کے روتا اور پھر چپ ہو جاتا۔"

ایک اور بولا۔ "مگر تین چار دنوں بعد درگی واپس آ گئی۔ اس نے خالی گھر میں
دیا جلایا اور چرخہ نکال کر رکھا۔ پھر وہ سردیوں میں پرانے بھولے گیت یاد
کرتی گاتی اور چرخہ کاتتی رہی۔ اس نے اپنے پلو میں بندھے پراٹھے کھول کر
کھائے اور ننگی زمین پر لیٹ گئی۔ دن چڑھے لوگوں نے اس کے چیخنے کی
آوازیں سنیں وہ پانی مانگ رہی تھی۔ چوکے کی زمین پر ایڑیاں مار مار کر اس نے
جگہ کھود ڈالی تھی، ایک زخمی جانور کی سی بھیانک آوازیں اس کے گلے سے نکل

رہی تھیں۔ نہ جانے موت کو اس سے کیا بیر تھا۔ سارا گاؤں ڈر رہا تھا۔ پر کوئی بھی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مگر سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ عورتیں اپنے کوٹھوں پر کھڑی اسے مرتا دیکھتی رہیں اسے چیختا سنتی رہیں۔ پر کون اس کو جا کر دیکھتا۔ سورج کے ڈھلنے تک چیخ چیخ کر اور تڑپ تڑپ کر درگی کا منکا بھی ڈھل گیا۔ نہ اسے زندگی میں سکھ ملا تھا اور نہ موت میں کوئی ساتھی۔ صرف کالا کتا منہ اٹھا کر روتا اور پھر درگی کا منہ چاٹتا رہا۔'' ''میں بھی اس کے کریا کرم میں تھا۔'' بھگت سنگھ نے کہا۔ ''ہم سب نے مل کر اس کی ارتھی اٹھائی اور شمشان میں جا کر اسے روڑی کے ڈھیر کی طرح آگ لگا کر واپس آ گئے۔ کسی نے اس کی موت پر بین نہیں کیے۔ جیسے کوئی اپنے گناہ کو چھپا کر خوش ہوتا ہے۔ گاؤں والے اس کی موت پر خوش تھے۔ اس کے لیے کون سی خوشیاں تھیں اور جینے میں کونسی آس تھی۔ اس کا دنیا سے ناطہ ہی کیا تھا۔ اسے کیا اپنے پوتوں کو کھلانا اور بہوؤں کے سر پر سے تیل وارنا تھا۔ میں تو کہتا تھا جو انو اچھا ہوا وہ مر گئی۔ پر یہ نکڑ پر خالی گھر بہت دکھ دیتا ہے۔ جب پچھواڑے کی حویلی والوں نے اس گھر کو ڈھا کر نیا بنانے کا خیال کیا تو رات کو ان کے گھر میں پتھر برسے تھے۔''

”میں نے تو سنا ہے۔“ جگت سنگھ نے کہا۔ ”کہ جو کوئی رات کو اس گلی میں سے گزرتا ہے اسے مائی درگی کی آتما ملتی ہے اور بال کھولے ہوئے بالکل ننگی چیخ کر اس کی طرف بھاگتی ہے۔ دہشت سے ہی کئی جوان مر گئے ہیں۔ اب تو کوئی اس طرف سے نہیں گزرتا۔ اس کے لیے مرنے کے بعد بھی کوئی سکھ نہیں۔“

موتا سنگھ نے شراب کی خالی بوتل کو زور سے حویلی کی دیوار کے ساتھ دے مارا۔ چھن کی آواز سے بوتل کے ٹکڑے پھیل گئے اور کرچوں پر شراب کی نمی پچھلی راتوں کے تاروں کی روشنی میں چمکتی رہی۔

کیسری

ہوا آج بھی گرم اور جھلسا دینے والی ہے تیزی سے چلتی ہوئی گرد کے طوفان کو اپنے پیچھے اٹھائے ایسی عورت کی طرح کانپ رہی ہے جس نے ضرورت سے زیادہ بوجھ اٹھار کھا ہو اور جس کا کوئی بچہ اسکی مدد کرنے کے لیے زندہ باقی نہ رہا ہو۔ میں بوجھل دل سے ہولے ہولے قدم اٹھاتا عدالت کے کمرے سے اٹھ کر موٹر تک جانے کی کوشش کر رہا ہوں جہاں میرا شوفر میرا منتظر ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی اس تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ میرے قدم پاتال کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ میں نیچے گر رہا ہوں اور زمین کے اندر کی ساری آفتیں میرا سواگت کرنے کو موت کے کئی روپ بن کر میری طرف آرہی ہیں۔ یہ گرمی کا اثر ہے۔

کیسری کی حیرت سے کھلی آنکھیں ہر گھڑی میری راہ میں آتی ہیں۔ میری طرف غور سے دیکھتی ہوئیں مگر ان آنکھوں میں رحم کی التجا نہیں ہے۔ خوف نہیں ہے، افسوس نہیں ہے، صرف حیرت ہے، جیسے کھیتوں سے آتے ہوئے

کسی موڑ پر اسے روپ سنگھ نے پکارا ہو۔ وہ پکار جس سے مایوس ہو کر اس نے روپ سنگھ کو مار دیا تھا۔

گوندوال سے شہر جانے والی راہ پر آج بھی وہی رونق ہو گی۔ ہوا کے ساتھ پتے اڑ رہے ہوں گے نہر کا پانی اسی طرح لہروں کے بل کھاتا آگے ہی آگے جا رہا ہو گا۔ نہر کی پٹڑی پر عورتیں جوتے پلوؤں میں باندھے بچوں کو اٹھائے ننگے پاؤں تیز تیز گاؤں کی طرف آ رہی ہوں گی۔ سائیکل سوار سروں کو دھوپ سے بچانے کے لیے صافے لپیٹے ٹانگیں چلاتے اترتے جاتے ہوں گے۔ سبھی کچھ وہی ہو گا پر کیسری نہ ہو گی۔ کیسری جس کی اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے آج میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔

کیسری کی کہانی وہی عام کہانی تھی جو اس دنیا میں لاکھوں بار دہرائی گئی ہے عورت نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ پریم کی چوکھٹ پر تج دیا اور جب اس دوار سے اسے دھتکار ملی تو بدلے میں اس نے مندر کو ہی اجاڑ دیا۔ مورتی بنانے والے ہاتھوں نے فیصلے کی گھڑی میں مورتی کو آسن سے گرا دیا۔ زندگی کی کہانی عجیب ہے کیونکہ ہر آدمی اس کو اپنے خیال کے مطابق ڈھال لیتا ہے کوئی ایسا بندھا ٹکا اصول نہیں جو اس کو ترتیب دے سکے۔ جانے

کتنی صدیوں سے یہ دنیا آباد ہے اور پھر بھی ہر کوئی جو دنیا میں پہلی بار آتا ہے دنیا کے نئے پن سے حیران ہوتا ہے اور اپنے خون سے اس کہانی کا انجام لکھتا ہے اور چپکے سے مندر میں اپنے دل کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ تب ہی تو ایسی ایسی باتیں جن کو اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا۔ دشمنی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی رقابتیں چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہولے ہولے تناور درختوں کی طرح زندگی کی راہ پر چھا جاتی ہیں۔ تو کیسری بھی دنیا میں آئی، مورتیاں بنا کر مندر کو سجاتی رہی اور یہاں سے ہی اس کی کہانی عام کہانیوں سے ذرا مختلف ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ ایسی ہی لگی تھی کیونکہ میں کیسری کو بچپن سے جانتا تھا۔

گردوارے کے گیانی جی کی بیٹیاں میری بہن رکمن کے ساتھ جب آنگن میں کھیلنے آتیں اور پینگ پر جھولتی ہوئی گیت گاتیں تو کیسری اپنی دیوار سے ہمارے آنگن میں جھانکتی وہ ان دنوں ذرا سی بچی تھی یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ رکمن یوں بھی اس سے بڑی تھی اور جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں، ٹانگ برابر لڑکیوں کو کب اپنے ساتھ کھلاتی ہیں۔ میں ان دنوں سکول میں پڑھتا تھا اور لڑکیوں کی طرف بہت حقارت سے دیکھتا جب میری بہنیں مجھے ویر کہہ کر مجھے اپنا کوئی کام کہتیں تو میں بہت منتیں کروانے کے بعد بھی ان کے کام کر کے نہ دیتا۔ رکمن کی سہیلیاں، گلی کی لڑکیاں سب مل کر آنگن میں خوب شور

مچاتیں اور کیسری کو میں دیکھتا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیوار کے پار سے چمکتیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔ پھر اس کی ماں آواز دیتی اور وہ یوں غائب ہو جاتی جیسے کسی نہر کے بہتے پانی میں ڈبکی لگائی ہو۔ ہوا میں بلبلے سے پھوٹنے لگتے اور دیوار کا وہ ٹکڑا سات رنگوں میں نہا جاتا جیسے آکاش پر سے پینگ کے رنگ دھرتی پر آن براجے ہوں۔

مجھے کیسری کی ان دنوں کی صورت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ صرف نیم کے پتوں میں جھولتے جھونکے یاد ہیں اور گیانی جی کی وہ بیٹیاں جو رکمن کے پہلے یا پیچھے بیاہی گئیں اور جب بچوں کے ساتھ رکمن سے ملنے ہمارے گھر آئی ہیں تو عورتیں لگتی تھیں۔ میں نے اسکول ختم کیا تو باپو نے مجھے کالج میں پڑھنے امرت سر بھیج دیا۔ گوندوال میرے لیے ایک ایسا ماضی بن گیا جس کو فارغ گھڑیوں میں رات کو بستر میں گھس کر یا گنوں کے رس کی باس کو سونگھ کر یاد کیا جا سکے۔ اور میں بہت ہی مصروف ہوں۔ آج تک مجھے کیسری کو یاد کرنے کی فرصت کب ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو وہاں میرا دل ہی کب لگتا تھا۔ میرے ماما کا گھر شہر میں تھا اور میں اکثر چھٹیاں شہر میں گزارتا، پڑھنے میں لگا رہتا اور میڈیکل کالج کی لڑکیوں کو پریاں سمجھتا جو ہاتھ نہیں آ سکتیں۔ اوہ پر بات تو کیسری کی ہو رہی ہے۔ جب میں مقابلے کے

امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور بڑا بننے کے سپنے دیکھنے تک کی فرصت نہ تھی
مجھے باپو کی چٹھی ملی کہ ماں بہت بیمار ہے۔ اور میں گھر آؤں۔ گاڑی جنتی پور کے
اسٹیشن پر رکی ہے تو شام کا دھندلکا گنوں کے کھیتوں پر نیلا ہو رہا تھا اور گاؤں
تک چلنا مجھے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پھر ان سارے سالوں میں جو ماں سے دور
رہا تھا مجھے دکھ ہو رہا تھا اور مجھے ماں بہت یاد آرہی تھی۔ گھر یاد آرہا تھا اور جانے
کیوں میں اتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا شاید کوئی سواری باپو
نے بھیجی ہو مگر کوئی نہیں تھا اور اسٹیشن کی عمارت سے پرے کھیتوں پر رات
ہولے ہولے اتر رہی تھی ہوا میں تازہ رس کی باس تھی اور گڑ کی مہک تھی پانی
کی بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے میرے سر پر سے گزر رہے تھے میں جانی بوجھی
راہوں پر اجنبیوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ آنگن جس میں نیم کا درخت تھا
مجھے بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔

پھر لال رنگ کے بادلوں سے پرے سورج کا گول تھال سرک گیا اور درختوں
پر چڑیاں زور زور سے بولنے لگیں۔ میرے سر پر سے کوے اور بگلے قطاریں
باندھے گزر گئے۔ شام کی ہوا چلی۔ عورتیں سروں پر چارے کے گٹھے لیے راہ
کی بستیوں میں گم ہوتی گئیں اور گڑ کے کڑھاؤ کے نیچے جلنے والی آگ زیادہ
روشن ہو گئی۔ نہر کی پٹڑی پر چڑھا ہوں تو پانی اندھیرے میں چمکنے لگا اور لہریں

ہولے ہولے مجھے سوتی ہوئی لگیں۔ آم کے باغ کے پاس مجھے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور پھر لگام ہاتھ میں پکڑے ویر وال سے اپنے گاؤں کے طرف مڑنے والی راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔

مجھے دیکھ کر آج کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"ویر تم کہاں سے آرہے ہو؟" اس نے اپنے ۔۔۔۔ کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"شہر سے۔" میں نے اس کے برابر چلتے ہوئے کہا۔ "ماں کا کیا حال ہے؟ مجھے تو آج ہی باپو کی چٹھی ملی تھی کہ ماں بہت بیمار ہے۔"

"چاچی تو اب اچھی ہے۔ پرسوں اس کا جی بہت خراب ہو گیا تھا۔ رکمن بھی آئی ہوئی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لگام گھوڑی پر ڈال دی۔ گھوڑی سر جھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میرے جی پر سے ماں کے اچھے ہونے کا سن کر بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اکا دکا تارے گلی میں کھیلنے والے بچوں کی طرح آکاش پر اکٹھا ہو رہے تھے اور حویلیوں میں دیے ٹمٹما رہے تھے اور کیسری کی آنکھوں میں جوت بہت گہری تھی۔ جیسے اس کے اندر کہیں دیوالی ہو رہی ہو۔ اپنے پاس چلتے ہوئے میں نے ایک عجیب سی سگند اس میں پائی جو نہ کھیتوں کی تھی نہ مٹھاس کی نہ شام کی ہوا کی تھی اور نہ پانی کی۔

گھاس کی میٹھی سی باس بھی نہ تھی اور گردوارے میں جلنے والی بتیوں سی بھی نہیں تھی اکیلی نرالی انوکھی۔

میرا دل اس باس کے ساتھ ساتھ بھٹک رہا تھا۔ اور ہم دونوں گھوڑی کے پیچھے چل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ساری چاچیوں، مامیوں اور بہنوں کی باتیں۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا۔ کیسری کا بیاہ اب تک کیوں نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ کی ساری کنواریاں بیاہی جا چکی تھیں۔ ہمارے آنگن میں نیم تلے ہولے ہولے نئی جوان ہوتی لڑکیوں نے رکمن کی سہیلیوں کی جگہ اپنا ڈیرا جمالیا تھا۔

جب گوندوال دکھائی دینے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آ رہی تھیں، ویروال کس کام سے گئی تھیں؟“

مدھم پڑتی روشنی میں، جو اجالے سے زیادہ اندھیرا لگتی ہے، پر جس پر چیزوں کی شبیہہ مٹ نہیں سکتی۔ میں نے نیلاہٹ کی پرچھائیں میں جو رات اور شام کچھ نہ تھی۔ کیسری کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ تپ گیا تھا اور لمبی لمبی پلکیں ان بڑی بڑی آنکھوں پر یوں جھکی تھیں جیسے وہ نئی دلہن ہو۔ اس نے میری طرف دیکھے بنا جواب دیا۔ ”روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے۔“

”کون روپ سنگھ؟“ میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”لمبڑوں کا پوت۔“ اس نے یوں جھنجھلا کر جواب دیا جیسے اسے میرے بھول جانے کی کوشش پر غصہ آ رہا ہو۔

”اچھا ویروال والے لمبڑوں کا روپ سنگھ۔ اس نے اسکول ختم کر لیا ہے۔“ میں نے اپنے یاد ہونے کی قوت پر خوش ہوتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ ”وہ ولایت کیوں جا رہا ہے اس کا باپو تو پڑھنے والے لوگوں کے خلاف ہے۔ وہ روپ سنگھ کو کیسے اتنی دور بھیج رہا ہے۔“

میں نے ایک سانس میں اتنی ساری کہہ دیں۔

”روپ سنگھ کہتا ہے ولایت سے آ کر وہ اپنے باپ کی زمینوں سے بے فکر ہو جائے گا اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو جائے گا۔“ کیسری نے بہت دھیرے سے یوں کہا جیسے وہ رس کے گھونٹ پی رہی ہو اور مٹھاس سے اس کے ہونٹ چپک رہے ہوں۔ شام کی ہوا میں میں نے اس کی لمبی چوٹی کو اس کے پیچھے لہراتے دیکھا۔ جب وہ اپنی حویلی کی طرف جانے کے لیے گھوڑی کی باگ پکڑ کر مڑ گئی ہے۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ رکمن سے نکلتے ہوئے قد کی، جیسے درخت کی ٹہنی میں سے نئی پھوٹی ہوئی لمبی شاخ ہو۔ سرخ پتوں سے بھری ہوئی اور زندگی کے رس سے چمکتی ہوئی۔

آج بھی جب وہ عدالت میں کھڑی تھی زندگی کا رس اس کے انگوں سے چھلکتا تھا۔ سیدھی نئ نویلی شاخ کی طرح چمکتی ہوئی وہی کیسری جو اس شام کو گوندوال کی گلیوں میں لمبڑوں کے روپ سنگھ کا سوچتی ہوئی گھوڑی کی باگ پکڑے ہولے ہولے جارہی تھی اور جس کے ہونٹ ایک نام کی مٹھاس سے چپک رہے تھے۔

میں حیران ہوں اور سوچ نہیں سکتا کہ مٹھاس بھی زہر بن سکتی ہے؟

گوندوال میں میں بہت کم ٹھہرا۔ ماں کا جی اچھا تھا وہ میرے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ رکمن کے آدھ درجن بچوں نے شور مچا کر میرا سر کھا لیا۔ ملنے والوں نے مجھے پریشان کر دیا اور آنے والے مقابلے کے امتحان کی یاد نے میرا دو دن وہاں ٹھہرنا مشکل کر دیا۔

تیسرے دن جب میں شہر آرہا تھا تو جنتی پور تک باپو مجھے چھوڑنے آیا۔ گاڑی کے آنے تک وہ مجھ سے گھر، کھیتوں، محصول اور لوگوں کی باتیں کرتا رہا۔ پھر دبی زبان سے اس نے ان لمبڑوں کا ذکر کیا جو چاہتے تھے کہ اپنی بیٹی مجھے دیں مگر جو بات خود نہ کہنا چاہتے تھے۔ تب اس گھڑی مجھے کیسری یاد آئی اور میں نے باپو سے پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے روپ سنگھ ولایت جارہا ہے؟“

”ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی۔“ باپو نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تجھے کون یہ بات بتا گیا ہے؟“

تب میں نے یونہی کسی وفا کی خاطر نہیں بس ایسے ہی کیسری کا نام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور باپو سے کہا۔ ”مجھے ملنے والوں میں سے کسی نے بتایا ہے۔“

باپو نے ہولے سے کہا۔ ”ہمارے گاؤں میں سے تو کسی کو معلوم نہیں شاید چیت سنگھ کے گھر سے بات نکلی ہو۔ تمھیں نہیں پتہ لوگ کیسری اور روپ سنگھ کے لیے کیا کیا کہتے ہیں؟“

میں پھر بھی چپ رہا تو باپو نے کہا۔ ”ایک طرح سے تو اچھا ہی ہے وہ ولایت چلا جائے گا تو کیسری اس کے جادو سے نکل جائے گی وہاں اس کا دل کسی اور میں لگے گا۔ واہ گرو کسی کو ایسی لڑکی نہ دے کیسری تو ڈائن ہے گاؤں میں سے کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔“ پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگا۔ ”توبہ توبہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں کسی کی باتیں کیوں کروں۔ ہو سکتا ہے لوگ جھوٹ کہتے ہوں۔ کیسری ذرا دلیر سی لڑکی ہے۔“ اور تب مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جو ہمارے آنگن میں دیوار کے اوپر سے جھانکتی تھیں اور ایسی لگتی تھیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔

گوندوال بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں مقابلے کے امتحان میں اول آیا اور اکیڈیمی
کی ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ ایک سال کے بعد جہاں میری پوسٹنگ ہوئی ماں
بھی وہیں پر آگئی۔ اصل میں وہ مجھ سے میری شادی کی بات کرنے آئی تھی۔
پر ان دنوں میں گرداس پور کے بشن سنگھ کے گھر میں بہت آتا جاتا تھا اور اس
کی تیج کور سے جو نمی کہلاتی تھی، انگریزی تیزی سے بولتی تھی اور ولایتی میموں
کے سے بال بناتی تھی، زبردستی عشق کر رہا تھا۔ ویروال اور لمبڑوں کا قصہ
میرے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ میرے طور طریقے دیکھ کر میری دھیرج والی ماں
نے شادی کی بات نہ کی۔ جب شام کو ہم سب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو وہ
گاؤں اور ہمسایوں کی باتیں کرتی رہی۔

میں نے پوچھا۔ "ماں کیسری کا بیاہ ہو گیا؟"

اور ماں نے بہت ہی دکھی دل سے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا:

"کہاں اس کا بیاہ ہو گا۔ وہ کسی کو پسند بھی کرے۔ اس نے چیت سنگھ سے صاف
صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک روپ سنگھ نہ آئے گا وہ انتظار کرے گی۔ بتاؤ تو۔
تم تو لمبڑوں کی لڑکی سے بیاہ نہیں کرنا چاہتے اور نمی کے پیچھے پھرتے ہو وہ جو
ولایت گیا ہے بھلا آ کر اس کو پوچھے گا سہی!" پھر بہت آہستہ سے کہنے
لگی۔ "یوں بھی اب کون اس کو قبول کرے گا۔ وہ کسی سے کوئی بات چھپاتی

تھوڑا ہے۔ جانے کس مٹی کی بنی ہے اتنی بے شرم لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ واہ گرو کرے اسے تو موت آجائے۔ اس کی ماں نے تو اب طعنوں کے ڈر سے گلی محلے میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

جب ماں نے بات ختم کرلی تو میں نے کہا۔ "ماں تجھ سے کس نے کہا ہے کہ میں نمی کے پیچھے پھرتا ہوں۔ وہ تو بشن سنگھ کمشنر ہے نا۔ اور آدمی کو اپنی آئندہ ترقی کے لیے کسی نہ کسی سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ تو جہاں بھی میرا بیاہ کرے مجھے منظور ہو گا۔ بھلا میں اب ایسا بھی کیا نالائق ہوں کہ تیری بات نہ مانوں گا۔ میں کوئی کیسری ہوں۔"

ماں نے خوش ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ میرے سر کو پیار کیا اور بولی۔ "بس تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ لمبڑوں کی جگجیت بڑی سندر اور کم زبان ہے۔ تو ایک ہی تو میرا پوت ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں ایسی بہو آئے جو کم از کم میرے ساتھ مل کر تو رہ سکے۔"

اپنے بیاہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جوت ویسی ہی تھی جیسے اندر دیے جل رہے ہوں۔ وہ لڑکیوں کی جھرمٹ میں بیٹھی سب سے الگ جان پڑتی تھی اور اس کی آواز سب سے اونچی اور میٹھی تھی۔ آج وہ دیوار کے پار سے ہمارے گھر آگئی تھی اور رکمن کے ساتھ کام کرتی سرخ کپڑے

پہنے چھم چھم کرتی پھرتی تھی جہاں اور لڑکیاں باتیں کرتی اور ہنستی پھر رہی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی جگجیت کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کاڑھے گیتوں کے درمیان اٹھتی جاتی تھی۔ کیسری کے چہرے پر ایک سایہ سا تھا جیسے دیوں کی لو کے اوپر سے کوئی گزر رہا ہو اس کی آنکھوں پر نہیں پلکوں پر میں نے یادوں اور بیتی گھڑیوں، راہ دیکھتے رہنے کی تھکن کو دیکھا مگر وہ ہنس رہی تھی اور نہال ہو رہی تھی۔

جگجیت کو شہر لے جانے سے ایک دن پہلے میں یونہی کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ سردیوں کی شام گاؤں کو ذرا جلدی آ لیتی ہے دور تک آکاش اور زمین کھیتوں کے اوپر سے ملنے کے لیے جھکتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گلیاں سونی ہو جاتی ہیں۔ آوارہ کتے چوں چوں کرتے بھٹیوں کی راکھ میں سر چھپانے کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ گائیں بھینسیں تھانوں پر بندھی اپنے گلے میں پڑی گھنٹیوں کو سر کی حرکت سے بجاتی ہیں۔ گھروں کے اندر دیے جلتے ہیں۔ اپلوں کی آگ بھڑکتی نہیں بس جلتی ہے۔ کوٹھڑیوں میں بچے تل شکر کھاتے ہیں۔ عورتیں چرخے کاتتی ہیں اور جوان لڑکیاں گیت کے بول اٹھاتی ہیں۔ بند دروازوں کے پیچھے کھیتوں اور فصلوں کی باتیں کرتے کسان اپنے لڑکوں کو موسم کی باتیں بتاتے ہیں۔ کہانیاں نیلے دھوئیں کے دھندلکے میں سہانی لگتی

ہیں اور دیے کی لو ہولے ہولے اندھیرے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔
حویلیوں میں گھوڑیاں ہنہناتی ہیں اور شراب پی کر مدہوش جوان اپنے اپنے
عشق کے قصے کہتے ہیں۔ پرائی بہنوں کی باتیں کرتے ہیں اور گندے گیت
گاتے ہیں۔

وہ رات چاندنی تھی اور روشنی میں گندم کے کھیت لہلہاتے ہوئے بھلے لگتے تھے
میں دل میں سوچ رہا تھا نمی کیا کہے گی۔ کیا وہ اسی طرح میرے ہاتھ میں ہاتھ
دیے کلب میں گھومے گی۔ کیا وہ اسی دل جمعی کے ساتھ ٹینس کھیلے گی۔ اس
نے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے میں کتنا عزیز ہوں مگر دوسروں کو چھوڑ
کر میرے ساتھ پھرنے اور ہر مجمع میں میرے ساتھ دیکھے جانے کی آخر کوئی
تسلی ہو گی۔ میں نے بشن سنگھ کو بتایا تھا کہ کسی کام سے گاؤں جا رہا ہوں۔ اب
جبکہ اسے پتہ چل چکا ہو گا، وہ کیا کہے گا۔ اس کی لڑکی؟ مگر جگجیت کی آنکھوں
میں کاجل کی دھار بہت تیز تھی اس کے جسم کی سگندھ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔
میں جگجیت کی سادگی پر فدا ہو گیا تھا۔ اس پر صرف میرا حق تھا وہ صرف میری
تھی۔ نمی اس رات سے پہلے مجھے کبھی یاد بھی نہ آئی تھی۔
پھر میں نے کیسری کو دیکھا۔

اس نے بنا کچھ کہے مجھ سے پوچھا۔ ”ویر کیا ولایت کی عورتیں مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں؟“ وہ میرے سامنے راہ پر کھڑی تھی اور چاند کی کرنوں کا دھارا اس کی آنکھوں اور پلکوں پر کانپ رہا تھا۔ میں نے پاؤں سے سر تک اسے دیکھا خاموشی سے جیسے میں اس کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہا ہوں۔ اسے پیمانے میں ناپ رہا ہوں۔ اسے ترازو میں تول رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اس کے چہرے کی موہنی جیسے موتی کی چمک ہو۔ وہ میرے سامنے سانس روکے کھڑی تھی اور میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے اس رات پہلی بار دیکھا کہ کیسری کا حسن اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سادگی کا مقابلہ دنیا کی کوئی شے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دنیا کی ساری عورتوں سے اونچی تھی۔ آج تک جتنی کہانیاں میں نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ جتنی عورتوں کی سندرتا کو میں نے محسوس کیا تھا وہ سب کچھ اس کے سامنے دھول تھا۔ کیسری جیسا آج تک بھگوان نے کوئی پیدا نہ کیا تھا۔ اس کی آن بان رانیوں سے بڑھ کر تھی۔ ان آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ ان بانہوں میں چوڑیاں نہ تھیں مگر پھر بھی اس کا سنگھار گزری صدیوں کی عورتوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کنوارپنے کی نرمی اس اداسی کو جانے کیا بنا رہی تھی مگر میں چپ تھا۔

کیسری نے پھر کہا۔ ”کیوں ویر کچھ کہتے کیوں نہیں ہو۔ میں گوندوال کی لڑکی ہوں جانے روپ سنگھ کو پسند بھی آؤں کہ نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”کیسری ایسی رات میں یوں گھومنا اچھا نہیں واپس جاؤ۔ اور یقین کر سکتی ہو تو کر لو کہ دنیا نے ایسا ہیرا پیدا نہیں کیا جو اب تک تمھارے مقابلے پر رکھا جا سکے۔“ وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ”ویر یہاں کوئی ایسا نہیں جو میری بات سمجھ سکے میں نے کوئی پاپ نہیں کیا پر کیا کروں لمبڑوں کا لڑکا مجھے جانے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں ساری عمر اس کا انتظار کر سکتی ہوں کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میں اس کی راہ دیکھوں۔ تم مجھے بتاؤ ولایت کیسا دیس ہے؟“

شک اور بے یقینی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے بہت اچھی اچھی باتیں کیں۔ اگلے دن میں جگجیت کو لے کر گاؤں سے چلا آیا۔ اور پھر بشن سنگھ نے میرا تبادلہ بہت دور کروا دیا۔ نوکری کا بھی ایک جادو ہے۔ طاقت کا ایک نشہ ہے اور پھر زندگی غیر معلوم طور پر روز کے چکر میں چلتی ہے تو وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ پانچ سال کے بعد میرا تبادلہ پھر امرت سر کا ہو گیا۔

نمی ایک شام مجھے کلب میں مل گئی۔ ان پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گئی تھی اس کی شادی میری غیر حاضری میں ایک کپتان سے ہو گئی تھی جو شراب پی کر اسے مارتا اور بہک کر پنجابی گیت انگریزی دھنوں میں گانے کی کوشش کرتا تھا۔ بشن سنگھ کی پنشن ہو چکی تھی۔ اور وہ نہر کے کنارے اپنی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ جس کی چوکیداری بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔ کتوں، کبوتروں کا چڑیا گھر سا اس نے بنا رکھا تھا اور دنیا سے اپنے حالوں نمٹ کر وہ اپنی اس بنائی ہوئی جنت میں خوش تھا اور کسی کے دکھ کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ نمی کی حالت پر وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے وہی کیا ہے جو اس نے چاہا ہے۔ کپتان کو گالیاں دیتا اور نمی کو اپنے گھر نہ آنے دیتا۔ میں کلب کے ایک کونے میں بہت دیر تک نمی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کا تیز انگریزی بولنے کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ میدان میں بہنے والی ندی کی طرح روانی اور ٹھہراؤ اس میں پیدا ہو گیا تھا وہ کپتان سے چھٹکارا پانے کے لیے پرانے دوستوں کو ملنے کبھی کبھار کلب میں چلی آتی تھی جہاں وہ شراب پیتی اور اپنی حالت پر روتی رہتی تھی میں اس سے مل کر بہت اداس ہو گیا۔ مجھے بیتے دن بری طرح یاد آئے۔ نمی کا باپ اگر کوشش کرتا تو اس شرابی کپتان سے اچھا کوئی آدمی اس کی بیٹی سے شادی کر لیتا مگر کوشش سے نصیب بدل سکتے ہیں بھلا؟

گھر لوٹا تو جگجیت اور بچے گھر کو سجا رہے تھے روپ سنگھ کا خط آیا تھا وہ کل واپس آنے والا تھا۔ بچے پہلی بار اپنے ماما کو دیکھنے والے تھے۔ جیت کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ بار بار مجھ سے کہتی۔

"جب ویر گیا ہے تو میرا بیاہ نہیں ہوا تھا اب آ کر بچوں کو دیکھے گا تو کیا کہے گا اسے کیسا لگے گا۔" وہ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی شام تک اس کا باپو بھی آ گیا اور گھر یوں جگ مگ کرنے لگا جیسے دیوالی ہو۔

میں اس ساری تیاری کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جگجیت کا لمبڑ باپ مستقل باتیں کر رہا تھا کہ وہ کس طرح روپ سنگھ کو کسی اچھے گھر میں بیاہے گا اور کتنی خوشی کرے گا کہ ساری پچھلی خوشیاں لوگوں کو بھول جائیں۔ اس شام بہت سالوں کے بعد مجھے کیسری یاد آئی اور گوندوال یاد آیا۔ میرا جی چاہا میں گاؤں جاؤں اور اس سے ملوں۔ ولایت کی عورتوں کے حسن کا چرچا اب تو جھوٹا لگنے لگا تھا میں دل ہی دل میں لمبڑ کی باتیں سن کر ہنس رہا تھا۔ بھلا روپ سنگھ کیسری کو بھول سکتا ہے۔ کیسری بھولنے کی چیز نہیں تھی۔

دو چار ماہ کی مصروفیت میٹنگیں اور کانفرنسیں مجھے پھر اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں مگر گاؤں جا کر کیسری اور روپ سنگھ کے حالات معلوم کرنے کی خواہش برابر دل کے ساتھ رہی۔ میں انتظار کرتا رہا کہ کب چھٹیاں ہوں عدالتیں بند

ہوں اور میں گوندوال جاؤں۔ جیت اور اس کا باپو توروز روپ سنگھ کے لیے نئ لڑکیاں دیکھنے کی اسکیمیں بناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

جنتی پور کے اسٹیشن پر کوئی سواری نہ تھی کیونکہ میں بنا اطلاع کیے آیا تھا۔ شام کو چلتے ہوئے گھر تک جانا اور حیران کرنا مجھے سوچ کر ہی بھلا معلوم دیا۔ میں بہت پہلے کی شام کو یاد کر رہا تھا جب ویروال سے گوندوال کی طرف آنے والی راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا تھا میرا ذہن خالی بھی تھا اور ہلکا بھی جیسے خوشی کا سرور نشے کی طرح ابھی سے چھایا جا رہا ہو۔ اماوس کے لیے نہانے جانے والوں کی ٹولیاں کھیتوں کی منڈیروں اور پگڈنڈیوں سے شور مچاتی گزر رہی تھیں، شراب پی کر بہکے ہوئے دیہاتی گالیاں بکتے بھاگتے جاتے تھے اونچی آواز میں ماہیا گاتے ہوئے چور ڈاکو گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے، ایک میلہ سا کھیتوں کے کنارے سے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

ویروال سے لوگ شام ہو جانے کے باوجود آ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں شام چڑھی لاٹھیاں تھیں اور داڑھیوں کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عورتیں روتے بچوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی لائی تھیں۔ اور نہانے کے شوق میں اپنے جوؤں سے بھرے سر کھجا رہی تھیں۔ میں ناقابل یقین کشش محسوس کر رہا تھا

یوں جیسے اگر زمین کے بازو ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے تو میں اس کے سینے سے لگ کر ایک ٹھنڈک محسوس کروں گا۔

روپ سنگھ کی شادی کی باتیں جو جگجیت اور اس کا باپو کرتے رہے تھے اور پھر روپ سنگھ کا ان پڑھ لڑکیوں کے ذکر سے ہی چکرانا مجھے یاد آ رہا تھا۔ در اصل میں کیسری کا انجام دیکھنے کے لیے گاؤں جا رہا تھا۔

لوگ تالاب کی طرف چلے گئے راستہ سنسان ہو گیا اور دور ہوتے ہوئے گیتوں کے بول مجھے شمشان میں گائے جانے والے منتروں کی چاپ کی طرح لگنے لگے اور تاروں کے جھرمٹ اندھیری رات میں ڈرتے ہوئے بچوں کی طرح ٹولیاں سی بنا کر آکاش پر آنے لگے۔ ہر شے تاریکی میں چھپی ہوئی تھی۔ ٹروں کے چرچرانے کی آواز ایک کبھی نہ ختم والے سر کی طرح درختوں اور راہوں، ٹہنیوں اور پتوں، کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر سے بہتی جاتی تھی۔

پھر میں نے تیز بھاگتے گھوڑے کی ٹاپوں کو سنا اور وہ شور قریب آتا گیا، اور قریب آتا گیا۔ اب میں اس موڑ پر تھا جہاں سے نہر دوسری طرف مڑ جاتی ہے اور گوندوال کا راستہ نیچے اتر جاتا ہے سرکنڈوں سے بنے اونچے نالے کے کنارے کو اندھیرے نے ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ اماوس کی رات کو قتل ہوتے ہیں اور پھر ایسے ایسے واقعات جن کا کوئی کھوج نہیں مل سکتا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا پھر

آنے والا اس کالی رات میں گھوڑا دوڑاتا ہوا کون ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تھیلے میں ٹارچ تھی۔ میں نے اسے نکال کر ہاتھ میں لیا اور سرکنڈوں والے کنارے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

روشنی گھوڑی کی آنکھوں پر پڑی ہے تو وہ الف ہو گئی اور ہنہنا کے اس نے سوار کو جو اس مصیبت کے لیے تیار نہیں تھا گرا دیا۔ میں بھاگ کر آگے آیا اور سوار کو اٹھانے کے لیے جھکا ہوں تو وہ کیسری تھی۔۔۔۔

”روپ سنگھ واپس آ گیا ہے کیسری۔“ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم ویر وال سے اسے مل کر آ رہی ہو؟“

”ہاں ویر میں اسے مل کر آ رہی ہوں۔ روز روز ملنے کے لیے جانے میں مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں اسے اپنے ساتھ ہی لے آئی ہوں۔“ اور اس نے پاس کھڑی گھوڑی کی باگ کھینچ کر تھیلے پر ہاتھ رکھا جو کاٹھی سے لٹک رہا تھا۔

”مگر وہ ہے کہاں مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔“ میں نے ٹارچ جلا کر روشنی ادھر ادھر پھینکی۔

”یہاں۔“ اس نے تھیلے پر ہاتھ مارا ”یہاں۔“

میں نے کہا۔ ”مذاق مت کرو تم کو معلوم ہے میں صرف یہی جاننے کے لیے گاؤں آیا ہوں تم روپ سنگھ کے ساتھ بیاہ کروا سکی ہو کہ نہیں۔ مجھے تو وہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا تمھارے ساتھ تو وہ نہیں بدلا۔“

”نہیں وہ نہیں بدل سکتا تھا میں اسے بدلنے کب دیتی بھلا۔ اب وہ بدل ہی نہیں سکتا ویر۔“ اور وہ زور سے ہنسنے لگی۔

مجھے خون رگوں میں جمتا ہوا لگا۔ یہ کیسری تھی کیا۔ جو دھیرج سے بات کرتی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور سختی سے پوچھا۔ ”تم ہنس کیوں رہی ہو آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے میں نے تم سے ہمیشہ ہمدردی کی ہے اور جب کہ تم خوش ہو مجھے بتانا بھی نہیں چاہتیں۔“

وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور اسی دھیرج سے بولی۔ ”ویر زیادہ خوشی آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے نا۔ مگر تم میرے ویر ہو اور تم کو نہ بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی بھلا۔“ پھر وہ تھیلے کی ڈوریاں کھولنے لگی۔

”ویر ذرا بتی تو جلاؤ۔ مگر پہلے چادر سے پردہ کر لو۔ کوئی اور نہ دیکھ لے۔“

میں ایک جادو کے اثر میں آئے انسان کی طرح چادر لے کر ہاتھ سے اوٹ کرنے لگا اور جب میں نے چادر کا کونا پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے بتی

جلائی تو کیسری روپ سنگھ کا سر تھیلے سے نکالے بیٹھی تھی اور ان آنکھوں میں یوں جھانک رہی تھی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

"کیسری تم نے یہ کیا کیا ہے۔" میں نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ویر کچھ نہیں۔" اس کی آواز کی سردی مجھے اپنی کپکپاہٹ کے مقابلے میں بہت عجیب لگی۔ اور پھر سر کو واپس تھیلے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"اب میں جاؤں کوئی دیکھ نہ لے۔"

"مگر اسے ساتھ لیے کیوں پھرتی ہو۔" میں نے مستقبل کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی اور تھیلے کو کاٹھی کے ساتھ لٹکاتے ہوئے بولی۔ "اسی کو ساتھ لیے پھرنے کے لیے تو میں نے آج تک گھڑیاں گن گن کر گزاری ہیں، ویر اب اسے کیوں پھینک دوں۔"

"مگر کیسری تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔" میں نے یونہی کہنے کے لیے کہا۔

"ویر بھلا میں پاگل ہو سکتی ہوں۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ روپ سے کیسے ملا جائے۔ میں نے ان ٹھنڈی راتوں میں نہر کے کنارے اس درخت کے نیچے پوری پوری رات اس کا انتظار کیا ہے اور اب مہینوں کے بعد جب وہ یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ وہ مجھ سے بیاہ نہیں کر سکتا اور میں اسے تنگ نہ کروں،

میں بھلا اسے واپس کیسے جانے دیتی۔ اب میں اسے دیکھ تو سکوں گی۔ ویر وال کے راستے اب تک مجھے برداشت کرتے رہے تھے۔ اب کیوں میں ساری عمر ان راہوں کا چکر کروں؟"

میں نے اسے بہت کہا۔ "کیسری یہ سر کہیں چھپادو۔ اس بات کا کسی کو پتہ نہیں ہے تم موت سے بچ جاؤ گی۔ تمھیں قانون کا پتہ نہیں ہے کیا بننے والا ہے۔" مگر اس نے کہا تو صرف یہ کہ "میں قانون سے نہیں ڈرتی تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میں اسے اتنا چھپا کر رکھوں گی کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔ لمبڑوں کے پوت نے پاگلوں کی طرح جھانک کر اور پیچھا کر کے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ اب میں اسے چھپا کر رکھوں گی اور اکیلے میں دیکھا کروں گی۔"

میں نے روشنی بجھادی اور خاموشی سے کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی۔ "تمھیں پتہ نہیں ویر، یہ آنکھیں مجھے کتنی پیاری تھیں، یہ ہونٹ کتنے میٹھے تھے۔ دانت تو موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ان نگاہوں نے مجھے کتنی کہانیاں سنائی ہیں۔ تمھیں معلوم نہیں ویر مجھے روپ سنگھ کے بنا زندگی کتنی سونی لگتی۔ کیا میں اس کے بغیر جی لیتی؟ اگر اسے دوسری عورت کا بننا پڑتا تو مجھے رنج ہوتا۔ اگر وہ وہاں سے کوئی میم لے آتا تو میں کیا کر لیتی۔ مگر وہ میم

نہیں لایا۔ یہاں اس کو لوگوں نے بدل دیا تھا دو مہینوں سے میں اس کی راہوں میں بیٹھی اسے ملنا چاہتی رہی ہوں مگر وہ مجھ سے نہیں ملا۔"

"پھر آج وہ کیسے قابو میں آیا؟"

"آج" اس نے ہولے سے کہا۔ "آج اماوس کی رات تھی اور میں نے اس کے ایک پرانے یار کو بھیجا تھا کہ اسے بلا لائے۔"

وہ چپ ہو گئی تو میں نے کہا۔ "کیا اس آدمی نے اسے ساتھ لانے میں تمھاری مدد کی تھی۔" میں نے اپنے اندر کے افسر کو جاگتے ہوئے محسوس کیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ "روپ سنگھ جب تک مجھے دیکھ نہیں لیتا تھا۔ اسے چین نہیں آتا تھا اور آج میں نے اسے کہا تھا کہ تمھیں دیکھے بنا میں نہیں جی سکتی۔"

پھر وہ گوندوال کی راہ پر آگے چلی گئی اور آگے چلی گئی۔

آج اس کی اپیل کا فیصلہ تھا۔ میرے سامنے جگجیت تھی اور اس کا باپو تھا۔ انصاف تھا اور وہی ترازو تھا جس میں میں نے اس چاندنی رات میں کیسری کے حسن کو تولا تھا اس کے چہرے کی موہنی اور آنکھوں کی اداسی کو جانچا تھا۔ وہ مجھے ویر کہتی تھی اور مجھ پر وشواش رکھتی تھی اور پھر عدالت میں میری وہ کرسی تھی۔

روپ سنگھ کے بنا کیسری جی نہیں سکتی تھی اور میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا، ان ہونٹوں کی مٹھاس زہر بن گئی اور اس رات روپ سنگھ کی حیرت سے کھلی آنکھوں کی طرح آج کیسری کی آنکھیں بھی حیرت سے فیصلہ سننے کے بعد کھلی ہوئی میری طرف تکتی رہی تھیں اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا مگر میرے قدم پاتال کی طرف کیوں اٹھ رہے ہیں۔ میں گر کیوں رہا ہوں اور میرے قدموں میں بار بار وہ نگاہیں کیوں آ رہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ شاید یہ گرمی کا اثر ہے۔

رات کی ماں

بڑی نہر کی چوڑی پٹڑی پر کھڑے ہوں تو ٹیلوں کے درمیان پواروں کی بستی یوں دکھائی دیتی ہے جیسے کسی نے چھوٹے چھوٹے گڑیا گھر ادھر ادھر پھیلا کر رکھ چھوڑے ہوں۔ دور تک پھیلے کھیت پر ان کے سروں پر ابھرتے ہوئے یہ مٹی کے پہاڑ آویوں سے اٹھتا دھواں اور ایک گھر سے دوسرے تک آتی جاتی بہوؤں کے قدموں تلے بچھی یہ پگڈنڈیاں بستی سے دور ایک سپنا سا جان پڑتی ہے۔پٹڑی پر نہر کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جاؤ تو راستہ شہر کی طرف اتر جاتا ہے اور اگر بستی کی طرف آنا چاہا ہو تو راجباہ کے لکڑی کے پل پر سے پیچھے کی طرف پلٹ کر ٹیلوں کی اونچی نیچی ڈھلوانوں پر سائیکل سمیت چلنا بہت مشکل لگتا ہے۔ جتنی یہ بستی ستھری ہے اتنا ہی اس کا راہ اکھڑ بکھڑا اور خراب ہے۔ پر بستی میں داخل ہونے پر ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ شیشم کے جھنڈ تلے نورو کمہار کا جھونپڑا لپا پُتا صاف ستھرا جیسے ابھی چاک پر سے اترا ہو۔ جانے اس گھر کے گرد یہ گیلے پن کا احساس کیوں ہوتا ہے گیلا اور ٹھنڈا اور سکون دینے والا۔

سائے میں ایک طرف گائے بندھی رہتی ہے اور کھٹیا کے ساتھ کپڑے کے جھولے میں بچہ سویا رہتا ہے۔ نورو کی بہو جھانجھریں بجاتی ایسے ہولے ہولے قدم دھرتی ہے مانو کچے برتنوں پر چل رہی ہو اور اسے ڈر ہو کہ کوئی ٹوٹ نہ جائے۔ کندن اس بستی کی لڑکی نہیں گل خان اسے بہت دور سے بیاہ کر لایا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب بستی کے دوسرے گھروں میں ساس بہو کی جنگ ہوتی ہے تو بہوئیں آگے سے ہاتھ ہلا ہلا کر لڑتی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک الگ جھونپڑا کسی ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے مگر کندن کسی بات کا جواب کبھی نہیں دیتی۔

پر جو بات میں کرنے جا رہا ہوں وہ ختم ہوتے پھاگن کے ایک سویرے سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے شام گھٹا گھنیرے بالوں کے جال کی طرح بستی پر چھائی ہوئی تھی اور میں ڈاک کا کام نپٹائے بنا ہی اپنی بستی کو لوٹ گیا تھا ساری رات بوندیں پڑتی رہیں اور صبح ہونے کے قریب اولوں کی برکھا ہوئی میں سوچتا رہا تھا کہ اگر آج یہ بارش نہ رکی تو جانا مشکل پڑ جائے گا مدرسے کا سالانہ معائنہ قریب تھا اور لڑکوں پر جان کھپانی ضروری تھی، عزت کا سوال تھا، انسپکٹر نیا نیا آیا تھا اور کسی تحفے سے رام نہیں ہوتا تھا۔ لاکھ منت سماجت کی اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو پاتا کام دیکھ کر خوش ہوتا، یوں آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ

میں کام چور آدمی نہیں ہوں محنت بھی کرتا ہوں پر لڑکوں اور پھر بستی کے لڑکوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا کبھی ہل چلانے کے لیے وافر آدمیوں کی ضرورت ہوئی تو اسکول سے رخصت لے لی کبھی ڈھور ڈنگر بیمار ہوئے تو ٹہل سیوا کے لیے باپ بھائیوں نے روک لیا پھر سال کے آخر میں ان کا نئی جماعت میں پڑھنا بھی عزت کا سوال بن جاتا ہے اور تم جانو لحاظ کرنا پڑ ہی جاتا ہے اور اسی لیے میں آنے والے معائنے کے خیال سے فکر مند تھا مگر تیز ہوا گھٹا کو اڑا لے گئی روشن چمکیلے رنگ برنگ کے بادل کوچ کرنے لگے جیسے فوجیں حرکت میں ہوں۔ سورج کبھی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی اس کا ایک کنگرہ اس روشنی اور چمک میں یوں دکھائی دیتا جیسے کسی کنواری نے گندم کے سنہری بالوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر ذرا دیر کے لیے باہر جھانکا ہو۔ میں چلا ہوں تو نئی نئی خوشبوئیں دھرتی کی باس میں ملی میٹھی مدھر سوگند کسی گیت کے بول کی طرح میرے گرد ہو گئیں۔ بھیگی زمین کسی پاگل عورت کی طرح اپنے سارے خزانے سامنے سجا دیتی ہے ذرا ذرا سے پھول گھاس، کونپلیں اور لہراتی ہوئی خوشبوئیں کبھی سامنے کی طرف منہ کر کے چل رہے ہو تو گندم کی بالوں کی مہک ہو گی دوسری طرف منہ کرو تو پانی پر سے آتی ہوا کی نمی میں ملی ہوئی انوکھی نرالی باس ہو گی جس کو پہچاننا مشکل ہو گا۔ آدمی گیلی بارش سے نہائی

دھرتی پر چلتا آپ بھی پاگل ہونے لگتا ہے پھر بھری ہوئی چھلکتی نہر کے کنارے ریشمی بوریوں لہرا رہے تھے جیسے کسی راج رانی کا بجرا ان لہروں پر سے بہتا جاتا ہو دھلے ہوئے درخت دنیا کا یہ نرالا روپ۔

گنگناتے ہوئے میں نے ریشمی ٹیلوں اور دھلی ہوئی راہوں پر سائیکل موڑا، پواروں کی بستی کی طرف اترا ہوں تو مجھے بہت سی آوازیں سنائی دیں جیسے کئی آدمی ایک ساتھ بولنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

کندن کی ساس بہت زبان دراز ہے۔ ساری بستی اس سے پناہ مانگتی ہے، عورتیں کہتی ہیں اچھا ہے جو اس کا گھر بستی کے ایک سرے پر ہے اگر کہیں محلے کے درمیان ہوتا تو یہ سب کا جینا حرام کر دیتی۔ عجیب طنطنے کی عورت ہے بولنے پر آئے تو بولتی چلی جاتی ہے گالیاں اس کے منہ سے نکلتے میں ایک الگ زندگی بنا لیتی ہیں اور اس سویرے کو جس کی بات میں تمھیں سنا رہی ہوں وہ کبھی جھونپڑے کے اندر جاتی اور کبھی باہر آتی پھر کونے میں بیٹھی کندن کے سر پر ایک دو ہتھڑ مارتی اور پھر اندر چلی جاتی، کبھی گائے کو کھولنے اور پھر اسے باندھ دیتی۔ کندن کی بے بیاہی نند بڑی عمر کی عورتوں کی طرح ہاتھ چلا چلا کر گالیاں بک رہی تھی جو اس کی ماں کی گلیوں کے شور میں مل کر اور جنون پیدا کر رہی تھیں۔ گل خان کھاٹ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا جو اس کی ماں اس کے سامنے جا

کھڑی ہو جاتی اور اپنا سر پیٹنے لگتی۔ لڑتے ہوئے گالیاں بکتے آدمی دیکھنے والے کو بالکل پاگل لگتے ہیں ایک دم دیوانے میں یہ تماشا سمجھنے کی کوشش کرتا اور راہگیروں کے ساتھ بہت دیر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اسکول کا وقت ہو چکا تھا اور پھر ایسے ہنگامے تو بستی میں روز ہوتے ہیں۔

شام آموں کے بور کی باس کی طرح بوجھل بوجھل سی میرے گرد درختوں کے گھرے ہوئے سایوں کی طرح پھیل رہی تھی۔ میرا دل یوں ہی اداس تھا رات سے میرے بچے کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ میں دوا لے کر جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا مگر میرا کام باقی تھا اور حکیم کی دوکان دوسری بستی میں تھی۔ میں خطوں پر مہریں لگا کر انھیں تھیلے میں ڈالتا جاتا تھا۔ آخری کارڈ پر مہر لگا کر میں نے ذرا آسودگی کا سانس لیا اور حقے کا ایک کش لے کر جو تھیلے کی ڈوری کسنے لگا ہوں تو میں نے باغ کے دوسرے کنارے سے کندن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ شام کے سرخ سایوں اور آم کے پیڑوں کی تاریک چھاؤں میں چلتی مجھے خوشبو کا ہیولیٰ لگی۔

''منشی کاکا ایک خط تو لکھ دو۔'' اس نے میرے پاس آکر کہا۔

''کیوں کیا ماں اور بھیا کو بلوانا ہے۔'' میں نے قلمدان کھول کر دوات میں قلم مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں منشی کاکا اب انھیں کا ہے روز روز بلواؤں۔" اس نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا اس کی یہ مسکراہٹ جیسے چاند کی چاندنی گھنیرے بادلوں کی اوٹ سے چھن کر آئے اور بھی اداس کر گئی۔ "پھر کہاں لکھواؤ گی۔" میں نے کارڈ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"ماں کو لکھنا ہے کاکا کہ میں راضی خوشی ہوں اچھی طرح سے ہوں۔ سنی سنائی بات پر اعتبار نہ کریں۔" میں لکھنے لگا۔ کھیتوں پر کی ہوا بڑی سہانی تھی اور پیڑوں میں سے چمکتی لال روشنی میں ملی کندن کے زرد گالوں دھلی ہوئی آنکھوں اور بھونرا بالوں کو چھو رہی تھی۔

لکھ کر میں نے پوچھا۔ "اور کیا ہو۔"

کہنے لگی۔ "کاکا ماں اور بھیا کو بہت تاکید سے لکھ دو فکر نہ کریں بھاگے نہ آویں۔ فصل پیچھے میں آپ آؤں گی فکر نہ کریں بالکل۔" وہ سارے لفظ سنبھل کر یوں کہہ رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو میں اس کی سب باتیں لکھ نہ پاؤں گا، کہہ نہ سکوں گا میرے قلم میں وہ زور نہ ہو گا میرے لکھنے کے باوجود اس کی ماں اور بھیا ضرور فکر کریں گے۔

سرسوں کے پھول کی طرح لگتی ہوئی کندن ذرا فکر مند، اداس مگر مطمئن لگ رہی تھی۔

کارڈ لکھ کر میں نے اسے سنا دیا۔

کہنے لگی۔ ”کاکا ذرا اچھی طرح لکھتے کہ ماں اور بھیا میں سے کوئی نہ آئے۔“

میں نے کہا۔ ”اب پتہ لکھواؤ میرا بچہ بیمار ہے اور مجھے دوا لیتے ہوئے گھر جانا ہے۔“

شرمندہ سی ہو کر بولی۔ ”سویرے بستی میں میرے مائیکے کا آدمی اپنے کسی کام سے آیا ہوا تھا۔ روز کی طرح آج بھی ہمارے گھر سویرے سے مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ اس نے بھی سنا ضرور ماں سے جا کر کہے گا اور وہ بھاگی ہوئی آئے گی ہو سکتا ہے بھیا کو بھیج دے اور تم جانو کاکا فصل کے دن ہیں پھر میری ساس کسی کا لحاظ تو نہیں کرتی نامفت میں بے عزت ہونے کا فائدہ۔“

کارڈ پر پتہ لکھ کر تھیلے کی ڈوری کستے ہوئے میں نے کہا۔ ”کندن بی بی تم بھی عجیب ہو۔ دنیا کی لڑکیاں کانٹا بھی چبھتا ہے تو ماں باپ کو پکارتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ روز روز بک بک ہوتی ہے، پٹتی ہو مگر ماں اور بھیا سے اسے بڑے بھید کی طرح چھپا کر رکھتی ہو۔“

کہنے لگی۔ ”کاکا یہ ساری تو بھرم کی بات ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ یہاں کا مان بیکار کا بول لگنے لگے اور پھر اچھی بری یہاں بیتے گی تو انھیں بلوا کر کیا کروں گی۔ یہ تو ماتھے کا لکھا ہے کبھی سویرا ہو گا سہی۔“

حکیم صاحب کے پاس پہنچا ہوں تو بہت بھیڑ تھی ان کی بستی میں کسی گھر میں بہو ساس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ پھر سمدھی آپس میں لڑ پڑے۔ دونوں خاندانوں میں خوب لاٹھی چلی۔ سارا گاؤں امنڈ کر حکیم صاحب کے دروازے پر جمع تھا۔ جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ میں نے حکیم صاحب کو کندن کی بات بتائی۔ کہنے لگے۔ ”اس کل جگ میں بھی کہیں نہ کہیں کو ستو نتی ہے مگر میری بات یاد رکھو وہ ایک نہ ایک دن ہمت ہار بیٹھے گی۔ سہار کی ایک حد ہوتی ہے اگر تم جو کہتے ہو وہ ٹھیک ہے تو میں اس کی داد دیتا ہوں۔“

دوا لے کر اسٹیشن پر ڈاک پہنچاتا ہوا جب بستی میں پہنچا ہوں تو میری شام اندھیری اور رات پریشان تھی۔ میرا بچہ بہت ہی بیمار تھا میں نے اسے لاکھ بلایا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور وہ دیے بجھ گئے۔ وہ دیے جن کے ہونے سے میری دنیا میں روشنی تھی۔ زندگی میں کڑی محنت اور سارا سارا دن گھر سے باہر رہتے ہوئے ایک خیال ہوتا تھا کہ گھر جا کر بچے سے دل بہلے گا مگر دینے والے کو جانے کیا منظور ہوتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا یارو کہنے والے کہتے ہیں وہ بے انصاف نہیں ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے اگر وہ بے انصاف نہیں تو بے پرواضرور ہے۔ دنوں میرا دل کسی طرح سے نہیں بہل سکا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد میں نہر کے ساتھ ساتھ سائیکل چلاتا آرہا تھااور معائنے کے متعلق سوچ رہا تھا جب کنارے کے سرکنڈوں اور بور میں حرکت ہوئی ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا میں حیران سا سائیکل سے نیچے اتر آیا۔

”بیٹا میں کندن کی ماں ہوں پواروں کی بہو کندن کی ماں گل خان کو تو تم جانتے ہو گے وہ میرا بیٹی کو بیاہ کر لایا ہے۔“

میں چپکا کھڑا رہا۔

”بیٹا وہ روز اسے پیٹتے ہیں یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ وہ پردیسن ہے اس کا یہاں کون بیٹھا ہے جو اس کی مدد کرے گا۔ کسی نے مجھ سے کہا ہے تم منشی ہو اسکول میں پڑھاتے ہو اور عرضی پرزہ لکھ لیتے ہو۔ میں سویرے سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ میں پواروں پر مقدمہ کرنا چاہتی ہوں انھوں نے میری سونے جیسی بیٹی کا مار مار کر برا حال کر دیا ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”اماں جب تمھاری اپنی بیٹی تمھارا ساتھ نہیں دیتی تو تم مقدمہ کس طرح کر سکتی ہو۔“

وہ بولی۔ ”بیٹا اس میں ہنسنے کی بات نہیں اس پر تو انھوں نے جانے کیا جادو ڈال رکھا ہے کہ ہم اسے پرائے لگتے ہیں۔ سدا سے وہ ان کے جادو میں قید تھی۔

گل خان کو جس دن گھر میں نوکر رکھا تھا اسی دن سے میرے دل میں چور تھا کہ یہ کچھ ہو کر رہے گا جادوگر میری بچی کو اتنی دور لے آیا حالانکہ جب اس نے منت کر کر کے مجھ سے میری بیٹی مانگی ہے تو کہتا تھا میں یہیں رہوں گا تب تو اس کے منہ میں زبان نہ تھی اور آج اس کے ہاتھ بہت لمبے ہو گئے ہیں۔"

حالانکہ اسکول پہنچنے کی جلدی تھی میں وہیں نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔

"ماتھے کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا بیٹا۔"

اور آج مجھے لگتا ہے کچھ تحریریں ہوتی ہیں جو ہماری تمھاری سب کی پیشانی سے چمٹی رہتی ہیں۔

جب شہر میں مقدمہ چلا ہے تو بستی میں طوفان آ گیا۔

ایک دوپہر اسکول بند کر کے آدھے دن کے بعد میں گھر جا رہا تھا کہ کندن مجھے آویوں کے پاس کھیت سے پرے ملی۔ بڑی اداس اور سہمی ہوئی سی۔ کہنے لگی۔ "منشی کاکا تم نے ماں کو شہر جا کر مقدمہ کرنے کا راہ دکھایا۔ اور لوگ میرا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے قصور وار سمجھتے ہیں بتاؤ میں کیا کروں؟ ماں سے میں نے کہا تھا کہ میں راضی خوشی ہوں پر اللہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ تمھارا لکھا خط دیر سے پہنچا ہوگا نہیں تو اس آدمی کے لکھے وہ کبھی نہیں آتی تھی اور اب اس نئی مصیبت کا مقابلہ کون کرے۔"

میں نے اسے تسلی۔

مگر وہ کہنے لگی۔ ”کاکا میری ساس کی زبان مجھے اس گھر میں ٹکنے نہیں دے گی میں نے گل خان سے کہا تھا کہ ہم الگ رہ لیں گے مگر اسے تو گھر لوٹنے کا جنون تھا میرے بھیا نے اسے الگ سے زمین دی تھی مگر اسے تو مجھ سے بیر تھا میرا سکھ اس سے دیکھا نہ گیا۔“

میں نے کہا۔ ”گل خان برا آدمی نہیں ہے۔“

کندن نے کہا۔ ”میں کب کہتی ہوں کہ برا آدمی ہے پر میری حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں مجھے جینے نہ دے گی۔ وہ اپنی ماں کے کہنے سے مجھ سے بولتا نہیں اور اب وہ اس کی موسی کی بیٹی سے اس کی دعا خیر کرنے والے ہیں۔“

گل خان میرے اسکول میں چار جماعت تک پڑھا ہوا اور بہت اچھا طالب علم تھا، اس لیے میں نے اس وقت کندن سے وعدہ کیا کہ میں اس سے بات کروں گا اسے سمجھاؤں گا مگر جب ایسی باتیں ایک بار چل نکلتی ہیں تو پھر رواں رہتی ہیں موسی کی بیٹی سے شادی کی نئی بات جب سنی گئی تو سچ ہی ہو گی۔

میں سائیکل تھامے ہولے ہولے فصلوں کے اندر بنے موہوم لکیروں کے سے راستوں پر سے گزرتا جاتا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کندن ان عورتوں میں سے تھی جنھیں کتابوں میں ہم نے ستی ستونتی کے نام سے پڑھا ہے اس میں رانیوں کی

سی آن بان کے ساتھ ایک خود سپردگی کی ادا تھی جو صرف محسوس کر سکو اور مجھے پورا یقین ہے گل خان کو اس کی اس ادا کا پتہ تک نہ ہو گا کیونکہ محسوس کرنے کی قوتیں بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ایک سلجھا ہوا ذہن تو یہ سب باتیں سوچ سکتا ہے ایک عام آدمی نہیں۔ کندن عام عورت نہ تھی اس کے رونے میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور اس کے شکایت کرنے کے انداز میں بھی خودداری تھی۔ جس دن کندن نے عدالت میں جا کر بیان دیا کہ اسے گل خان سے کوئی شکایت نہیں اس دن اس کی ماں کو میں نے دیکھا۔ وہ اکیلی تھی اور کندن کی طرف دیکھے بنا اندر سے نکلی چلی گئی جیسے اس کا کندن سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ گل خان اور اس کے رشتے دار زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے عدالت کے احاطہ میں گھومنے لگے۔ میں نے ذرا دور جا کر اسے پکارا۔ ”موسی۔“

وہ کھڑی ہو گی مگر میری طرف یوں جیسے دیکھا جیسے میں کوئی دشمن ہوں۔

”موسی۔“ میں نے کہا۔ ”تمھیں کندن کے بیان سے رنج تو بہت ہوا ہو گا۔ ساری محنت اور پیسہ برباد ہو گیا مگر میں سمجھتا ہوں وہ ہر قیمت پر اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہے تم کو تو اپنا فرض پورا کرنا تھا سو تم نے پورا کر دیا۔“

وہ ایک گرے ہوئے درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھ گئی اور ماتھے پر سے پسینہ پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔ ”رونا تو یہی ہے کہ وہ جس گھر کو آباد رکھنا چاہتی ہے وہ

آباد نہیں رہ سکتا بیٹا جب عورت اور مرد کے درمیان لحاظ کا پردہ نہ رہے تو زندگی حرام ہو جاتی ہے مجھے تو شروع سے گل خان کی بدلحاظ طبیعت کا پتہ تھا مگر کندن کے دل کا خیال کر کے میں نے اس کی منگنی پہلی جگہ سے چھڑوا کر اسے یہاں بیاہ دیا۔ میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور یہاں یہ نوکرانیوں سے بدتر وقت گزار رہی ہے۔ میں نے ہر شے کو صبر کر لیا تھا مگر اس پر مار پڑے یہ میں کیسے سہہ لوں۔ ارے یہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہی تو مجھے ملے۔ گھر کی خوشی بس انھیں کے دم سے تھی۔ بیٹا اولاد کا دکھ برا ہوتا ہے۔"

وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں تو انھیں نصیحت دینا چاہتی کہ پھر میری کندن کو تنگ نہ کریں۔ میرا مطلب مقدمہ کرنے سے کوئی اس کا گھر اجاڑنا نہیں تھا جب وہ راضی خوشی ہے تو رہے اب میں بھی جیتے جی اس کا منہ نہ دیکھوں گی۔" میں نے سوچا وقتی غصہ ہے جاتا رہے گا۔ کہیں مائیں بھی ایسے وعدے نبھا سکی ہیں۔

اس شام مقدمہ جیتنے کی خوشی میں پواروں کی بستی میں رت جگا ہوا، گل خان اور اس کی ماں بہت خوش تھے۔ کندن کی نندیں جو پرے کی بستیوں میں بیاہی تھیں آئی ہوئی تھیں اور کھانوں پر لدی بیٹھی تھیں، اٹھتیں تو اپنے گھاگھرے سنبھالتیں، مٹک مٹک کر اٹھتیں اور ناز سے چاروں طرف دیکھتیں۔ ان کی

آنکھوں میں غرور کی جوت سی تھی جو ستاروں ٹکے ماتھے پر آئے دوپٹوں کے ساتھ مل کر اور بھی گہری لگتی تھی، ڈھولک بجاتی عورتیں اور راگوں کے نانوں کے پھریرے اڑاتے بولوں سے انھوں نے ایک رنگ پھیلا رکھا تھا یہ جیت کی خوشی کا انوکھا تہوار تھا جس میں کندن یوں چلتی تھی جیسے خواب میں ہو بچے کو لے کر اکیلی اکیلی ویرانوں میں گھومنے والی روح کی سی اداسی اس کے چاروں طرف تھی کبھی ایک جگہ بیٹھتی اور پھر آپ سے آپ اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھتی۔ کوئی اس سے بات ہی نہیں کر رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کو دکھائی ہی نہ دیتی ہو اس کا وجود کہیں ہو ہی نہیں گل خان کی ماں اپنی بہن کی بیٹی پر سے روپے وار کر نقارہ بجانے والے کی بیوی کو پکڑا رہی تھی اور ہنستی جاتی تھی۔ پھر لڑکیوں نے سوانگ بھرے ناچنے والیوں کے گرد دائرہ تنگ ہو گیا۔ تانیں لمبی ہو گئیں اور تالیوں کی آواز ہر شے پر برسنے لگی۔ جاتے ہوئے میں نے کہا۔

”گل خان تمھاری عورت بہت نیک مزاج ہے اس کی قدر کیا کرو۔“

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا وہ صرف مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ جانے کیوں مجھے ایسی لگی جیسے کسی نے تیز دھار چھری کو اندر چھپا رکھا ہو وہ مسکراہٹ مجھے بڑی بے معنی اور منحوس معلوم ہوئی جیسے خوشی کے گھر میں اچانک کسی نے چیخ ماری ہو مجھے گھر تک جاتے ہوئے وہ مسکراہٹ یاد آتی رہی۔ اس کے

جواب کے بعد وہ بنا سلام کیے پھرا تھا اور اندر چوکھنڈی میں چلا گیا جہاں رشتے کی جوان لڑکیاں نئی بہوئیں اور ہمسایہ بستیوں کی عورتیں لہک لہک کر گیت گا رہی تھیں اور پاؤں کی جھانجھروں کی صدا شور میں سے زیادہ پر رونق معلوم دیتی تھی۔

بیساکھ آ گیا تھا گندم کے سنہری کھیت تا حد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی کسی بستی میں لوگ فصل کاٹ کر ڈھیری لگا چکے تھے۔ کہیں تیاریاں ہو رہی تھیں اور دنیا ایک خواب کی سی دنیا لگتی۔ ناقابل یقین خوبصورتی اور خوشبو سے بھری اور گرم ہوتی ہوئی مانو کسی شعلے کی لپیٹ میں آنے والی ہو۔ ہر شے پر آگ لپکتی ہوئی لگتی تھی جیسے الاؤ جلنے والا ہو سورج آسمان کے اندر سفید شعلہ تھا۔ دھوپ گرم ندی سی بہتی ہوئی نہروں میں خاک اڑتی تھی اور کوئلیں آموں کے اندر چھپی کوہو کوہو بولتی تھیں۔

مدرسے میں فصل کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں صرف ڈاک کا کام نمٹانے دن چڑھے آتا تو کھیتوں میں رنگ برنگے آنچلوں کے پھریرے اڑ رہے ہوتے۔ عورتیں ایک دوسری سے بڑھ کر ہاتھ مارنے اور لائی کے ڈھیر کو اونچا کرنے میں دھوپ کو بھول کر لگی ہوتیں۔ جوان لڑکیاں سر پر روٹیوں اور لسی کے گھڑے لیے کھیتوں کو جا رہی ہوتیں۔ میراثی گھوڑوں پر چڑھے کھیتوں کے

کنارے کنارے گھومتے اور خیرات مانگتے جوانوں کے سنولائے ہوئے چہروں پر آنے والی خوشیوں کے سائے جیسے اندھیرے کے دامن پر کرنیں کانپیں۔ کھوئی کھوئی، سنبھل کر چلتی مٹیاریں، شور مچاتے بچے اور ہوا کے ساتھ اڑتی نقاروں کی آوازیں۔

اس دن جانے میرا دل یونہی پریشان تھا۔ اس سے پہلے گل خان کی ماں نے برادری والوں کو بلوایا تھا اور خط لکھوائے تھے کہ فصل کے بعد آکر فیصلہ کریں وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھی۔

میں ڈاک کا تھیلا سائیکل کے کیریر پر رکھے ہولے ہولے پیڈل مارتا کھیتوں میں سے اپنے گاؤں جا رہا تھا اور کندن کے لیے فکر مند تھا۔ میرے جی میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ وہ پردیس سے آئی ہوئی مٹیار جیسے غیر زمین میں لگایا پودا۔ کہیں دور سے ہاتھوں کے اندھیرے سے کوئل کی کوک سنائی دی۔ بھری دوپہر میں آٹے کی چکی بھک بھک کر کے چلتی تھی اور اس کی آواز ویرانوں میں اکیلی ہونکتی تنہا روح کی پکار کی طرح میرا جی اداس کر گئی۔

ٹیلے سے مڑ کر جو اپنے راہ پر گھوما ہوں تو میں نے کندن کو دیکھا وہ ایک ہاتھ میں درانتی لیے اور دوسرے میں گندم کی مٹھ پکڑے کھڑی تھی جیسے کوئی تصویر

ہو۔ بالکل خاموش اور بے حس بے جان جیسے وہ زندہ نہ ہو صرف میرا خیال ہو۔ دوسری لڑکیاں اس سے ذرا پرے گاتی اور بولتی گندم کاٹنے میں لگی تھیں اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں۔ ان کی آوازیں درانتیوں کی کر کر کے اوپر جیسے ساز کے ساتھ گیت ہو سنائی دیتی تھیں۔ مگر وہ بھری دوپہر میں سورج کی روشنی کے نیچے اکیلی لگ رہی تھی پھر کوئل کی کو ہو کو ہو کہیں قریب سے آئی۔ کندن کا سارا جسم کان بنا ہوا تھا۔ جانے وہ اس کو ہو کو ہو کو سن رہی تھی۔ کون سے دیس کا گیت کونسا بھولا بسرا نغمہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش میں ہو۔ اندھیروں میں جھانک رہی ہو۔ اس کے چہرے پر سے سائے گزرنے لگے۔ پہلے آکر اس سے بات کرنے کو میرا جی چاہا۔ پھر میں نے مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔

فصل کٹ گیا۔ جاٹ شادیوں اور ہنگاموں کے لیے زیور، کپڑا خریدنے میں لگ گئے۔ بازاروں میں اپنے گھاگھرے گھماتی مٹیاریں پھولوں والے جوتے پہنے اور لمبی چادریں لیے عورتیں دکانوں پر بیٹھ کر ریشمی تھانوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتیں اور بھاؤ تاؤ کرتیں۔ مٹھائی خریدتیں اور اپنے جسموں، سانسوں کی خوشبو کو پیچھے چھوڑتی چلی جاتیں۔ بازار رنگ اور نور سے بھرے لگتے تھے۔ گرمی اب اپنے شباب پر تھی۔ لو چلتی تھی اور لوگ بادلوں کی راہ دیکھتے تھے۔ اڑتی خاک

سے بیزار تھے۔ سورج سوا نیزے پر کھڑا رہتا تھا۔ راتیں بستیوں میں چراغوں گیتوں اور ہنگاموں کی براتیں لے کر اترتیں۔ گلی گلی ایک میلہ سا لگتا۔

گل خان مجھے ملا تو کہنے لگا۔ ”منشی جی آپ کندن کو سمجھائیں ہم اب زبان دے چکے ہیں مگر وہ سمجھتی نہیں فساد کرتی ہے۔“

”کاہے کی زبان“ حالانکہ میں سب سمجھتا تھا مگر میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہی جس کے لیے ماں نے آپ سے خط لکھوائے تھے منشی جی۔“ پھر ذرا جھینپ کر وہی بولا۔ ”میری شادی کا قصہ۔“ میں نے کہا۔ ”کندن کے ہوتے تم ایسا کام کیوں کرتے ہو۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔ اس کی صورت ایسی ہے کہ دیکھا کرو، ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی رنگت ہے۔ تم کس لیے اس کے ہوتے دوسری لاؤ گے اس سے کیوں بیزار ہو۔“

گل خان ڈھیٹوں کی طرح ہنس کر بولا۔ ”گاہنے اور بونے کے کام میں جتنی زیادہ جانیں ہوں اچھا ہے۔“ یہ انسانی رشتوں کی منطق مجھے کبھی سمجھ نہیں آتی اور پھر ان کا الجھاؤ مجھے اور بھی گھبرا دیتا ہے۔ماں کا بیٹی سے رشتہ، باپ کا بیٹے سے، شوہر کا، بیوی کا اور پھر ان رشتوں جیسے پھیلاؤ میں دیواریں اور دشواریاں اور سمجھ نہ آنے والی گتھیاں، جھگڑے اور بیزاری اور ایسی مسکراہٹ جو ہنسی کے قریب ہونے پر بھی تیز دھار آلے کی طرح لگتی ہے۔

"منشی جی اسے کہیں فساد چھوڑ دے۔" اس نے بازار میں ایک کپڑے کی دکان پر بیٹھتے ہوئے کہامیں اسے جواب دیے بنا آگے بڑھ گیا۔

جب بھی اسکول آتے میں ان کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو کپڑے کا جھولا نہ ہوتا جانے کہاں چلی گئی تھی کندن کہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ البتہ اس کی نندیں تیز آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتی درختوں تلے گھومتی دکھائی دیتیں۔ میرا دل آنے والے غم کے بوجھ سے بیٹھتا جانے کیوں میں گل خان کی شادی کو بہت بڑا سانحہ سمجھنے لگا تھا۔ حالانکہ بہت عورتیں اس غم سے دوچار ہوتی ہیں۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ کندن یہ سب دیکھنے کے لیے نہیں بنی۔ ایک شام جب میں حکیم صاحب سے مل کر بستی سے باہر نکلاہوں کہ وہ مجھے دکھائی دی۔ فاصلہ کی وجہ سے میں دوسری عورت کو پہچان نہ سکا۔ بستی کے باہر ٹوبے کے کنارے دونوں ٹھہر گئیں۔

"میں اب بھی کہتی ہوں بی بی مت جاؤ رات ہی ہو گئی ہے اکیلی کہاں جاؤ گی گیدڑ نہ گھسیٹ لیں۔" دوسری مٹیار نے چھپے سورج کی لالی کی طرف منہ کر کے کہا۔ ٹوبے میں دونوں کا عکس تاریک پانی پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

کندن نے ہنس کر کہا۔ "میں تو رات کی ماں ہوں مجھے کوئی شے نہیں گھسیٹ سکتی۔"

بچہ سویا ہوا تھا اور اس کے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ میں سلام کر کے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اپنے راہ پر مڑ کر میں نے دیکھا تو وہ ہرنی کی طرح اکیلی اکیلی خالی کھیتوں کی منڈیروں پر سے پواروں کی بستی کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں اس کے لیے نہ سکھ تھا اور نہ محبت۔

اس شام مجھے اپنا راستہ اور دنوں سے زیادہ لمبا اور تھکا دینے والا لگا۔ میں زندگی اور دکھوں اور آنے والے غموں اور غموں کی سہار اور جانے کیا کیا سوچنے میں لگا تھا اور بہت ہولے ہولے چل رہا تھا کبھی کبھار آدمی کو زندگی پرائے بوجھ کی طرح لگتی ہے اور جی چاہتا ہے اسے اتار پھینکیں۔ چاروں طرف اندھیرا دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی چلتے ہی جانا ہوتا ہے اس اندھیرے میں چاہے کندن کہے کہ وہ رات کی ماں ہے اور چاہے میں کہوں کہ میں چل سکتا ہوں سبھی گھبرا جاتے ہیں۔ گل خان کی شادی اور رت جگے اور خاندانوں کی ناک کا سوال مجھے لگا ایک جھمیلا ہے جس میں پھنسے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آدمی چلتا ہے۔ کوئی چار دن کی بات ہے میں اسٹیشن سے ڈاک لے کر اسکول آ رہا تھا کہ میں نے گل خان کے گھر کے پاس بہت لوگوں کو اکٹھے دیکھا۔ پاس گیا ہوں تو کندن کو دیکھا

وہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ بچہ سہما ہوا سا کبھی بلک بلک کر رونے لگتا اور کبھی اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اسے چومنے لگتا۔ کندن کی آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں کی ندیاں اس کے زرد گالوں پر بہہ رہی تھیں۔
آگے بڑھنے کی بجائے میں پیچھے کھڑا رہا۔ بھلا میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟
''بیٹی گھر جاؤ یہاں راہ پر سے اٹھو۔'' بستی کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کی بانہہ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''چاچا تم لوگ مجھے کیوں پریشان کرتے ہو۔ کہیں نہ کہیں تو جاؤں گی ہی آخر۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے تم لوگ راہ پر بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے کندن کی ساس کو دیکھا کہ بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھی اور کہنے لگی۔ ''اس بستی میں اب تیرا کون یار بیٹھا ہے جس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ جا اٹھ یہاں سے کیا رونا ڈال رکھا ہے۔ ارے گل خان کیا ساری عمر تیرے پلو سے بندھا رہتا۔ اگر میں اس کی شادی کر رہی ہوں تو کون سی قیامت آ رہی ہے تو نے رو رو کر کیا نحوست پھیلا رکھی ہے ڈائن۔ کیا میکے میں تیرا کوئی نہیں جس کے پاس جائے۔''
کندن نے آنکھیں پونچھ لیں۔ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔ ''میکے والوں کو تو کچھ نہ کہہ میرا تو ایک ہی بھائی ہے اسے میری بھی زندگی لگ جائے اور جگ جگ جیے میں نے تو ان کے ساتھ تیرے بدلے بگاڑ لی ہے۔''

بچہ جانے کیوں ماں کو گلے لگا رہا تھا اس کا منہ اپنی طرف کر کے چومنے لگتا۔ اس کی گالوں اور گردن پر پیار کر رہا تھا۔ "ماں نہ لو۔ ماں بول، ماں چل۔"

میرا دل اچھل کر مانو گلے میں اٹک گیا اور ایک خیال رہ رہ کر ڈسنے لگا۔ کندن کی صورت پر ایسی بے چارگی تھی ایسی مایوسی جیسے اسے اب کوئی آس نہ رہی ہو۔ کھڑے ہوئے لوگوں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کہیں۔ سب چپ تھے گل خان کی ماں سے سبھی ڈرتے تھے۔

میرا جی چاہتا تھا اسے دلاسا دوں مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر مجھے جلدی بھی تھی اور اس لیے لوگوں کی بھیڑ میں اسے بیٹھے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ آج شام یا کل صبح اسے ملوں گا تو ضرور سمجھاؤں گا کہ کیوں مفت میں جان ہلکان کر رہی ہے۔

ڈھلے دن میں پکی سڑک کی چمک سے بچنے کے لیے منہ اور سر کو تولیے سے لپیٹے اپنی بستی کی طرف جا رہا تھا جب چیخ پکار اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں پھر دفعہ دار ننگے پاؤں تپتی ہوئی اور ندی کی طرح بہتی سڑک پر سے یوں گزرا جیسے اس نے اپنے پیچھے آفتیں دیکھ لی ہوں اور بھاگا جاتا ہو پھر دکانیں چھوڑ کر پیسوں کی پرواہ کیے بنا دکاندار مینن راں کے کھوہ کی طرف جانے لگے ہائے ہائے اور زور زور سے پکارنے کی آوازیں سن کر میں بھی سائیکل پر سے

اترا اور اسے تھامے تھامے ریت کے ٹیلوں پر سے کھوہ کی طرف جانے لگا۔
جانے کیوں میرا دل سینے میں یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے کوئی گھنٹہ ہو۔
لوگ حواس باختہ پواروں کی بستی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کچھ جوان آدھے آدھے جھکے کھوہ میں جھانک رہے تھے۔ پھر میلہ سا لگنے لگا۔ منڈیر کے ساتھ ایک بچے کا تہہ کیا ہوا جوتا اور کپڑے پڑے تھے پھر ایک عورت کا جوتا تھا جس میں اندر اس کے پاؤں کی جھانجھریں گلے کی تعویذ اور ایک انگوٹھی تھی۔
میں یہ سارا عرصہ دعا کرتا رہا میں کندن کا خیال بھی جی میں نہیں لایا تھا مگر وہ روتی ہوئی بچے کو اٹھائے ہوئے دھلی دھلی آنکھوں اور پھیکی اداس صورت کے ساتھ ہر گھڑی میرے ساتھ آن کھڑی ہوتی۔
غوطہ خوروں نے کوئی ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد دونوں ماں بیٹوں لاشیں نکالی تھیں۔ وہ اس کے سینے پر اس کے دوپٹے سے بندھا تھا۔ دونوں روتے میں تھک کر سوئے ہوئے لگتے تھے بچے کی بانہیں ماں کے لگلے میں تھیں جیسے کہہ رہا ہو "ماں نہ لو۔"

ٹیلوں پر سے پواروں کی روتی ہوئی عورتیں کندن کی سر پیٹتی ساس اور بالوں میں خاک ڈالتا گل خان یوں اترے جیسے فوج کی طرح اسے واپس لانے آئے ہوں۔

مہر خان نے کہا۔ "ہونی ہو کے رہتی ہے ماسٹر صاحب میں نے دوپہر تک اسے اپنے گھر میں بٹھائے رکھا۔ میری سوانی نے اسے سمجھایا تو کہنے لگی ماسی پواروں کی بستی کے باہر میرے لیے کیا رکھا ہے ماں اور بھائی کو میں نے ان کے بدلے ناراض کیا۔ اب کیا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں اور جاؤں بھی کیوں۔ جن راہوں پر میں نے سکھ کے سپنے دیکھے تھے آج ان راہوں سے بے آس کیوں لوٹ جاؤں پھر بچے کو پیار کرتی اور رہ رہ کر سینے سے لگاتی ہوئی کہنے لگی۔ "ہم دونوں یہاں سے لوٹ کر کہاں جائیں گے یہاں رہیں گے۔"

کھانا کھلا کر میری بہو نے کہا۔ "کندن تو اب چار گھڑی آرام کر ہمارے گھر میں تیرے گھر کی سی ٹھنڈک تو نہیں پر ذرا سو جا۔"

"کہنے لگی ذرا باہر کیکر تلے سوؤں گی یہاں گرمی ہے بچہ آرام نہیں کرے گا اور چھوٹی کھاٹ اٹھا کر کیکر تلے لیٹ گئی۔"

دفعہ دار پگلا بہکا ہوا آدمی ہے دنوں وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ کندن کا نام آتے ہی وہ ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتا اور کھڑا ہو کر چاروں طرف یوں نگاہ پھیرتا جیسے

وہ ان ریت کے پہاڑوں کو اور دور تک پھیلے کھیتوں کو ان پت جھڑ سے تقریباً
ننگے درختوں اور اس سے بھی پرے آم کے باغوں کو آخری بار دیکھ رہا ہو پھر
ہاتھ ماتھے تک لے جاتا پھر سلام کرتا اور آہ بھرتا اور سر جھکا لیتا۔
پہلے پہل تو مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر جیسے کسی کو الہام ہو۔
میں نے جانا کندن نے حسرت سے آخری گھڑی اس رستی بستی سدا سے آباد اور
بے پرواد نیا کو دیکھا ہو گا۔ ان بستیوں پر نظر کی ہو گی جن راہوں پر وہ بے خطر
آزاد پرندے کی طرح گھومی پھری اور یہی راہیں جن پر سے گزرتے وہ
اندھیرے میں اپنے کو "رات کی ماں" کہتی۔
یہ پگڈنڈیاں اور کھوہ اور ان کی نالیوں میں چمکتا ہوا پانی زندگی بخش ٹھنڈا اور میٹھا
یہ جسم کے ساتھ چھو کر اسے سکون دینے والی ہوا جب وہ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھی
ہو گی۔ تو اس نے یہ سب محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ جانا ہو گا کہ ان چیزوں
میں اس کے لیے کوئی آس نہیں رہی اس کے اپنے جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں
رہا۔ جانے وہ جوان ہوتے ہوئے بھی اتنی مایوس کیوں تھی؟
اور مجھے آم کے باغ میں بیٹھے جب خوشبو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے کبھی
کبھار ایک ہیولیٰ دکھائی دیتا ہے جو میری طرف آتا ہے اور پھر قریب آکر

ہولے ہولے شام کی سرخی شفق کے رنگ اور رات کے اندھیرے میں گھل جاتا ہے۔

طوطا کہانی

تم کہتے ہو میں وہمی ہوں مگر بھگوان کی سوگند اٹھا کر کہتا ہوں یہ سب میرا واہمہ نہ تھا۔ بہت دنوں بعد جب میں گاؤں سے لوٹا ہوں تو ایریل پر طوطے یوں لٹکے ہوئے تھے اور چیخ رہے تھے۔ جیسے کبھی میرا سواگت کرنے کے لیے پنجرے میں بند طوطے چیختے تھے۔ مگر یہ خوشی کی سیٹیاں اور چہکار نہ تھی۔ یہ صدائیں وہ نہ تھیں۔ پنجرہ خالی تھا۔ بالکل خالی۔ میں نے دونوں پٹ کھلوائے۔ وہ سب آوازیں نکالیں جو میں انھیں بلانے کے لیے نکالتا تھا۔ پر اندر لگائے ہوئے درخت کی ٹہنیاں سونی پڑی تھیں۔ اور وہ گھونسلے خالی تھے جیسے ویران شمشان ہو۔

تم اگر کہتے ہو یہ محض اتفاق تھا۔ چیزوں کی نحوست کوئی شے نہیں ہو سکتی ہے؟ کون جانتا ہے بھائی اتفاق بھی کیا شے ہے! ویسے طوطے مجھے شروع سے ہی پسند ہیں۔

تم سب کی طرح مجھے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ ہماری ایک رشتے کی دادی تھیں جنھیں ہم موسی ماں کہتے تھے۔ وہ میرے بابا کی موسی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار اپنی بستی سے نکلتیں تو ہمارے گھر کا چکر بھی کرتیں۔ ماں سے بھی بات بہت کم کرتی تھیں۔ ہولے ہولے اپنی چھوٹی سی گڑگڑی پیا کرتیں اور جانے کیا سوچتی رہتیں۔ غصہ ور بہت تھیں بچے ان سے کہانی سنانے کا کہتے تو چڑ جاتیں۔ مگر میری ان سے خوب بنتی تھی۔ آتیں تو رات ہمارے ہاں ضرور ٹکتیں۔ انھوں نے اور میں نے ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی اور شام ہوتے ہی میں موسی ماں کا بستر الگ لگوا کر تا کہ دوسروں سے دور ہو ان کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ رسوئی کے سامنے تخت پر بیٹھی اکٹھے ہوتے ناتہ داروں، میری موسیوں اور چاچیوں میں بیٹھی گزرے وقتوں اور بیتے لوگوں کے قصے سنتی۔ کبھی کبھار ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتیں۔ پھر رات ہوتی اور تارے ایک ایک کرکے آکاش کی نیلاہٹ میں کانپتے، لرزتے نکلتے چاندنی ربیل کی نرم خوشبو پر تیرتی ہوئی ٹھنڈے پر سکون اجالے کا کنڈ لگنے لگتی۔ میری بہنیں ذرا پرے اپنے بستروں پر ادھم مچاتی اور گڑیوں کی باتیں کرتیں۔ میری ماں مصروف سی شور سن کر انھیں ڈانٹتی۔ پر میں اس رات راجا بنا اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ شور اور لڑائی میں

حصہ نہ لیتا۔ مجھے صرف موسی ماں کا انتظار ہوتا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں مگر میں جاگنے کی کوشش کرتا۔ پر وہ آہی نہ چکتی۔

پھر لگتا رات بیت گئی ہے اور بہنیں پتھر کی مورتیوں کی طرح لڑھک جاتیں۔ سارے میں سناٹا ہونے لگتا۔ ماں آکر میرے برابر لیٹتی اور کہتی "ہائے رام بڑھاپا بھی کیا شے ہے۔ کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔" وہ چپ ہو کر میرے جاگنے اور سونے کا امتحان لینا چاہتی۔

"اچھا ہے تیری کمر ٹوٹ جائے۔" میں منہ دوسری طرف پھیرے پھیرے کہتا۔ میرے پپوٹوں میں مرچیں سی لگ رہی ہوتیں۔ "ارے تو جاگ رہا ہے مرلی میں نے سوچا آج کہانی سنے بنا ہی سو گیا ہے۔"

"میں نہیں سنتا تیری کہانی، وہاں بیٹھی جانے کیا گپ اڑاتی ہے۔" میں اور پرے کھسک جاتا۔

وہ کہتی۔ "تجھے آج کہانی ہی نہیں سننا ہو گی۔ اور مجھے ایک بہت بڑھیا سی کہانی یاد آئی تھی۔ آج دوپہر بیٹھی میں اس کے بھولے ہوئے حصے یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ اور تو کہتا ہے تو کہانی نہیں سنے گا۔ نہ سن بھیا اپنا کیا جاتا ہے۔"

"اچھا تو سنا۔" میں لیٹے لیٹے منہ پھیر کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔

"یہ اجلا بچھونا اور سب سے الگ کھاٹ یہ کہانی سننے کے لیے ہی تو تو نے یہاں ڈالی ہے۔ ارے کتنا کنجوس ہے تو چاہتا ہے کوئی اور کہانی سنے ہی نہیں۔"

"تو کہانی سنا اب ادھر ادھر کی باتیں نہ کر۔ وہ کب تیری پرواہ کرتی ہیں۔ دیکھ تو کس طرح مری پڑی ہیں۔" میں بہنوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔

موسی ماں کی ساری کہانیاں ایک سی ہوتی تھیں۔ شروع میں تو راجاؤں اور راجکماروں کی کوئی ایسی خواہش ہوتی جس کو پورا کرنے کے لیے انھیں بہت دکھ اٹھانے پڑتے۔ راہ بھول جاتے۔ جنگل میں گم ہو جاتے اور پھر درخت کے اوپر طوطوں کی ایک جوڑی ہوتی جو اپنی بولی میں نیچے لیٹے آدمی کی بات کرتے۔ کھوجنے والے کو جانے کیسے یہ ساری بولیاں سمجھ میں آتی تھیں اور یوں اپنی منزل کا پتہ چلتا اور اس کی پپتا ختم ہوتی۔ ان کہانیوں میں طوطے آدمیوں سے باتیں کرتے تھے ان کا ساتھ دیتے تھے اور ان کے دکھ سے دکھی ہوتے تھے۔ کہانی سنتے سنتے میں سو جاتا اور سپنے میں دیکھتا کہ طوطے تاج پہنے ایسے پروں سے سجے ہیں جن میں ہیرے جواہرات ٹکے ہیں جو چونچ کھولتے ہیں تو باقی سارے گیت بیکار کا شور لگتے تھے۔

یہ دنیا تھی جو ماں نے اور میں نے بنائی تھی۔ موسی ماں کی اور میری الگ دینا۔

وہ لوٹ جاتی تو میں یہ ساری کہانیاں جی ہی جی میں دہراتا۔ اور ہر کہانی میں دکھوں کو دور کرنے والا طوطا میں آپ ہوتا۔ باقی لوگ ہاتھ باندھے پہروں میرے سامنے کھڑے رہتے۔ میں انھیں دربار سے نکال دیتا اور کبھی کوئی بنا سلام کیے ہی نکل جاتا۔ میں کھیلتے میں، پڑھتے میں اسکول میں ہر جگہ یہ سپنے دیکھتا اور سب کچھ جاننے والا میں آپ ہوتا۔

ایک بار ماں آئی تو میں نے کہا۔

''ماں میں نے درخت پر سے طوطے اتار دیے ہیں۔ بھلا طوطے بھی آدمی کی طرح بول سکتے ہیں۔ اور راجکمار اب گم نہیں ہو گا۔'' ماں لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''بولی کیسی باتیں کرتا ہے۔ تو ان کہانیوں میں آپ سے آپ بدلی کیسے کر سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو گا بیٹے جو کام جس کے سپرد ہے ویسا ہی ہو گا۔ ایک بات بھی نہیں بدل سکتی کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ تو اور میں اسے کیسے نکال سکتے ہیں۔''

''تو میں نہیں سنتا کہانی۔''

''اچھا تو نہیں سنتا۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''کیوں نہیں سنوں گا۔ پر میں نیلے طوطے کو ساری باتیں جاننے والا نہیں رہنے دوں گا۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

ماں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگی۔ "جیسے تیرا جی چاہے۔"

اس رات ماں نے جو کہانی سنائی اس میں نہ کوئی راجہ تھا اور نہ کوئی راجکمار۔ کسی کو کسی کی کھوج نہ تھی۔ جانے یہ کہانی کون سے دیس کی تھی کہ اس میں بھوک تھی، سردی تھی اور قید تھی۔ ہر طرف اداسی اور ویرانی تھی اور یہ سارا دکھ دیکھ کر درخت پر بیٹھے طوطے بھی مر گئے۔ پھر ان کے پر ہوا کے ساتھ ادھر ادھر اڑتے پھرے۔ اور بین کرتی ہوئی آندھی انھیں اپنے ساتھ اڑا کر جانے کہاں لے گئی۔ بگولے اس ویرانے میں ہونکتے پھرے کچھ بھی باقی نہ بچا۔ مہینوں کے بعد ماں آئی تو خوش نہ تھی۔ گڑگڑی زور سے پیتی۔ وہ اپنے کودھوئیں کے بادلوں میں مانو چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ شروع سردیوں کی ایک سہانی نرم سی شام تھی۔ اور جانے کیوں اور دنوں سے زیادہ خوش اور پر رونق لگ رہی تھی۔ سورج کی لالی کے نیچے بڑھتے نیلے اندھیرے میں پرندے تیز تیز پر مارتے اڑے جاتے تھے۔ میں نے ان جھنڈوں میں کوئی طوطوں کا جھنڈ نہ دیکھا۔

رات موسی ماں کی راہ دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی۔ میری چھوٹی بہنیں مجھ سے پرے اسی طرح آپس میں جھگڑ اور کھیل رہی تھیں۔ آنکھ کھلی ہے تو ہر طرف چپ چاپ تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ مدھم سا دیا جل رہا تھا۔

"کیا آج موسی نہیں آئی؟" پھر میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ میری چھوٹی بہن کے ساتھ لیٹی تھی۔

جب میں نے جا کر اسے جھنجھوڑا ہے تو وہ جاگ رہی تھی۔ "تو میرے ساتھ کیوں نہیں سوئی تو نے مجھے کہانی کیوں نہیں سنائی۔"

وہ نہ خفا ہوئی اور نہ اٹھی کہنے لگی۔ "تجھے کہانی کیا سناؤں۔" اس کی آواز میں آنسو تھے یا شاید اس کا گلا خراب تھا۔ مجھے لگا رات لنگڑی بڑھیا کی طرح دھیرے دھیرے آگے کھسک رہی ہے۔

اس رات کے بعد سے مجھے موسی ماں نے کبھی کہانی نہیں سنائی۔ اور میں نے اپنے طور پر طوطوں کو کھوجنے اور انھیں درخت پر اسی جگہ بٹھانے کی بہت جتن کیے اور یوں مجھے ان سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو گیا۔ اور میں سپنوں میں بھی دیکھتا کہ ہرے، نیلے، پیلے طوطے ڈال ڈال پھدک رہے ہیں اور آدمیوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ خود میرے دکھ سکھ میں شریک ہیں۔

اسکول میں پڑھتے جماعت میں اگر مجھے کسی پرندے کی تصویر بنانے کے لیے کہا جاتا تو میں طوطے کی تصویر بناتا۔ بڑا ہو کر کالج میں بھی میرا یہ جنون کم نہ ہوا۔ اور بڑے بھیا کی نظر بچا کر میں نے ایک طوطا پال لیا۔ ہوسٹل میں گیا تو اسے چھپا کر ساتھ لے گیا——— پڑھنے بیٹھتا تو اسے پاس بٹھا

لیتا۔ دوست چھیڑتے مگر مجھے پرواہ نہ تھی۔ تعلیم ختم کی تو بھیانے مجھے باہر بھیج دیا۔ پر دیس میں مجھے بہت دنوں رہنا پڑا۔ گھر، بہن بھائی کوئی شے بھی اتنی شدت سے یاد نہ آئی۔ آدمی ہر ملک میں اپنے لیے جگہ بنالیتا ہے۔ اپنے آپ کو منالو تو یادیں تنگ نہیں کرتیں۔ کمی محسوس نہیں ہوتی۔ لوگوں کے چہرے اجنبی نہیں لگتے۔ سر پر جھکا آکاش اور راتوں کا رنگ ایک سا لگنے لگتا ہے۔ یوں بھی میں اداس کم ہوتا ہوں۔ کئی چیزوں کے بنا گزر کر لیتا ہوں۔ پر وہاں میرا دل ان سیٹیوں کو سننے کے لیے ترس گیا۔ مجھے کبھی ایسا سپنا بھی تو دکھائی نہ دیتا جس میں دیکھوں کہ بہار آئی ہے درخت پھلوں اور خوشبو سے بوجھل ہیں اور ڈال ڈال ہرے نیلے پیلے سفید اور گلابی طوطے پھدک رہے ہیں۔

لوٹ کر آیا ہوں توماں ایک اور بہو گھر لے آئی۔

مالتی سے پہلے پہل جھینپتا رہا۔ میں نے سوچا طوطوں سے میری محبت کو وہ جانے کیسا سمجھے اور ہو سکتا ہے اسے سرے سے پرندوں سے لگاؤ ہو ہی نہیں۔ اور میری وجہ سے انھیں برداشت کرے۔ بیاہ بھی عجیب بندھن ہے۔ محبت کی شادی میں بات دوسری ہے۔ آدمی ایک دوسرے کے متعلق پہلے سے بہت کچھ جان چکا ہوتا ہے۔ گو یہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ مگر جوڑ میں نے محسوس کیا وہ کچھ یوں تھا جیسے اندھیرے کمرے میں دھکیل دیا گیا ہوں اور ٹٹول کر چیزوں

اور جذبات احساسات اور خیالات کے ٹھکانے تلاش کرتا میں یہ کھوج جس میں دوسرے کو ٹھیس لگنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ بھگوان نے یہ بیاہ کا بندھن بھی جانے کیا سوچ کر انسانوں پر ٹھونسا تھا؟

ایک بار چھٹیوں میں ہم گاؤں گئے تو ماں نے ہمیں باغ کی طرف کھلنے والا کمرہ رہنے کو دیا جو گھر سے ذرا الگ تھا۔ ہو سکتا ہے بہو گھر میں ہر گھڑی آنے والے ناتہ داروں کی وجہ سے شرم محسوس کرے۔

ایک صبح ہم سو کر نہیں اٹھے تھے کہ چوں چوں کی آواز نے جگا دیا۔

مالتی کوند کر پلنگ سے اتری۔ ارے یہ تو چڑیا کے بچوں کی آواز ہے۔ نئی زندگی اور خوشی سے بھری چہکار سی۔ ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی تو خوشبو کی لہر گلابی سا اجالا اندر آیا۔ باغ پرندوں کے شور سے آباد تھا۔ اور ہوا نرم نرم سی جیسے پیار کا بول ہو جسم سے چھو کر اسے سکون بخش رہی تھی۔

پہلے تو یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ آواز کدھر سے آ رہی ہے۔ مالتی کمرے کے درمیان کھڑی بکھرے بالوں اور سوئی سوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ گھونسلا ایک بڑی سی تصویر کے پیچھے تھا۔ وہ میز پر کرسی رکھ کر اس پر چڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر اتنی سرخی امنڈ آئی، مانو وہ بچے اس کے اپنے

ہوں۔ چڑیا کبھی اس کے سر پر بیٹھتی، کبھی تصویر کے سرے پر دونوں بہت شور کر رہے تھے۔ تیز تیز بول رہے تھے اور ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔
میں نے کہا۔ "چلو نیچے اترو۔ ورنہ وہ تمھاری آنکھوں میں چونچیں ماریں گے۔"
کہنے لگی۔ "مجھے تو پرندوں سے بہت محبت ہے۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ گھر میں میرے کمرے میں چڑیوں کے اتنے گھونسلے تھے اور اکثر کوئی بچہ گھونسلے سے گر جاتا تو میں اس کی دیکھ بھال کرتی۔ چڑیا اور چڑا میرے ہاتھ سے دانہ لے کر کھاتے تھے۔"
میں نے کہا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمھیں پرندے اچھے لگتے ہیں۔"
کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں۔ میں سمجھتی تھی تمھیں برا لگے گا۔ ورنہ گھر میں ہم کچھ نہ کچھ ضرور رکھتے۔ تنہائی میں دل بہلا رہتا ہے۔" گاؤں سے لوٹ کر ہم نے ایک پنجرہ بنوایا۔ بہت بڑا نہیں مگر آرام دہ سا۔ جس میں چھت کے قریب میں نے کئی چھوٹے گھر بنوائے۔ گول سوراخ اندر جانے کے لیے جو آگے سے کشادہ تھے۔ پنجرے میں ان کو قفس کے احساس سے بچانے کے لیے میں نے درخت کی ایک ایسی مضبوط اور چھوٹی سی ٹہنی کٹوا کر لگوائی جس میں کئی شاخیں تھیں اور جس پر دور سے ایک چھوٹے سے درخت کا دھوکا ہوتا تھا۔ مالتی کے

چہرے پر اتنی محویت ہوتی جیسے وہ کسی محبت میں گرفتار ہو رہی ہو۔ بر آمدے میں جہاں بڑھئی کام کرتا تھا وہ گھڑی گھڑی پھیرے کرتی۔

جس دن میں کئی جوڑے رنگین طوطے لایا ہوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔ ”مجھے سدا سے یہ رنگین طوطے پسند ہیں۔ اس سے گھر میں کتنی رونق ہو جائے گا۔ یہ سارا پنجرہ تو ان کو کم پڑ جائے گا۔ جب بچے دیں گے تو ہم ان کے لیے ایک اور گھر بنوائیں گے۔“ ہم اکٹھے ہوتے تو اکثر ان کی باتیں کرتے۔ میں آتا تو سب سے پہلے پوچھتا۔ ”کیوں مالتی بچوں کا کیا حال ہے۔“ ہنس کر کہتی۔ ”تمھاری باٹ دیکھ رہے ہیں۔“

ہمیں دیکھ کر وہ بہت شور کرتے ان ڈالیوں پر الٹے ہو کر لٹکتے پھدکتے اور اتنا مانو خوشی منا رہے ہوں۔

ہولے ہولے گرمی بڑھنے لگی۔ بیسا کھ بیت چلا تھا اور زمین الاؤ کی طرح لگنے لگی تھی جس کے شعلے بلند ہوا ہی چاہتے ہوں ہوا سلگتی ہوئی لگتی جیسے نرک کے دوار کھل گئے ہوں۔ لو چلتی تھی اور دوپہریں سنسان ہونے لگتی تھیں۔ لمبی اور ختم نہ ہونے والی۔ مالتی نے کہا۔ ”اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو کمرے میں پنجرہ رکھوا لیں۔ بولتے نہیں۔ پر محسوس تو کرتے ہیں۔ اور اب کے گرمی نہیں قیامت ہے۔ شام ڈھلے تک لو چلتی ہے۔“

کمرے میں آ کر وہ اندھیرے میں گھبراتے اور جب تک ہم سے کوئی پاس نہ جاتا تو بولتے رہتے۔ ایک گھڑی آرام نہ کرنے دیتے انھیں سمجھ تو نہیں تھی۔ انھیں ڈانٹا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں من ہی من میں سوچتا۔ وہ آدمی کی بات سمجھنے کی بات اور راہ بتانے والے طوطے جانے کہاں گئے۔ موسی نے کہانیاں کیسی گھڑلی تھیں۔ پر کوئی تھا جو کہتا تھا یہ سب جھوٹ نہیں ہے۔

ماں نے مالتی کو بلوایا تھا۔ میں اسے گاؤں پہنچانے گیا ہوں تو گرمی سے زمین اور آسمان یوں تپ رہے تھے۔ مانو ہر شے کو آگ دکھا دی گئی ہے۔ نالے سوکھ گئے تھے۔ تالاب خالی تھے۔ ان کی تہہ میں کیچڑ تھا۔ درخت ننگے تھے اور دنیا اتنی بے رونق ہو گئی تھی۔

مجھے کچھ دن لگ گئے۔ لوٹ کر آیا ہوں تو ان میں سے کئی گردنیں ڈھیلی اور آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر پھدکے تو سہی مگر مالتی کو ڈھونڈتے رہے۔ وہ ان کے لیے ماں کے سماں تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ تنہائی میں جی بہل جاتا تھا۔ کام سے آ کر میں ان کا دانہ اپنے سامنے ڈلواتا اور پانی بدلواتا۔ پنجرہ صاف کرواتا انھیں باہر نکلواتا۔ وہ ڈالیوں پر اترتے ہولے ہولے پر پھڑپھڑاتے اور کبھی کبھار کوئی اترتا ہوا آزاد طوطا پنجرے کی جالی کے ساتھ

لٹک جاتا۔ اور پھر گھر گھر چہکار اور شور سے بھر جاتا۔ میں سیر سے آتا تو وہ شکایت کرنے کے انداز میں بولتے۔

ماں کے خط پر خط چلے آتے تھے۔ چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ میں جانا بھی چاہتا تھا۔ مگر یہ قفس زنجیر بن گیا تھا۔ پھر مالتی نے لکھا۔ ”میرا جی اچھا نہیں ہے۔ اگر آؤ تو دیکھو کہ سوکھے درخت بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ آسمان کا رنگ زرد ہے۔ ساری دنیا بارش کے لیے پریشان ہے اور پرارتھنا کر رہی ہے۔ بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں اور میں بھی اس پریشان دنیا میں ہوں۔“

میں نے ایک ایک کو نکال کر ہاتھ میں لے کر پیار کیا نوکروں کو تاکید کی ان کا خیال رکھیں۔ پر وہ سب یوں چیخ رہے تھے۔ مانو آخری بار مجھ سے جدا ہو رہے ہوں۔ میرا جی سہم گیا۔ پر ان کا رونا۔

تم پوچھو میں انھیں ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ تمھیں پتہ نہیں میری ماں پوجا پاٹ میں لگی رہنے والی، شگن لینے والی اور نحوستوں میں یقین رکھنے والی عورت تھی۔ وہ روز تلسی کو پانی دیتی۔ چیونٹیوں کے لیے جگہ جگہ دانہ ڈالتی پھرتی۔ چڑیوں کوؤں کی روٹی کا خیال رکھتی۔ مگر طوطے کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ کہتی تھی یہ بڑا منحوس پرندہ ہے۔ بہت بے وفا ہے۔ ایک بار اڑ جائے تو

پلٹ کر نہیں آتا۔ جس گھر میں ہو وہاں ہارتی دیوی قدم نہیں دھرتی۔ شاستروں میں یہ لکھا ہے، وہ لکھا ہے اور ایسی ہی کئی دلیلیں۔

گیا ہوں تو مالتی پوچھنے لگی۔ "ان کی دیکھ بھال کس کے ذمے لگا آئے ہو۔" فکر مند سی ہو کر کہنے لگی۔ "اتنی لمبی چھٹیاں ہیں اور نوکر لوگوں کا کیا ہے لاکھ تاکیدیں کرو پر کریں گے اپنی من مانی ہی۔ کبھی بھوکا رکھیں گے اور کبھی پانی نہیں دیں گے۔ جانے ان کا کیا حال ہو گرمی کس قدر ہے۔"

اس رات ساون کی پہلی بارش ہوئی۔ گھٹائیں جھوم کر آئیں۔ ہر شے پر جوبن چھا گیا۔ دنیا نہائی دھوئی اپنے نئے سنگار اور نئے روپ سے کنچنی کی طرح سنور گئی۔ باغ میں ہر طرف بھنبھڑیوں کا شور تھا اور آموں کی مہک کوئل کی کوک میں ملی سپنے لا رہی تھی۔ سیاہ بھونرے ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے اڑتے تھے اور پرانی یادیں امنڈی پڑتی تھیں۔

ماں نے کہا۔ "مرلی اب تو گرمی بھی کم ہو گئی ہے۔ اپنی موسی ماں سے تو مل آ کئی بار پوچھ چکی ہیں تجھے۔"

جس دن میں نے جانے کا ارادہ کیا۔ ماں کہنے لگی۔ "دو گھڑی دن رہے سے آ جانا۔ مجھے آج مندر میں دیوی پوجا کے لیے جانا ہے اور چومکھیا جلاؤں گی۔ تیرا جانا بہت ضروری ہے۔ پنڈت جی نے کہا ہے، شبھ مہورت ہے۔"

میں نے چوکھٹ سے باہر قدم دھرتے ہوئے کہا۔ ”سب مہور تیں شبھ ہیں۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”ارے لوٹ آئیو تو یہ مت سوچ کہ پڑھ لکھ کر سمندر پار ہو آیا ہے۔ تو اب دھرم کرم سے باہر ہے۔“ میں نے ہاتھ ہلا کر ہاں کہہ دیا۔

موسی ماں بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں پر پپوٹے اور بھی ڈھلک آئے تھے اور سفید بھنویں جھکی ہوئی تھیں۔ ان سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا تھا۔ حویلی کے کمرے میں وہ تنہا لیٹی تھی اور ہر طرف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ بچھونے میں سے بو آ رہی تھی۔ ہوا کے زور سے کواڑ دھڑ دھڑ بولتے تھے۔ جیسے اس سناٹے کو توڑ رہے ہوں۔

کہنے لگیں۔ ”ارے تو مرلی آیا ہے ادھر آ میرا ہاتھ اپنے سر پر دھر لے بیٹا۔ میں تو اب ہلنے لائق بھی نہیں رہی۔ پوتے پوتیاں سب اپنے گھروں کو چلے گئے ایک نوکر ہے جو جی میں آئے تو پانی پلا دیتا ہے اور جی میں آئے تو کھلا دیتا ہے۔ پڑوس کی ایک عورت کبھی کبھار آ کر نہلا دیتی ہے۔ بھگوان جانتا ہے۔ اکیلے میں آدمی جینا نہیں چاہتا پر موت بھی تو نہیں آتی کہ سہارا دے۔“

میرا جی انھیں دیکھ کر بہت اداس ہو گیا۔ آدمی کی بھرپور جینے کے بعد یہ وشا ہوتی ہے۔ وہی موسی ماں جو کبھی کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھیں ایک ایک کو دیکھنے کے لیے ترستی تھیں۔

میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ ”ماں میں نے ایک پنجرہ بنوایا ہے۔ اس میں طوطوں کے کئی جوڑے ہیں۔“ مگر وہ اس رات کی طرح چپ ہی رہی جب میں نے اسے کہا تھا کہ نیلا طوطا ہی سب کچھ جاننے والا کیوں ہو۔

میں نے کہا۔ ”ماں چپ کیوں ہو گئی ہو۔“

کہنے لگی۔ ”کچھ نہیں یونہی۔“

میں نے کہا۔ ”تم بھی یہی کہو گی کہ طوطے گھر میں رکھنا منحوس ہے۔“

”نہیں، میں یہ نہیں کہتی بیٹے پر سوچتی ہوں۔ تو بھی میری طرح سپنوں کے پیچھے دیوانہ ہے۔ بیٹے بھلا سپنے بھی کبھی سچے ہوتے ہیں۔ کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ طوطے تو میرا سپنا تھے۔ وہ کہانیاں تو میں آپ بنتی تھی اور تو کیوں اس پرچھائیں کے پیچھے لگ گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پر وہ تو نہ سپنا ہیں اور نہ پرچھائیں رنگین طوطے ہیں —— “

”ارے مرلی سپنے کی کوئی ایک صورت ہے؟“

اس رات میں موسی ماں کے سو جانے کے بعد دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا سپنوں کے پیچھے بھاگنا دیوانگی ہے؟ بھادوں آ گیا وقت کیسے بیت رہا تھا؟ پرندوں کے رنگوں میں چمک گہری اور جاذب نظر ہو گئی۔ کوؤں اور کاونیوں نے سردی کی تیاری کے لیے تنکے چنے اور نئے آشیانے بنائے۔ باغ اتنی مختلف آوازوں سے بھرا رہتا۔ جب بادل جھک آتے تو کوئل کوہو کوہو بولتی اور بارش سے دھندلکا ہونے لگتا۔ پانی پر بلبلوں کی کشتیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتیں۔ ہر طرف ہریالی خوشی اور زندگی تھی۔ مالتی اور میں برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تماشا دیکھتے رہتے۔ مگر ماں اسے باہر نہ بیٹھنے دیتی۔ بجلی کی چمک سے اسے بچاتی اور ہر مہینے کسی نہ کسی پوجا پاٹ میں لگی رہتی۔

لوٹ کر آیا ہوں تو اداسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ دیکھ کر دھچکا سا لگا کہ باوجود تاکید کے انھوں نے پرندوں کا خیال اس قدر نہیں رکھا تھا جتنا میں چاہتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی چپ بیٹھے رہے۔ جیسے پہچان نہ رہے ہوں اور اگر پہچان بھی گئے ہوں تو خفا ہوں۔ کئی طوطے کم تھے۔ میں نے ہر کسی سے پوچھا۔ بک بک جھک جھک کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ جب میں نے

مالتی کو لکھا۔ ''تمھارے بچوں کی آبادی شاید بڑھنے والی ہے۔ طوطیاں گھروں میں گھسی رہتی ہیں۔''

کاتک میں جانے کیا ہوا۔ روز صبح جب میں اٹھتا تو ایک نہ ایک طوطا مرا ہوا ملتا۔ میں نے پرندوں کے معالجوں سے مشورہ کیا۔ انھیں دوا کھلائی۔ مگر رات کالی ماتا بن کر آتی ۔ میرے ان جانے ان دیکھے موت اس گھر کے برآمدوں اور کمروں میں چکر لگا رہی تھی۔

مالتی کو میں نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں بہت بے تابی سے اس بچے ہوئے جوڑے کو دیکھتا۔ وہ دونوں سر جوڑے گردن پر گردن رکھے آنکھیں بند کیے سارا دن خاموش بیٹھے رہتے۔ میں انھیں متوجہ کرنے کے لیے سیٹیاں بجاتا، آوازیں نکالتا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے سے لگے بیٹھے رہتے جیسے آنے والے خطرے کے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ اس ہنستے بستے زندگی سے پر گھر کی ویرانی دیکھ کر مجھے طرح طرح کے خیال آتے۔ چار دن کی چھٹی لے کر مالتی کو دیکھنے گیا ہوں تو کہنے لگی۔ ''تم نے خط میں کبھی ذکر تک نہ کیا اور میں روز بے چینی سے ان کی خبر سننے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔'' میں نے جواب نہیں دیا۔ اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ اس کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈی تھی جو نور لگتی تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور اندر کسی جوت

سے جگ مگ کرتی لگتی تھیں۔ جسم بھرا بھرا جیسے دھرتی پر نئی بہار آئی ہو۔ اس کی نگاہوں کے احاطے میں ہر شے اس کی خوشی سے مانو دمکنے لگتی ہو۔ میں نے اسے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔

کہنے لگی۔ ''چپ کیوں ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔''

میں نے کہا۔ ''انھوں نے انڈے دیے ہیں۔''

مالتی خوش ہو کر بولی۔ ''ہمار گھر اب زندگی اور خوشی سے بھر جائے گا۔ میں آؤں گی تو ذرا سی فرصت بھی نہیں ہوا کرے گی۔''

میرے دل کو کوئی مسلنے لگا۔ وہ لوٹ کر جائے گی تو کتنی اداس ہو گی۔

اب خاصی سردی پڑنے لگی تھی اور طوطی نے سچ مچ انڈے دیے تھے۔ جس دن مجھے نوکر نے بتایا کہ اس نے انڈے دیکھے ہیں۔ میں ننگے پاؤں بھاگتا ہوا پنجرے کی طرف گیا۔ سردی کی شدت سے بچانے کے لیے میں نے پنجرے کو کمرے کے ساتھ برآمدے میں ذرا اندر رکھوا دیا۔ دن کا زیادہ حصہ مادہ اندر رہتی اور نر اس کی حفاظت کرتا۔ اکیلا ہی کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آ کر خاموش بیٹھا رہتا۔ جیسے منتظر ہو مادہ باہر آتی تو اس کے چہرے پر طمانیت ہوتی۔ مالتی نے لکھا۔ ''میں پوچھتی ہوں اور تم لکھتے نہیں ہو۔ کیا رونق بڑھ گئی ہے۔

طوطیاں اب تو بچوں میں مگن ہوں گی۔ مجھے لکھو اس کے بچے کیسے ہیں؟ کیا ان کی چونچیں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی چڑیا کے بچوں کی؟"

ایک مہینہ انتظار میں بیت گیا۔ اس بار میں دو بار گاؤں گیا۔

مالتی نے پوچھا۔ "بچے نہیں نکلے ابھی۔" اس کی آواز فکر مند سی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے دو تین ماہ لگیں۔ پرندوں کی اپنی اپنی عادتیں ہیں۔"

مگر مجھے لگا میرے اس جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔

جانے کیوں میرا دل بھی پریشان رہنے لگا۔

انڈوں سے بچے کسی طرح نکل ہی نہیں پاتے تھے۔ دونوں سر جوڑے بیٹھے رہتے۔ جیسے نراش ہوں۔ ایک ہی جگہ ٹکے رہتے۔ اڑ کر ادھر ادھر بھی نہ ہلتے۔ مادہ بہت کم اندر جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔

سردیوں کی شامیں بڑی اداس تھیں۔ کلب سے آ کر بھی وقت کاٹے نہ کٹتا۔ میں آتشدان میں آگ جلواتا اور کندھوں پر ہلکی سی چادر ڈال کر کمرے میں ہی ٹہلتا رہتا۔ مجھے گاؤں سے روز کسی خبر کا انتظار رہتا۔ کوئی شے میرے اندر تھی جو رہ رہ کر بے چین ہوتی تھی۔ میرا جی کہیں نہ لگتا۔ کبھی سوچتا گاؤں چلا

جاؤں۔ پھر کہتا۔ ”ماں کیا سوچے گی۔ اسے ہم پر وشواش نہیں ہے۔ کیا پڑھ لکھ کر بے شرم ہو گیا ہے۔“

جس دن نائی آ کر چپ چاپ باہر بیٹھ گیا تو مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے کہا۔

”بہو کا جی اچھا نہیں ماں نے بلوایا ہے۔“ اس کا چہرہ ستا ہوا اور اداس تھا۔ وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر رہا تھا۔

بین کرنے والی عورتیں باہر آنگن میں زمین پر بیٹھتی تھیں اور سارا گاؤں گھر جمع تھا۔

موسی ماں میں رونے کی ہمت نہ تھی۔ لیٹی خالی سسکیاں لیتی تھیں۔ مجھے بلا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی۔

”مرلی دھر بیٹے یہ موہ کا سپنا ہے یہ بیٹے بیٹیاں یہ سنسار یہ سب کچھ سپنا ہی تو ہے۔ کبھی سپنا سچا ہو گیا اور کبھی جھوٹا۔ تو نراش نہ ہونا بیٹا۔ بہو کو حوصلہ دے رو رو کر پاگل ہوئی جاتی ہے۔“

مالتی کی آنکھیں خالی خالی تھیں اور چہرہ زرد تھا۔ مجھے دیکھا تو دیکھتی رہی جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور مجھے بھی لگا اس کا اور میرا ناتہ ہو ہی نہ جانے وہ کیوں

اتنی اداس ہے اور میں کیوں اداس ہوں۔ یہ سپنا ہی تو تھا۔ کوئی میرے جی میں ہولے ہولے کہتا رہا۔

گاؤں سے لوٹتے ہی مجھے سردی لگ گئی۔ دنوں اکیلا بخار میں پھنکتا رہا۔ دماغ میں تصویریں سی گھومتیں، ویران گھروں اور اداس بستیوں کی، ماں مالتی کو پہنچانے آئی تو کہنے لگی۔ ”وہ برآمدے میں پنجرہ رکھا ہے۔ اس میں کیا تھا؟“ میں اور مالتی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ماں دوسرے کمرے میں گئی تو مالتی کہنے لگی۔ ”تم نے طوطے دان کر دیے تھے کیا؟“

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔

چلنے کے قابل ہوا ہوں تو میں نے پنجرہ اٹھوا کر اپنے پاس رکھا۔ چیونٹیوں کی لمبی قطار ان خالی گھروں میں گھومتی پھر رہی تھی جیسے لٹیروں کا گروہ ہو۔ چھت تڑوا کر میں نے دیکھا تو انڈے اسی طرح پڑے تھے اور ان دونوں کے ڈھانچے جو اب صرف پر رہ گئے تھے ان کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ مالتی نے میری طرف دیکھا۔ پر ہم دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ میں کس سے پوچھوں کہ انھوں اپنے پر انڈوں پر کیوں پھیلائے تھے۔ اور کیا یہ ماں کا وہم تھا کہ طوطے بے وفا اور منحوس ہوتے ہیں۔ ایک بار اڑ جائیں تو لوٹ کر نہیں آتے۔

بجھے دیے

میں گھڑی گھڑی اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا دو سال کے بعد میں اب اس سے روٹی کھا سکوں گا۔ دو سال کے مہینے دو سال کی گھڑیاں، دو سال کے پل یوں ہولے ہولے میرے سامنے سے کھسک رہے تھے جیسے برسات کے بادل جو چھا جائیں تو لگتا ہے کہ اب آکاش کبھی نہیں دکھے گا اور گہرا اندھیرا ہو گا اور بڑھے گا۔ ارد گرد کی ہر شے ہماری نظروں سے چھپ جائے گی۔

ہری سنگھ چاچا نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی اور میں جو اپنے خیالوں میں ڈوبا الگوں کی طرف جانے والے اکھڑے بکھڑے راہ سے اس کے پیچھے آ رہا تھا ، گرتے گرتے بچا، میرا بازو پکڑ کر اس نے زور سے ہلایا اور کہنے لگا۔

"یہ سپنے دیکھنے کی عادت عورتوں کو ملی ہے۔ مرد کام کرتا ہے چوٹ کھانا جانتا ہے اور چوٹ مارنا۔ چیت سنگھ کو گرا کر تم ایسے کیوں ہو گئے ہو۔ کیوں یار بس

یہی بل تھا۔ اگر اتنا چھوٹا دل ہوتا ہے تو عورتوں کے کپڑے پہن کر گھر بیٹھا کرو۔ میلوں ٹھیلوں میں آنے اور یاروں سے بیر کمانے کی کیا ضرورت ہے؟"
میں نے بے بس ہو کر کہا۔ "چاچا تم جانتے ہو میں نے اس سے بیر نہیں کمایا تھا۔"
ہری سنگھ نے میرا بازو چھوڑ دیا اور کہنے لگا۔ "بیر کی ماں بہن کی ایسی تیسی۔" گھوڑی بے چین ہو کر ذرا سی گھومی اور تیز چلنے لگی۔ "کیا تم سوچتے ہو کہ دوستوں یاروں کے ساتھ بیر کمانا بری بات ہے۔ بات کے لیے جان دے دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ پر تمھاری اداسی کی ایسی تیسی تم اداس کیوں ہو۔ تم سپنے کیوں دیکھنے لگتے ہو۔ مرد تو اپنے بیری کو جان سے ختم کر کے خوش ہوتا ہے اور تمھاری شکل ایسی ہے جیسے جوتے کھا کر آئے ہو۔ میں کہتا ہوں تم اپنی پگڑی کو ہوا میں اچھالو، زور زور سے گاؤ۔ ناچو، اوئے میں پوچھتا ہوں کیا چیت سنگھ کوئی جگ سے نرالا ہے، بھتیجے یہ ہوتا ہی آیا ہے۔ ہماری طرف دیکھو ہم نے زندگی میں کیا کچھ نہیں کیا پر کبھی نہیں پچھتائے۔"
میں نے پھر اپنی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "چاچا چیت سنگھ سالا تو یونہی مجھ سے جھگڑ پڑا تو جانتا ہے اس کا میرا کتنا جوڑ تھا۔ تو، تو خود ہمیں دیوں کی جوڑی کہا کرتا تھا۔"

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' ہری سنگھ نے پھر زور سے چھڑی گھما کر گھوڑی کو مارتے ہوئے کہا۔ ''میں کب کہتا ہوں تو اور چیت سنگھ دیوں کی جوڑی نہیں تھے۔ پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی موت تیرے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اور بھلا تقدیر اگر اتنی زورآور نہ ہوتی تو تیری اور اس کی لڑائی ہی کیوں ہوتی۔ تو یہ قسم کیوں اٹھاتا کہ جب تک اسے مار نہ لے گا سیدھے ہاتھ سے کھانا نہیں کھائے گا۔''

چاچے نے مڑ کی میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بتا تقدیر کے سامنے کس کا زور چلا ہے۔ بھاوؤ تقدیر کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا جو ''ہونی'' ہے اس کو کون رجھا سکتا ہے۔ دریا کے کنارے بیٹھی دونوں ڈھیریوں میں سے تاگے نکال کر ہٹتی اور پانی میں پھینکتی جاتی ہے۔ ہونی دیوی کے سامنے کس کی پیش گئی ہے۔ مرد کو تو ہونی کے لکھے کو کرنے کے بعد سپنا دیکھنا اور اداس ہونا اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے پھر کہا۔ ''میں اداس کب ہوں چاچا۔ سوچ رہا ہوں چیت سنگھ اگر مجھے خواہ مخواہ غصہ نہ دلاتا۔ میں اور وہ لڑ نہ پڑتے تو آج میں ان اکھڑے بکھڑے راہوں سے پولیس کے ڈر کے مارے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ مجھے معلوم ہے ہو گا تو

وہی نہ پھر کہیں آ کر مجھے پکڑ لے جائے گی۔ مقدمہ چلے گا۔ سال دو سال چار سال ہم کچہریوں کے چکر کاٹیں گے۔ سختیاں سہنی ہوں گی۔"

ہری سنگھ نے اپنی گھوڑی میرے برابر روک کر کہا۔ "سختیوں کے باوجود کوئی شے ہے جسے انسان جیت کہتا ہے اور جو اس کی آنکھوں میں نشہ اور دل میں غرور بن کر سدا رہتی ہے اور جس کی سمجھ تم لوگوں کو نہیں ہے۔ چلو گھوڑی بڑھاؤ اور تیز چلو۔"

میں اور ہری سنگھ چاچا دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

شام کے نیلے دھندلکے میں ڈوبتی ہوئی آوازیں ہمارے گرد سونے لگی تھیں۔ گھوڑیوں کے ٹاپوں کی آواز گونج بن کر پھیل رہی تھی۔ اور ٹڈوں کی چر چر میرے جی کی اداسی کی طرح ہر شے کو چھو کر پلٹ رہی تھی۔ کھڑی فصلوں میں سے گزرتے اور چاند کی بکھری کرنوں کی طرح کھیتوں میں گم ہوتی پگڈنڈیوں کو ڈھونڈھتے ہم نامعلوم راہ پر آگے ہی آگے جا رہے تھے۔ جب بالیں گھوڑیوں کے جسموں سے چھوتیں تو وہ کانپ کر آگے بڑھ جاتیں اور سر سر کر کے بہتی ہوئی اپنی جگہ انھیں پھر لوٹا دیتی۔ ہم کھیتوں میں ڈوبی گھوڑیوں پر بیٹھے ہوئے دور دور تک پھیلی اور آکاش کو چھو کر آتی خاموشی میں دنیا کے آخری انسان لگ رہے تھے۔ چپ چاپ کسی منزل کے بنا چلتے ہوئے۔

ہری سنگھ چاچا پتہ نہیں مجھے کہاں لیے جاتا تھا۔ وہ بات بہت کم کرتا تھا اور کم بولنے والے سے لوگ یونہی دبنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی چپ سے آج نہ جانے کیوں میرا جی گھبرا رہا تھا۔ شام کا اکیلا تارا ایک انگارے کی طرح ہمارے سروں سے دور آم کے درختوں کے اوپر چمک رہا تھا اور کوئل کہیں کو ہو کو ہو بولتی میرے جی کو دھچکے دے رہی تھی۔ پتہ نہیں ان راہوں سے لوٹنا کب نصیب ہو۔ کبھی کبھار آدمی کے پیچھے اس کے قدموں کو ہونی مٹا دیتی ہے۔ پھر وہ ان راہوں سے کبھی پلٹ نہیں سکتا۔ مجھے چیت سنگھ یاد آرہا تھا۔ میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنے سالوں اس کے لیے میں نے جو نفرت اپنے جی میں محسوس کی ہے وہ کہاں تھی؟ کیا چیت سنگھ کے اور میرے درمیان وہ بیر نہیں تھا جو دشمن کی موت کے بعد جی کو ٹھنڈک دیتا ہے اور جیت کی خوشی اپنی پگڑی اچھال کر خون بھرے ہاتھوں کو سر سے اوپر نچا کر ماہیا گا سکتا ہے؟ کیا میں عورتوں کی طرح سپنے دیکھ رہا تھا؟ میں گھبرا کیوں رہا تھا؟

ہری سنگھ نے کھلے میدان میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”سال چھ مہینے بیکانیر میں رہو گے تو لوگ چیت سنگھ کی موت کو بھول جائیں گے وقت وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے۔ پھر تم پلٹ سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”وقت وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے چاچا پر بیر کو نہیں۔“

ہری سنگھ نے پھر ہولے سے کہا۔ ”تم شاید ٹھیک کہتے ہو بیر کو بھلا کر ہم لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ قول کی طرح بیر کا پالن کرنا بھی ہمارے خون میں ہے۔ پر چھ مہینے سال میں گاؤں کی ٹولیاں اور جوش سے بھرے برادری کے جوان جو اب تیرے خون کے پیاسے ہیں امن سے اپنے کاموں میں لگ کر دشمنی کو پرانا سمجھ لیں گے۔ پھر غصہ بھی کم ہو جائے گا۔ تب تم آجانا۔“

چاند نکل آیا تھا اور رات کی میٹھی ہوا شام کی نیلی دھول کو کب کی بٹھا چکی تھی اور پانی سے بھری ٹھنڈک جسم کے ساتھ چھو جاتی تو سردی کی چادر سی بالنوں میں جھول اٹھتی۔ دل کو آپ سے آپ ایک تسلی ہونے لگی۔ دور کے گاؤں کی روشنیاں چاند کی روشنی میں پھیکی اور بجھی بجھی لگ رہی تھیں۔ آبادی کے قریب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی تھی۔ حویلیوں میں ٹمٹماتے دیے آکاش پر دور دور چمکتے تاروں کی طرح لگ رہے تھے۔ نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے اور ہولے ہولے ڈولتے ہوئے جیسے پانی پر ناؤ ہچکولے سے کھانے لگے۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ ”اگر ہم ساری رات یونہی چلتے رہے تو دو دن میں بھی بیکانیر نہیں پہنچ سکیں گے۔ بھاؤ گھوڑی کو ذرا تیز بھگاؤ۔ اب تو راہ بھی سیدھا ہو گیا ہے۔“

مگر پتہ نہیں کیوں مجھ میں تھوڑی سی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔ میلے کے آخری دن اکھڑتی رونق میں ہم نے سارادن مل کر شراب پی تھی اور ہاٹ ہاٹ پھر کر میلے میں گھومتی سوانیوں کو جی بھر کر تاکا تھا اور نئے سنے ہوئے رسیلے گیتوں کو بار بار گایا تھا۔ بھنگڑا ڈالتے ڈالتے تھک گئے تھے۔

چیت سنگھ میری ماسی کا پوت اور گاؤں کا سب سے سجیلا جوان تھا۔ وہ میرے ساتھ اکھاڑے میں نہیں اترنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے یاروں کی ٹولی نے اسے بھی آگے کر دیا تھا۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے لائے تھے۔ سارے گاؤں کو پتہ تھا کہ دو سال پہلے اسی میلے کے دن اس کی اور میری لڑائی ہو گئی تھی۔ میری ٹولی والوں نے اسے للکارا تھا۔ شراب کے نشے نے ہمیں دگنا بہادر اور نڈر کر دیا تھا اور پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ اصل میں اسے جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ جس دن سے میں نے قسم اٹھائی تھی اور اپنے سیدھے ہاتھ سے روٹی کھانی چھوڑی تھی۔ میرا دل کبھی کبھی اداس ہو جاتا۔ مجھے اپنے کیے پر افسوس ہوتا تھا۔ چیت سنگھ کی اور میری یاری بہت پرانی تھی۔ وہ اور میں چھٹ پنے سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عورت کے لیے لڑنا کتنی بیکار سی بات ہے اور پھر بھی اس کا اور میرا جھگڑا ایک عورت کے لیے ہوا تھا۔

بھلا سکھو اچھی تھی یا بری تھی تو اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ۔ سکھو گاؤں کی کھاری اور بڑی طرحدار مٹیار تھی۔ اس کی صورت پر کبھی چاند نہیں چمکا۔ تہبند کو ڈھنگ سے باندھ کر پھنسی پھنسی کرتی پہن لیتی تو اس کے جسم میں سے آگ نکلنے لگتی۔ چیت سنگھ اور میں دونوں بہت دنوں اس کی آنکھ سے بچ کر رہے۔ پھر اس کی نظر چیت سنگھ کو کھا گئی۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھو کے لیے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ "پر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔" میرے جی میں گرہ پڑ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ جوانوں کی دو ٹولیاں بن گئی ہیں۔ گاؤں بٹ گیا۔ میری ماں اور چیت سنگھ کی ماں بہت فکر مند رہنے لگیں۔ پہلے کھیتوں میں جاتے ہوئے وہ میرے گھر میں آتا۔ مجھے آواز دے کر ساتھ لے جاتا۔ گاؤں کی مٹیاریں دروازوں کی درزوں سے ہمیں جھانکتیں۔ بہوئیں گھونگھٹ کی اوٹ سے ہمیں دیکھتیں۔ پر ہماری یاری کو دنیا کی نظر لگ گئی۔

جب چیت سنگھ کو پچھاڑ کر میں نے اپنی چھری اس کے پیٹ میں اتاری ہے تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہری سنگھ نے میری بانہہ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ اور شور کرتے اور گالیاں بکتے لوگوں کی بھیڑ میں سے نکال کر وہ مجھے میلے سے باہر لے

گیا۔ دونوں گھوڑیاں سر سے رائیاں کی پچھلی طرف سے ہو کر الجھے راہوں سے ہوتی بیکانیر کو جا رہی تھیں۔

چاند اونچا ہوتا جاتا تھا اور کبھی کبھی کوئی اکیلی گونج زور سے چیخ اٹھتی۔ ماہیا گانے اور ڈھولک کے ساتھ اوپر اٹھتے گیتوں کی آواز ادھر ادھر سے آ کر ہمارا راستہ کاٹتی گزر جاتی۔ پھر کوئل بولنے لگتی اور اس کی کو ہو کو ہو ہچکیوں کی طرح میرے دل کے اندر ڈوب جاتی۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ مجھے چیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔

ہری سنگھ چاچا کی گھوڑی راہ میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی اور دن ہوتا تو وہ راہ کی ماں بہن کو گالیاں دیتا مگر آج رات جب میں اور وہ بیکانیر جا رہے تھے۔ اس کو گالی یاد نہ تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ مجھے گھر یاد آ رہا تھا۔ آنگن میں سے پلٹ پلٹ کر جاتی اور پھر لوٹ کر آتی اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ گلی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتی۔ جیتو اور اسے بلاتی ہوئی دادی اور اس کا سفید بالوں سے بھرا سر یاد آ رہا تھا۔ سنتو جو کہ کوٹھڑی میں باہر کی ہر آہٹ پر کان لگائے بچوں کو سلا رہی ہو گی۔ اور منی پر ہاتھ دھرے دھرے کانپ کانپ کر سوچ رہی گی۔ ”میلے سے پلٹنے والے پتہ نہیں کب گھر پہنچیں گے۔ اسے کیا پتہ اب میں کب گھر آؤں گا۔“

مجھے ماں اور جیتو، دادی اور سنتو سب پر رحم آرہا تھا۔ پتہ نہیں ان کا کیا حال ہو گا۔ ریتے والا اور کائیاں کے درمیان بہنے والی نہر کے پاس پہنچ کر میں نے کہا۔

"چاچا کیوں نہ ہم پلٹ جائیں اور آدمیوں کی طرح کیے ہوئے کام کا نتیجہ بھگتیں؟"

ہری سنگھ نے زور سے میرا بازو پکڑا اور میرا کندھا ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ "تم کو ان حرفوں نے خراب کیا ہے جو منشی جی کے پاس تم نے مدرسے میں پڑھے۔ تم گاؤں کو نہیں بدل سکتے۔ تم زندگی اور پرانی ڈگر کو نہیں بدل سکتے۔ سب کچھ ویسا ہی رہے گا بھتیجے۔ بدلہ لینا اور آپ کو بچانا یہ دونوں کام ہمیں کرنے ہوں گے سمجھے۔ چپکے میرے پیچھے آؤ۔ تمھاری عقل کی ماں کی ایسی تیسی تم اب گاؤں میں میری ہنسی اڑواؤ گے۔ میرا بھتیجا اور چیت سنگھ کی ٹولی کے ہاتھ بری موت مرے۔ نہیں بھاوؤ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے بہت کچھ سہا ہے تم سے زیادہ کڑی زندگی گزاری ہے۔ بہت کچھ آن کی بھینٹ کیا ہے پوری زندگی، چند گھڑیوں کی بھینٹ ہے۔ ایک بری نظر کا بدلہ بھی لیا ہے۔ ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ بھاوؤ اور تم ایک دوستی کو روتے ہو۔ تم لوگ بیر کا پالہن نہیں کر سکتے۔ تو قول کا کیا کرو گے۔ تم لوگ مرتے جاتے ہو تمھارا خون ہولے ہولے ٹھنڈا

ہو رہا ہے۔ تمھارے جی کو نہ یاری کا خیال ہے اور نہ دشمنی کا۔" میں نے جل کر کہا۔ "چاچا کیا آج میں نے چیت سنگھ کو نہیں مارا؟"

ہری سنگھ نے مڑ کر کہا۔ "اور پھر سوانیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ واپس جا کر اس کی ارتھی کو کندھا دے کر شمشان لے جانا چاہنا۔ یہ کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "چاچا تم غلط کہتے ہو۔ ہم ہر شے سے لڑ جاتے ہیں۔ میں آنسو نہیں بہا رہا۔ مجھے گھر چھٹنے کا دکھ ہے۔"

ہری سنگھ نے پھر ذرا سا ہنس کر کہا۔ "گھر کی محبت! گھر میں تمھاری ماں ہو گی۔ بہن ہو گی، بیوی ہو گی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اور اگر میں تمھیں ایسے ایسے آدمیوں کا نشان دوں جنھوں نے بہنوں، ماؤں اور بیویوں کو قتل کر دیا۔ گھر کو آن پر قربان کر دیا۔"

"سنو چاچا۔" میں نے کہا۔ "آج میں بیکانیر کی طرف نکل جاؤں گا۔ اور پھر پتہ نہیں کب پلٹ کر آؤں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پیار اور یگانگت سمیت کسی کو مارنا کٹھن نہیں ہے؟"

"کٹھن۔ کٹھن؟ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" ہری سنگھ نے اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ "اتنی یادوں کا بوجھ دل پر لیے لیے زندہ رہنا کبھی کبھی

بہت لگنے لگتا ہے بھتیجے۔ تمھیں کیا پتہ میں نے زندگی میں کیا کچھ سہا ہے۔ کیا کچھ کھویا ہے۔ کتنے پیار اپنے ہاتھوں دھرتی میں ملائے ہیں۔ تمھیں کیا پتہ ہے۔ تمھارے پاس یہ آس تو ہے کہ سال چھ مہینوں کو لوٹ کر آؤ گے تو تمھارے گھر کے دروازے کھلے ہوں گے۔ حویلی میں تمھاری ماں اور دادی تمھیں دیکھ کر سینے سے لگا لیں گی۔ تمھاری بہن تم پر سے واری ہونے کے لیے اپنا دل بھی نکال کر تمھارے قدموں میں رکھ دے گی۔ تمھاری بیوی گھونگھٹ کو ماتھے تک کھینچے کھینچے آنگن میں آ کر تمھیں ایک نظر دیکھے گی۔ تمھاری لڑکیاں تمھاری ٹانگوں سے چمٹ جائیں گی۔ تم مر نہیں سکتے چانن۔ دنیا کے رستے بستے دل میں تمھارا حصہ ہے۔ پر میری طرف دیکھو۔"

میں نے چاند کی کرنوں کے بہتے دھارے میں ہری سنگھ چاچا کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو چمک رہے تھے اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور بے نور لگتی تھیں۔ اس نے باگیں چھوڑ دی تھیں اور گھوڑی ان منے دل سے اجنبی راہوں پر بیگانوں کی طرح ایک ایک قدم چل رہی تھی ——— اور چاچا یوں بیٹھا تھا جیسے اسے کہیں جانا نہ ہو۔ میلے کا شور بہت دور پیچھے رہ گیا تھا۔ پہلے میلے سے پلٹتے ہمارے ساتھ نئ خریدی ہوئی گھوڑیاں ہوتی تھیں۔ ہانپتی اور تیز دوڑتی ہوئی ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر ہم باتیں کرتے اور شراب کی

بوتلیں بانٹ بانٹ کر پیتے اور ٹھٹھا کرتے ہوئے گاؤں کو لوٹتے۔ آج میں اور ہری سنگھ چاچا گاؤں سے الٹی طرف جا رہے تھے۔ چاچا بھی اداس تھا۔

"چانن تمھاری ماں کی طرح اگر میری ماں بی ہوتی تو آج دل پر ہاتھ دھرے ڈوبتی جان کے ساتھ تمھیں بیکانیر کی راہ دکھاتا اور مردوں کی طرح ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کرتا۔ آپ اتنا اداس نہ ہوتا۔ تم بھی کہو گے میں اتنا بوڑھا ہو کر بھی ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ سفید بالوں اور بیتے سالوں کا بوجھ اٹھائے ایک زمانہ گزر گیا ہے چانن اور پھر بھی میں ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ تم اس کو میرے دماغ کی خرابی کہو گے۔ تم سوچو گے میں پاگل ہوں۔"

میں نے ہولے ہولے کہا۔ "نہیں چاچا میں تمھیں پاگل نہیں سمجھتا۔ میں تمھیں غلط بھی نہیں کہتا مجھے تمھاری بات پر اعتبار ہے۔"

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اعتبار کرو یا نہ کرو بھتیجے۔ پر یہ باتیں میں تمھیں ضرور کہوں گا تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ زندگی میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے اور کسی کسی آتما میں گہرے گھاؤ ہوتے ہیں جسے نہ خوشی بھر سکتی ہے اور نہ ہی گزرتا وقت۔"

"چاچا!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "میں نے زندگی کا ابھی کچھ نہیں دیکھا پر پتہ نہیں کیوں چیت سنگھ کا پیار میرے جی میں لوٹ آیا ہے وہ

نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں اگر وہ ہوتا تو آج ہم سکھو کو بیچ میں سے نکال کر پھر صلح کر لیتے۔ پچھلے دنوں کی طرح پھر گلے میں بانہیں ڈال کر چلتے۔ اور دیوں کی جوڑی کہلاتے۔"

ہری سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھری کہنے لگا۔ "ابھی رات باقی ہے سرحد کونسی دور ہے آؤ اس اجاڑ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ جائیں۔ میں تمھیں اپنا دکھ سنا دوں تاکہ تمھارے جی کو تسلی ہو کہ لوگ چیت سنگھ سے بھی پیاری چیزیں اپنے ہاتھوں برباد کر سکتے ہیں۔"

میں کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ جو کہیں کہیں سے اینٹوں کے اکھڑے ہونے کی وجہ سے بہت پرانی لگ رہی تھی۔ درزوں میں آگے پیپل کے پتے چاندی میں چمک رہے تھے اور ہوا شاخوں میں سن سن کر کے گزر رہی تھی۔ ہم نے گھوڑیوں کے رسے گرے ہوئے ستون کی ایک مضبوط اینٹ میں پھنسا دیے۔ ایک الو چیختا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ گھوڑیاں ڈر کر ستون کے گرد چکر کاٹنے لگیں۔

ہری سنگھ نے کہا۔ "کھوہ اور گھر تب اجڑتے ہیں جب ان کو چلانے والا باقی نہ رہے۔ ماں کے بعد ہمارے گھر کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ پریتو کو پالنے اور سنبھالنے کا سارا بوجھ میرے اور باپو کے سر پر آ پڑا۔ میری ماں نے بہت دکھ

سہے ہیں۔ پر وہ دیے کی لو کی طرح بھڑک کر نہیں بجھ گئی۔ چپکے چپکے، ہولے ہولے گھل گئی۔ باپو کی طبیعت کی سختی نے اسے برباد کیا ہے۔ اس کی طبع بڑی نازک تھی۔ بیل بیمار ہو جاتے تو وہ پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کی تکلیف اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ دکھ اٹھاؤ تو دوسرے کے دکھ کی قدر ہوتی ہے پر کئی تکلیفیں انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ ماں کا دل سورگ بن گیا تھا۔ میری ماں بہت بڑی عورت تھی چانن بڑی اور اونچی عورت۔ اس نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ کبھی روئی نہیں۔ باپو کی جوانی میں اس نے سوکنوں کے نخرے اٹھائے ہیں۔ رات رات بھر کھڑی رہی ہے۔ دھوپ کی سختیاں سہی ہیں۔ پوہ کی راتیں باہر بیٹھ کر کاٹی ہیں اور جب میں جوان ہوا تو پریتو کو چھوڑ کر وہ چلی گئی جیسے اس ستون کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے آج بھی یقین نہیں کہ وہ مر گئی تھی۔ اس نے بہت کچھ سہا ہے۔ اس میں اور بہت کچھ سہنے کی طاقت تھی۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ مر گئی۔ اگر تمھیں میں ماں کی تکلیفوں کا حال سنانے بیٹھوں تو یہ رات بہت بیت جائے گی۔ اس سے اگلی رات بیت جائے گی اور اس سے اگلی بھی۔ پھر اس کے دکھ کی کہانیاں مجھے سچی نہیں لگتیں۔ وہ باتیں میں نے دوسروں سے سنی ہیں۔ بھلا اکیلی اور کمزور سی کم بولنے والی عورت کتنا کچھ سہہ سکتی ہے۔ پریتو کو چھوڑ کر وہ مری ہے تو میں اور باپو دونوں

اکیلے رہ گئے۔ اور دونوں کے کندھوں پر پریتو کو پالنے کا بوجھ پڑ گیا۔ ماں کے مائکے گھر کے لوگ لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے، پر باپو کا دل پتہ نہیں ایکا ایکی اتنا نرم کیوں ہو گیا تھا۔ اسے ماں کو دی ہوئی تکلیفیں یاد آتی تھیں۔ اور وہ پریتو کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پریتو ہمارے سامنے بڑی ہوئی ہے میری پوروں میں اس کے جسم کی نرمی ہے۔ میرے دل میں آج بھی اس کا پیار ہے۔ ایسا نہیں جیسا ایک بھائی کو عام زندگی میں ایک بہن سے ہوتا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرا جسم ایک درخت تھا اور وہ میری ایک شاخ تھی۔ اس کے ٹوٹ جانے کا گھاؤ کبھی نہیں بھرے گا۔ چانن سنگھ وہ شاخ ٹوٹ کر اپنا نشان چھوڑ گئی ہے۔ پریتو ایک چاند تھی جس سے میری زندگی کی پتن میں ذرا سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ میں ماں کا بدلہ باپو سے نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا بھی کیا رشتہ تھا؟ میں نے پریتو کو پوجا ہے۔ گرنتھ کی طرح پوتر اور آتما کی طرح میرے سانس کی ڈوری اس میں اٹکی ہوئی تھی۔

”وہ بڑی ہوتی گئی تو ہمارے گھر میں بہار آنے لگی۔ باپو سکھ کا سانس لینے لگا۔ میں باہر سے آتا تو وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ میں چارے کا گٹھا زمین پر پھینک کر سب سے پہلے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیتا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر میرا دل کیسا ہلکا ہلکا لہروں پر ڈولتا لگتا۔ چانن تمھیں کیا بتاؤں وہ کیا

شے تھی۔ اس کی باتیں ذرا ذرا سی ساری مجھے ایک ایک کر کے یاد ہیں۔ چاہو تو تمھیں ایک ایک دن کی ساری باتیں سنا دوں۔

”وہ ذرا سی اونچی ہوئی تو گھر میں ساری چیزیں اپنے ٹھکانے سے نظر آنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ سے روٹیاں پکا کر جب وہ مجھے اور باپو کو کھلاتی تو ہمیں اپنے سے زیادہ خوش اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں میں تاگے کا تار پکڑے اس نے چرخہ بھی کاتا ہے۔ کمزور بانہوں سے دودھ بھی بلوایا ہے۔ چانن پتہ نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے تھی۔ بھلا دس سال کی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے؟

”اور بڑی ہوئی تو اس نے بڑا روپ نکالا۔ تتلی سی آنگن میں ادھر سے ادھر گھومتی پھرتی اور کام کرتی رہتی۔ رات کو تھک کر لیٹتی تو اب مجھ سے کہانیاں بھی نہ سنتی۔ میں کہتا۔ ”پریتو تو اب پریوں کی کہانی نہیں سنے گی۔“ تو ہنس کر کہتی۔ ”ویر بھلا اب میں کہانیاں سننے جتنی ہوں۔ اب تو میں بہت بڑی ہو گئی ہوں۔“ میلے پر جاتا تو میں اس کے لیے رنگ برنگ چوڑیاں، مٹھائی اور کوئی کام کی شے ضرور لاتا۔

”چوڑیاں بھی کیا شے ہے چانن عورت پہن لے تو وہ گیت بن جاتی ہے۔ ہولے ہولے چھن چھن کرتی۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر راگ پیدا کرتی

چوڑیاں عجب چیز ہیں۔ کانچ کی چوڑیاں جیسے سات سروں کو کسی نے بانہہ میں پرو دیا ہو۔“

ہری سنگھ چپ ہو گیا۔ جیسے بہت سی باتوں کے بوجھ تلے دبا سسک رہا ہو۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ چاند کے سامنے سے سفید بادلوں کے ٹکڑے ذرا ذرا سے پرزوں کی طرح اڑ اڑ کر ہوا کے زور سے بکھر رہے تھے۔ ”میلے پر جانے کی ایک شام مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پریتو نے حلوہ پکایا تھا اور پراٹھے پکا کر میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کاڑھے ہوئے ایک رومال میں باندھے تھے۔ جب میں نے پگڑی کو کس کس کر باندھا تو میرے پاس کھڑی ابرق کو اکٹھا کرتی رہی۔ پھر اس نے میرے سر پر سے ماش وارے۔ میں نے کہا پریتو تجھے یہ باتیں کہاں سے آئی ہیں تو کہنے لگی۔ ”مجھے اور بھی بڑی باتیں پتہ ہیں ویر اس طرح سے نظر نہیں لگتی۔“

”میں نے شام سے پہلے پہلے ہی گھوڑیاں تیار کر کے اور سامان لاد کر اونٹوں کو پیارا سنگھ کے ساتھ میلے میں بھجوا دیا تھا۔ پریتو کہنے ”لگی ویر میرے لیے میلے سے ڈھیر ساری رنگ برنگی چوڑیاں لانا۔ مٹھائی بھی اور ایک پینگوں والی چنری۔“ جب میں دروازے میں سے نکلا ہوں تو بوڑھی ماسی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ ”وے چانن میرے لیے کرتے کا کپڑا لانا۔“ پریتو کو میں نے

ماسی سے کبھی زور سے بولتے نہیں سنا۔ پر اس دن چیخ کر کہنے لگی۔ "ماسی بھلا جاتے ہوئے کسی کو پیچھے سے آواز دیتے ہیں تو بھی پاگل ہے سکھ سے میر اویر گیاہے سکھ سے لوٹ کر آئے۔" میں نے مڑ کر دونوں کو دیکھا اور ہنس پڑا۔ پریتو کو کتنی عقل آگئی تھی۔ شام نے مجھے سکھے کھیڑے سے ادھر ہی آ لیا۔ کالے بادل آگے پیچھے بڑھتی فوجوں کی طرح اکٹھے ہو گئے اور جب میں اپنے گاؤں سے دو کوس گیا تھاتو مجھے یاد آیا کہ میں نے جلدی میں اپنا کھیس بھی نہیں لیااور نہ ہی بڑی کرپان لی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے میں سکھے کھیڑے جا پہنچا۔ میلے میں جانے والے لوگ گڈوں پر، گھوڑیوں پر، اونٹوں پر ایک ایک دو دو جا رہے تھے۔ گھوڑیوں کے پاؤں میں پڑے گھنگرو چھن چھن کرتے ہوئے ماہیا گانے والوں کی لے میں رس سا گھولتے۔ اونٹنیاں بھاری قدموں سے تیزی تیز چلتی ہوئی مستانی چال سے جھولتی ہوئیں اوپر بہتے اور راگو میں بہنے والے دھارے میں لوچ پیدا کرتی ہوئی آگے ہی آگے جارہی تھیں۔ گڈوں کے نیچے بتیاں جل رہی تھیں اور جوان بیلوں کے دودھیا پنڈے بادلوں کو چیر کر چاند کی کرنوں سے آگے ہی آگے جارہی کسی کنواری کا دمکتا ہوا بدن ہو۔ جوان ہوتے لڑکے شور کر رہے تھے۔ اور جانوروں کی بولیاں بول رہے تھے۔ گھوڑے دوڑا کر آگے نکلنے والے لڑکوں کو میلے کی خوشی اور زندگی کا نیا پن

شراب کے نشے کی طرح مدہوش کر رہا تھا۔ اجاڑ راہیں آباد تھیں۔ اور گرو کے نام کا نعرہ درختوں کے نیچے کچے راستوں اور چھوٹی راہوں پر زور سے گونج اٹھتا۔

میں نے سوچا کیوں نہ واپس جا کر کھیس لے آؤں۔ کرپان کے بنا میلے میں جانا بھی بھلا نہیں لگتا۔ لوگوں سے یونہی ٹکرا جانا ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنے لگنا میری عادت نہیں اور پھر یہ کوئی مردمی تو نہیں کے کرپان ہاتھ میں ہو تو ساری دنیا تمھیں کیڑے مکوڑے کی طرح لگے۔

میں نے کہا۔ ''چاچا میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ چیت سنگھ مجھ سے تگڑا جوان تھا اور تمھیں پتہ ہے اس نے کبھی کسی سے پچھاڑ نہیں کھائی۔ کسی سے دبا نہیں۔''

ہری سنگھ نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ ''پر جوان میں نے یہ کب کہا ہے کہ تو نے چیت سنگھ کو کمزور سمجھ کر مارا ہے۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ میلے میں کرپان نہ ہو تو آدمی خالی خالی لگتا ہے جیسے سوتے سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔ پگڑی کا ابرق تہبند کے لڑ کرتے کے رنگ اور جوتی کی اوپر کو اٹھی نوک سب کمین کی اکڑ لگتے ہیں۔ سکھے کھیڑے میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے یار میلے کے لیے جا چکے تھے۔ حویلیوں میں دیے جل رہے تھے اور بوڑھے کہار

آگ تاپتے ہوئے ایک ایک دو دو پرانے سرداروں کے قصے سنا رہے تھے۔ عورتیں باہر سے لوٹ رہی تھیں اور جوان لڑکیاں زور زور سے باتیں کرتی کھڑ کھڑ ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنی باگیں کھینچیں اور گھوڑی کو دوڑاتا گاؤں پلٹ آیا کہ کھیس اور کرپان لے کر پھر جاؤں گا۔

گلیوں میں خاموشی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ پتے اور گرد اڑ رہی تھی۔ بادل سکھے کھیڑے کی طرف چلے گئے تھے۔ اور ہمارے گاؤں پر چاند ہولے ہولے نیلے پانی میں کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔ جیسے سفید بطخ اکیلی جوہڑ کے میلے پانی پر ہو۔ پتہ نہیں کونسی طاقت تھی جو مجھے واپس لائی تھی۔ گھر کی دیوار کے ساتھ نیم کا ایک پرانا درخت ہے اب تو اس کی شاخیں آنگن میں بہت اندر کی طرف جھک آئی ہیں اور دیوار میں بڑی درز پڑ گئی ہے۔ ان دنوں نیم کی ڈالیاں دیوار سے اندر کی طرف جھکی جھکی اور نرم تھیں اور آدمی آرام سے اس پر سے کود کر بنا آواز پیدا کیے آنگن میں اتر سکتا تھا۔ میں نے گھوڑی کو نیم کے ساتھ باہر باندھ دیا اور دیر ہو جانے کے ڈر سے کود کر اندر چلا گیا۔ بوڑھی ماسی رضائی میں منہ دیے باریک خراٹے لے رہی تھی۔ سانس کے ساتھ اس کے گلے میں بلغم غرغر کرتی۔ دیا جل رہا تھا اور پریتو کا پلنگ خالی تھا۔ پہلے میں نے سوچا ماسی کو جگا کر

اس سے اتا پتہ پوچھوں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دیا لے جا کر دوسری کوٹھڑی میں رکھ دیا اور آپ اسی راہ سے باہر آ گیا۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ میرا دل پاگل ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ پریتو کے لیے پیار کی تہوں میں پتہ نہیں کب کا دبا غصہ میری نس نس میں گھوم رہا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ میں پریتو کو زور سے پکارنا چاہتا تھا۔ اتنی زور سے کہ میلے کو جاتے لوگ رک جائیں اور مجھے پوچھیں کیا بات ہے۔

کھیتوں کی اونچی منڈیروں اور شہتوت کے خوشبودار مٹھاس سے بھرے درختوں سے ٹکرا کر میری آواز لوٹ آئے اور پریتو اس کے ساتھ ساتھ اڑتی میرے پاس آ جائے۔ کبھی کبھار دماغ بھی کیسی انہونی باتیں سوچتا ہے۔

گھوڑی کو میں نے ایک اجاڑ کھوہ پر باندھ دیا۔ میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ پتہ نہیں کون شے تھی جو مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں زندہ تھا اور میرا سانس چل رہا تھا۔ کیوں چانن کیا تو نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ایسی گھڑی تمھارے سر پر ہے جب اس کے بوجھ سے تمھارا دم بند ہو سکتا ہے۔ تم موت اور جینے کے درمیان کسی ایسی حد پر تڑپ رہے ہوتے ہو جو حد تم چھو نہیں سکتے۔ اس حد کا کوئی نام نہیں۔

پھر میں نے پریتو کو دیکھا۔ وہ اور جوالا سنگھ ایک درخت کے پاس کھڑے تھے جو ذرا اوٹ میں تھا اور اونچے کھیت کی وجہ سے نظر بھی کم آتا تھا۔ پریتو کے بعد میں نے وہ درخت آپ کاٹ دیا تھا۔

"کون جوالا سنگھ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"اوئے بھئی وہی جوالا سنگھ جو میری ماسی کا پوت تھا۔ جس کا گھر تمھارے گھروں کے ختم ہوتے ہی گلی کے دوسرے سرے پر ہے جس میں چنت کور رہتی ہے۔" ہری سنگھ نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سمجھ آ گئی میں وہ دوسرا جوالا سنگھ سمجھ رہا تھا —— ہرنام سنگھ کا سالا۔" میں نے بڑی آسانی سے جواب دیا۔ "تم سوچتے ہو میری بہن سے بات کرنے والا۔ میری چوری چھپے اس سے ملنے والا آدمی آج تک زندہ ہو سکتا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو بھتیجے؟ کیا تم کو یہ یقین ہے کہ اس رات جب میں میلے پر جانے کے لیے گھر سے چلا گیا تھا اور پریتو اس سے ملنے اس شرین کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے جوالا سنگھ کو زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا ہو گا؟ پریتو اسے کہہ رہی تھی۔ "جوالا سنگھ تو میرے ویر کی طرح سندر نہیں اور نہ ہی میرے باپو کی طرح بہادر ہے پر پھر بھی تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

جوالا سنگھ نے کہا۔ ”ایسی باتیں تو ہر عورت کسی نہ کسی مرد سے کہتی ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ تو زندگی میں ہی نہیں موت میں بھی میرا ساتھ دے۔ سدا سدا کے لیے مجھ سے نباہ کرے۔“

اور پریتو نے اس کے بازور پر ہاتھ دھر کر کہا۔ ”اچھا جوالا سنگھ میرا تیرا قول رہا۔ میں موت میں بھی تیرا ساتھ دوں گی۔“

وہ موت سے کتنے قریب تھے۔ میں کھیت کی اوٹ میں ان کے پیچھے کھڑا رہا۔ پہلے میرا جی چاہا کہ میں کرپان کا ہاتھ لمبا کر کے ماروں اور ان دونوں کو وہیں گرا دوں۔ پھر میں کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔ میں گھر میں پریتو کے پلنگ میں لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک آہٹ پر میں چونک چونک جاتا۔ وقت جوں کی چال چل رہا تھا۔ کھسکتا ہوا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

بہت دیر کے بعد ذرا سا کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی بلی آنگن میں کودے۔ پھر سانس روکے پنجے کے بل چلتی پریتو اندر آئی۔ اس نے ٹٹول کر اپنا پلنگ ڈھونڈا جس پر موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ موت بھی محبت کی طرح زبردست ہے۔

جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ ٹھنڈا تھا۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا دوسری طرف کوٹھڑی میں لے گیا۔ وہ میرے ساتھ یوں کھنچی چلی آئی جیسے اس میں جان نہ ہو۔ دیے کی لو کو اونچا کر کے میں نے اسے کہا۔

”سچ بتا تو کب سے جوالا سے ملتی ہے؟“

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر کو نیچا کیے بیٹھ گئی اور آخر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ میرا جی دم دم آگ رہا تھا۔ میں اونچی آواز سے بول بھی نہیں رہا تھا۔ کوٹھڑی میں ہماری آواز کی گونج نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا ہم دونوں سانس بھی نہیں لے رہے تھے۔ جب میں نے کہا۔ ”اس جوالا سنگھ سے بھی نمٹ لوں گا۔“ تو پریتو نے سر اونچا کر کے مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔ ”ویر اس کا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”اچھا اس کا کوئی قصور نہیں تو نہ سہی۔“ پھر میں نے کرپان کے ایک ہی ہاتھ سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کا جسم تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ہولے ہولے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اس کے ٹکڑے کیے اور بوری میں بند کر کے اناج کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ آنگن میں دبے قدموں چلتا میں نیم کے راستے گلی میں آ گیا۔

چنت کور کے گھر میں جو پیپل ہے وہ ان دنوں اتنا اونچا نہ تھا۔ دیوار کے برابر اگر کسی طرح باہر کی طرف سے چڑھ جاؤ تو اندر آنے میں آسانی رہتی ہے۔ جب میں نے اندر جا کر جوالا سنگھ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو میرا دل بڑا شانت تھا، ٹھنڈا اور کام کے لیے تیار۔ جوالا سنگھ نے کرتا نہیں پہنا ہوا تھا۔ دونوں بغلوں میں ہاتھ دیے جب اس نے ”کون ہے؟“ کہہ کر دروازہ کھولا تو میں موت بن

کر اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اسے ہلنے بولنے کا وقت بھی نہی دیا۔ اپنی پگڑی سے میں نے اس کے ہاتھ پیر اچھی طرح جکڑ کر باندھ دیے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا کہ وہ ہل اور بول نہ سکے۔

بخشی ابھی تک سو رہی تھی۔ بخشی میری پریتو کی بڑی سہیلی تھی۔ جوالا سنگھ کی ماں کے مرنے کے دوسرے مہینے برادری کی سب سے چھوٹی لڑکی کو چاچے کرتار سنگھ نے جوالا سنگھ کے لیے مانگا تھا۔ اس کا گھر سونا تھا۔ سارے لوگوں کو اس سے ہمدردی تھی اور بخشی کے باپ نے کہا تھا۔ "میں نے تجھے اپنی لڑکی دان دی ہے۔ بخشی بڑی الھڑ تھی۔ وہ گھر کو سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ یوں بھی پریتو جیسی سوجھ بوجھ ہر لڑکی میں کہاں ہوتی ہے۔ بخشی کی عادتوں میں ابھی بچپنا تھا۔ اور اسی لیے جب اس کے پاس ہی میں نے جوالا سنگھ کو باندھا ہے تو بھی وہ نہ جاگی۔

پھر میں نے اسے جگا کر باندھ دیا۔ وہ بندھی ہوئی بھی اونگھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا تماشا کیا ہو رہا ہے وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے، میلے بالوں میں گندی سی گڑیا لگ رہی تھی جو یونہی کسی مصیبت میں پڑ گئی ہے۔

پھر میں نے بوڑھے کرتار سنگھ کو بھی رسیوں سے جکڑا ور اسے بھی اس کوٹھڑی میں لے آیا۔

نچھتی کے ڈھیر میں نے پہلے سے ہی کھسکا کر کوٹھڑی کے دروازے کے قریب کر لیے تھے۔ پھر میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''جوالا سنگھ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو میری ماسی کا پوت تھا۔ تو نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے تجھے اس کا بدلہ دینا ہو گا۔'' جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خوف تھا جیسے اس کھیل کا ایسا آخر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ ایک بچے کی طرح جس نے کھیلتے کھیلتے اپنی سب سے پیاری شے کھو دی ہو اور اب افسوس بھی نہ کر سکتا ہو۔ پر اس کی آنکھوں میں زندگی مانگنے کی بھیک نہ تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم دونوں نے زندگی اور موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا یہ قول نبھانا ہو گا۔'' پھر میں نے بخشی سے کہا۔ ''بخشی تو نے میرا قصور نہیں کیا۔ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں۔ تو اگر چاہے تو بچ سکتی ہے۔ تو جوالا سنگھ کے ساتھ کیوں آگ میں پڑے۔ بول بخشی! تیری اور میری بہن کی بڑی پریت تھی۔ اب وہ پریت نہیں رہی۔ وہ بھی نہیں رہی۔ پر مجھے تجھے کچھ نہیں کہنا بول!''

جب میں نے بخشی کا منہ کھول دیا تو وہ کہنے لگی۔ ''ہری سنگھ گرنتھ کے سامنے میرے اور جوالا سنگھ کے پھیرے ہوئے تھے۔ اور میں نے بھی آخر تک اس کا

ساتھ دینے کا قول کیا تھا تب واہ گرو بھی وہاں تھا۔ اب بھلا میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی اس کے پیچھے زندہ رہ کر کیا کروں گی بتا؟"

وہ چھوٹی اور الھڑ سی لڑکی کہاں تھی۔ وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے بڑی چھوٹی سی گندی میلی لگ رہی تھی اور یہ عورت جو جوالا سنگھ کے ساتھ موت قبول کر رہی تھی۔ یہ یقیناً بخشی نہ تھی۔

میں نے کہا۔ "اچھا جو تیری اور واہ گرو کی مرضی ہو۔ اور میں نے اس کا منہ پھر باندھ دیا۔"

پھر میں نے چاچے کرتار سنگھ سے کہا۔ "چاچا تیری میری کوئی لڑائی نہیں۔ میرا باپو تیرا بھائی ہے تو ہماری برادری کا سب سے عقلمند آدمی ہے۔ تیری بات چوپال میں کسی نے رد نہیں کی۔ بتا میں کیا کروں۔ جوالا سنگھ نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا چاچا، پر تیری زندگی تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر تو کہے تو میں تجھے چھوڑ دوں۔"

چاچا نے کہا۔ "ہری سنگھ پوت یہ زندگی کی ڈگر ہے جس کو ہم میں سے کوئی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو نے جو کچھ کیا اگر نہ کرتا تو تو مرد نہ ہوتا۔ تیری راہ سیدھی ہے۔ میں تجھے دوش نہیں دوں گا۔ پر میں بھی بہت بوڑھا ہوں اور جوالا سنگھ کے بعد تجھ سے اس کی موت کا بدلہ لینے کے قابل نہیں۔ میری

ہڈیوں میں اب نہ وہ جوش ہے اور نہ طاقت۔ جوالا سنگھ کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ ہری سنگھ اچھا ہے تو جو کچھ اس کے ساتھ کرنا چاہتا ہے کرے پر ہم اس کا ساتھ دیں گے۔ میں بھی اور بخشی بھی۔" پھر اس نے پہلی بار اپنی ننگے سر بیٹھی بے بس بہو کو دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں نے پھوس کے ڈھیر ہولے ہولے ان کے گرد چن دیے۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اناج کی کوٹھڑی میں سے پریتو کے ٹکڑوں سے بھری بوری اٹھا کر میں جب تیزی سے گلیوں میں سے گزرتا پل کی طرف جا رہا تھا تو گاؤں میں واویلا مچا ہو اتھا۔ لوگ جوالا سنگھ کے گھر کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ تینوں کب کے جل چکے تھے۔ تینوں جنھوں نے الگ الگ مرنے اور بہت دنوں ایک دوسرے کا انتظار کرنے کی بجائے ایک ساتھ مرنا قبول کیا تھا۔

نہر پانی سے بھری ہوئی اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں کے پھٹے کناروں سے جھانکتی روشنی میں سیاہی اور سفیدی سے بنا دور تک پھیلا کپڑا لگ رہی تھی۔ پل کے نیچے اندھیرا تھا۔ اور پانی گھر گھر کر کے ستونوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اچھل رہا تھا اور بھنوروں میں گھوم رہا تھا۔ اندھیکار جس کا رشتہ پتہ نہیں کس پاتال اور کس ساگر کے ساتھ تھا؟ میں نے بوری کو سر سے اوپر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے

یوں لگا جیسے میں آپ بھی اپنے سر سے اونچا اٹھ گیا ہوں اور اب بوری کے ساتھ نہر میں گر جاؤں گا۔ مگر میرے قدم دھرتی پر تھے اور ابھی کتنے ہی گناہوں کا بوجھ میں نے اٹھانا تھا۔ پریتو کے سپنے اور اس کی آشائیں سارے اندھیرے میں اپنا راہ ڈھونڈنے میں کسی نئ پاتال میں اتر گئے۔ اس گھڑی مجھے یاد آیا کہ میلے پر جانے سے چند دنوں پہلے سے میں نے اسے آپ ہی آپ ہنستے دیکھا تھا۔ چوکے میں بیٹھی ہے۔ روٹی پکارہی ہے اور من ہی من میں مسکرا رہی ہے۔ ہونٹ آدھے کھلے ہیں اور آنکھیں پتہ نہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ جیسے وہ اس دنیا میں نہ ہو۔ میں اور باپو چارپائی پر بیٹھے ہیں اور پانی پکڑانے میں بے دھیان سے وہ گلاس میری جگہ باپو کو روٹی میرے تھال میں رکھ رہی ہے۔ ماسی بھی ان دنوں ہولے ہولے بڑبڑاتی رہتی۔ مگر پریتو کسی بات کا برا نہ مناتی۔ اس کی چنری میں ان دنوں رنگ بھی گہرا ہوتا تھا اور میں نے سوچا تھا جوان ہوتی لڑکیاں رنگوں اور سپنوں اور بھول سے آنے والے دنوں کا سواگت کرتی ہیں۔ پل پر کھڑے میں نے کہا تھا۔ ”ماں ہوتی تو اس طرح پریتو کا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہ جاتا۔ پریتو کے بعد اس آنگن میں کبھی ہنسی کی چھکار سنائی نہیں دی۔ کبھی چوڑیوں کی جھنکار نہیں گونجی۔ کبھی سپنوں بھری آنکھیں دیواروں پر نہیں پڑیں۔ چانن سنگھ ان دنوں مجھے پتہ چلا تھا کہ سپنے دیکھنے عورت کے حصے

میں آئے ہیں۔ عورت آپ بھی ایک سپنا ہے۔ پھول کے اندر خوشبو میں بند۔ رنگ کے اندر اس کی اڑان میں بند۔ عورت ماں ہو۔ بہن ہو۔ بس سپنے دیکھتی ہے اور ان کو سچ سمجھنے میں اپنی ساری زندگی بتا دیتی ہے۔ پریتو کا سپنا چھوٹا سا تھا۔ برسات میں اڑنے والی چیونٹیوں کی طرح۔ اس سپنے کے پر نکل آئے۔ وہ روشنی کی تلاش میں گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اسی رات میں میلے میں پہنچ گیا۔ میں نے سارے سودے خسارے کے کیے۔ پیارا سنگھ نے میری شکل دیکھ کر کہا۔ ''سردار تیری صورت اتنی پھیکی اور رنگ اتنا اڑا اڑا کیوں ہے۔ کیا تیرا جی اچھا نہیں؟ باپو مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اور میں نے اسے کھوجنے کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی آجاتی۔ میلے میں پھیلے دور دور تک لگے ہاٹ مجھے زہر لگتے۔ چوڑیوں کی دکانوں پر اپنی بانہیں بھرواتی سوانیاں مجھے بہت بری معلوم دیتیں۔ ساری عورتیں ہی ایسی ہو سکتی ہیں۔ اپنے سپنوں کو لے کر دیوں کی کھوج میں گھومتی ہوئیں۔ مجھے کسی پر اعتبار نہ رہا۔ دنیا کی ساری روشنی سکڑ کر میرے لیے نکتہ بن گئی —— خوشیاں دکھوں میں مل گئیں۔ پریتو کے بعد سے مجھے کسی شے کی کھوج نہیں رہی چانن سنگھ۔ مجھے آج تک کسی شے کی کھوج نہیں ہے پر ایک بات کا پتہ نہیں چلتا چانن سنگھ، انسان اتنا خود غرض کیوں ہے وہ سارے پیار اپنے لیے ہی

کیوں سمیٹنا چاہتا ہے؟ میں نے کہا۔ "شاید یہی بات تھی۔ میری اور جیت سنگھ کی خود غرضی ہی تھی جو ہمارے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔"

ہری سنگھ نے کہا۔ "نہیں بھتیجے مرد عورت کے سارے سپنوں کا دیا آپ بننا چاہتا ہے۔ سالوں کے بعد یہ بات مجھے جب سمجھ آئی ہے تو پریتو نہیں ہے۔ اس غصے میں جو پیار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ بھی قصور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا پریتو میرے علاوہ کسی اور میں اتنا وشواش کرے۔"

"شاید یہ بات ہو۔" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

کونجوں کی ڈار چاند کے سامنے سے اڑ کر آکاش اور دھرتی کے ملتے کناروں کی طرف چلی گئی۔ کھوہ پر ٹوٹی اینٹوں میں سے پھدک پھدک کر مینڈک باہر نکل آئے اور پیپل کی شاخوں پر پرندے کبھی کبھی نیند میں چونک کر بولنے لگتے۔ میں سوچ رہا تھا بیکانیر پتہ نہیں کتنی دور ہے؟

ہری سنگھ نے کہا۔ "میلے میں ہاٹ ہاٹ گھومتے جب ہمیں یہ خبر ملی کہ رات کسی نے میری بہن پریتو کا مار دیا ہے۔ جوالا سنگھ کا گھر جل گیا ہے اور وہ سارے اندر جل کر مر گئے ہیں تو میں پریتو کے لیے چوڑیاں لیے بنا پینگوں والی چنری اور ماسی کے لیے کرتے کا کپڑا خریدے بغیر واپس آ گیا۔ آس پاس جس کسی پر شک

کیا جاتا تھا شہر میں سختیاں سہتا اور پولیس کے چکر میں پڑا رہا۔ تین سال بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔

کسی عورت کو چوڑیاں پہنے دیکھ لوں تو مجھے پریتو یاد آجاتی ہے۔ پینگوں والی چنری میں مجھے پریتو کا دل اٹکا لگتا ہے۔ میں نے تب سے آج تک کبھی مٹھائی نہیں چکھی چانن سنگھ۔ زندگی کی ساری خوشیاں میرے لیے اس دن ختم ہو گئی تھیں جب پریتو سر جھکائے میرے سامنے بیٹھی اور جی میں سوچ رہی تھی کہ سارا قصور اس کا ہے جوالا سنگھ کا نہیں۔ عورت اپنے سپنوں کی خاطر یوں چپ چاپ بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ہم عورت کے سپنوں میں کہیں نہ کہیں روک بن جاتے ہی۔ ہم اسے سپنے بھی نہیں دیکھنے دیتے۔ ہم سب کے سب تم اور میں اور باقی دنیا اس کے سپنوں کے ہی خلاف ہیں۔

پریتو کے مرنے کے بعد، سونے گھر کو بسانے کے لیے باپو نے میری منت کی۔ دل ہی دل میں اپنے پر اور باپو پر اور باقی گاؤں پر ہنسا۔ میں نے باپو کی بات مان لی۔ آخر کہاں تک کوئی بنا بات کہے انکار کرتا۔ جن دنوں برادری کی عورتیں ہمارے گھر میں ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو میں باہر نکل جاتا۔ ان راتوں میں میں نے پریتو اور جوالا سنگھ کو دونوں کو دیکھا ہے۔ درختوں کے تنوں کے پاس کھڑے چاند کی کرنیں ان کے آر پار ہوئی جاتی ہیں۔ ہنستے ہوئے تصویر کی طرح

ہوا کے ساتھ اڑتے پھرتے وہ میرے پاس آتے اور پھر دور چلے جاتے ہیں، میں آنکھیں مل کر دیکھتا ہوں تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ پر میری بہن نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ آخری رات کے بعد جب وہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا۔ عورت رنگ روپ اور سپنا ہے۔ چانن سنگھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

وقت وقت کے دکھوں کی دوا ہے پر وہ میرے لیے کچھ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کون شکتی ہے جو آج تمھارے سامنے مجھے اپنے آپ کو اس طرح ننگا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ ہم ساری عمر لپٹے لپٹائے اپنی مورتی کو اپنے کندھے پر اٹھائے گھومتے ہیں اور آج جب میں تمھیں اتنا کچھ بتا رہا ہوں یہ کیوں نہ بتا دوں کہ سرجیت کو بھی میں نے مار دیا تھا۔

سرجیت جیسے سر ہو گیت کا بہتا دھار ہو۔ جیسے کسی راگنی کا روپ ہو۔ اتنی کومل کہ ہوا پر تصویر کی طرح لگتی۔ چاندنی میں اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ روشنی کے ساتھ اوپر اٹھتی لگتی۔ کرنوں کی سی نرمی سے دل کے اندر اتر جانے والی سختی کے سامنے اس کے روپ نے ہار مان لی، پر میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے جیتنا کب چاہتی تھی۔

میرے لیے ساری عورتیں پریتو ہیں۔ اگر وہ الٹا سپنا لے سکتی تھی تو ہر عورت غلط ہے اس کے بعد دنیا میں کیا باقی رہا ہے اور اگر ہے تو میں اس پر وشواش کیسے کر سکتا ہوں؟

دکھی دل کے ساتھ میں نے سوچا میں سرجو کو ساری عمر گھر نہیں لاؤں گا۔ مگر اس کا باپ سفید پوش تھا۔ دس گاؤں میں اس کی عزت تھی۔ ان کے ڈر سے میرے انکار کے باوجود باپو نے بیاہ کے چار ماہ بعد مجھے اسے لوانے کے لیے اس کے میکے گھر زبردستی بھیج دیا۔

"بہار کی سہانی رت تھی۔ سرد ہوا میں آموں کے بور کی خوشبو تھی۔" ہری سنگھ چاچا ایک دم چپ ہو گیا۔ دور کہیں کوئل کوہو کوہو بول رہی تھی۔ چاند نیچے جھکتا جاتا تھا اور میں سوچ رہا تھا بیکانیر کی سرحد پار کرنا اب کبھی نہ ہو سکے گا۔ چیت سنگھ بے آواز قدموں سے سدا میرا پیچھا کرے گا۔ میں کہاں جا سکوں گا۔

ہری سنگھ چاچا یکایک کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "چانن یہ قصے میری ساری زندگی پر پھیلے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں چاچا بہار کی رت کی بات سن کر بھی بڑا وقت باقی ہے۔ تم کہو پھر سرجیت کا کیا بنا؟"

"سرجیت کو میکے گھر سے لوانے جاتے ہوئے میں جوان تھا۔ چانن میں تم سے بھی جوان تھا۔ میری نئی جوتی دھوپ میں چمکتی اور چمک میرے ہاتھوں میں مہندی کی باس میں مل کر میرے گرد پھیل رہی تھی۔ میں اصیل گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ پر میری آنکھوں میں سرجو سے ملنے کی خوشی کا نشہ نہ تھا۔ مجھے پریتو یاد آرہی تھی جس نے کہا تھا جوالا سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ کیوں جوالا سنگھ کو بچا کر سارے الزام اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ کیا محبت موت سے بھی زبردست ہے؟ اور اس دن پہلی بار میرا جی چاہا، میں بھی کسی کو چاہوں۔ کسی کے لیے اپنے گلے پر چھری رکھوالوں اور اف نہ کروں۔

مگر سرجو کو میکے سے لینے جاتے میں نے سوچا تھا میں اسے کب اٹھا سکوں گا۔ اسے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے۔ اس سے لینے کی بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہ تھی۔ میرے دل میں کسی بات کا خیال نہ تھا۔

میں نے دھوکا باز کی طرح جھوٹی مسکراہٹ کا پردہ سا اپنے اوپر کر لیا۔ سسرال گھر میں نواڑی پلنگ پر بیٹھا جھکی جھکی آنکھوں سے سب طرف دیکھتا میں ساس اور سرجو کے باپ اور بھائیوں کی میری دلداری کی کوششوں کو دل ہی دل میں ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سارے میرے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ گاؤں کی

عورتیں اور لڑکیاں دم دم چوکھٹ میں کھڑی ہو کر اندر جھانکتیں۔ کہاریاں منہ پر پلو کیے مجھے پنکھا جھلتیں۔ میں اس گھر کی زندگی تھا۔

سسرال گھر سے ہم چلے ہیں تو سامان کا بھرا گڈا زوں زوں کرتا سرجو کی ڈولی کے ساتھ تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا اگر پریتو زندہ ہوتی تو سویرے کے ساتھ وہ بھی یونہی وداع ہو کر کسی گاؤں جاتی۔ کوئی بانکا چھیلا ہمارے بھی آنگن میں ہوتا۔ ہم سب گیتوں سے اس کی تواضع کرتے۔ اس پر سے روپے وارتے اسے لال پایوں والے نواڑی پلنگ پر بٹھاتے اس کے آگے پیچھے پھرتے۔

سایوں میں یونہی جگہ بہ جگہ ٹھہرتے میں نے کہاروں کو تھکا دیا۔ شام ہمیں گاؤں سے دو چار کوس ادھر ہی مل گئی۔ بادلوں کی سرخی پانی میں گھل گئی۔ چارے کے گٹھے اٹھائے عورتیں اور بیلوں کو ہنکاتے چھوٹے لڑکے اندھیرے کے نکتوں کی طرح بن گئے۔ کھیتوں میں ڈوبے درختوں پر چڑیاں، کوے بیٹھنے لگے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کی ہریالی میرا جی اداس کر گئی۔ نئی دھرتی کی باس ہل سے نکلتی ہوئی چاروں طرف مجھے جکڑنے لگی۔

میں نے کہاروں سے کہا۔ ”تم ڈولی لے کر آگے چلے جاؤ۔ میں اور سرجو نہر کے کنارے چلتے ہیں۔ وہ سارا دن بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو گی!“

میں نے جب ڈولی کا لال پردہ اٹھایا تو سرجو کی آنکھیں جھک گئیں وہ رنگین شلوار کو سنبھالتی اور مہندی سے رنگے پیروں کو آگے کر کے اترنے لگی۔ اس کے گلے میں پڑے زیور اور رانی ہار کے رنگوں پر روشنی دھنک کے سارے رنگ بن رہی تھی۔ نتھ میں لگے سرخ موتیوں کا عکس اس کے ہونٹوں کو اور بھی سرخ کر رہا تھا۔ اپنی پلکیں جھکائے، گوٹے سے بھرا دوپٹہ ماتھے تک کھسکاتی وہ باہر آگئی۔ جب کہار ڈولی لے کر دور چلے گئے اور وہ اپنی قمیض کو ہاتھ پھیر کر گھٹنوں پر سیدھا کر چکی تو سرخ رومال سے اپنا منہ ڈھانپتی ہوئی وہ میرے پاس کھڑی ہو گئی۔

اس کے گرد شام کی خوشبوئیں تھیں اور دن بھر کے مسلے ہوئے کپڑوں کی انوکھی باس تھی۔ دھرتی کی باس جیسی ہل چلا کر میں نے کبھی کبھی زمین میں محسوس کی تھی۔ سونگھی تھی۔ پوترتا۔ نرمی اور اپنے اندر مجھے خوابوں سے مل کر بنی ہوئی وہ باس بھی میرے ارادے کو بدل نہ سکی۔

میں نے کہا سرجو کچھ بولو کچھ کہو۔

وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ اور میری طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بالوں میں گندھے سونے کے پھول کانوں کے دونوں طرف ذرا ذرا اونچے تھے اور دوپٹے میں سے چمک رہے تھے۔ اس کے پراندے میں بڑے سرخ

پھندنے جس میں سونے کے تاگے تھے نیچے اور نیچے لٹکتے بڑے بھلے لگ رہے تھے اور وہ آپ جیسے کوئی سندر سا سپنا ہو۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرا تو وہ کانپ گئی۔ اس کی کپکپاہٹ میری انگلیوں کی پوروں میں سے ہوتی میری جان کو ٹھنڈا کر گئی۔ جیسے میری موت نزدیک ہو۔ بیٹھے ہوئے دل کے ساتھ جب میں نے اسے کہا سرجو میری طرف دیکھو تو اس نے ہولے ہولے گھوم کر بہت آہستہ اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ مگر وہ نگاہ نہ تھی۔ وہ پھول کی نازک پنکھڑی کی خوشبو تھی جو میرے کٹھور دل کو چھو کر واپس چلی گئی۔ میرے اندر پتھر کا دل بھلا کہیں پگھل سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "سرجو آؤ اس نہر کے کنارے لیٹ جاؤ۔ تم تھک گئیں ذرا دم لو۔" اس نے نہ تو میری طرف حیرت سے دیکھا اور نہ ہی خوف سے۔ وہ ہری گھاس پر گٹھڑی سی بن کر پڑی رہی۔ میں نے سوچا بس یہ رنگ ہے اور روپ ہے۔ میں اس کو اکٹھا کر لوں گا اور سرجو کو نہر میں بہا دوں گا۔ ہر عورت میرے لیے پریتو کی طرح تھی۔ پتہ نہیں اس رنگ اور روپ سے پرے کونسے سپنے جوان آنکھوں میں کروٹیں لے چکے ہیں۔ اس نرمی اور چاند کی سی ٹھنڈک کو کون ہاتھ چھو چکے ہیں۔

پھر میں نے کہا۔ "دکھاؤ سرجو تمھارے ہاتھ میں چوڑیاں ہیں؟"

سرجو نے سرخ چوڑے سے بھری باہنیں میرے سامنے کر دیں جیسے ایک جھونکے سے کوئی نئی شاخ ایک لمحے کے لیے جھول جائے۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کی انگلیوں کی نرمی سارے جسم میں آگئی تھی —— میں نے پور پور کر کے انھیں چوما جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہوں۔ اور کوئی سچ کہہ رہا ہوں جیسے آگ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور صرف ٹھیک بات کہنے پر مجبور ہوں۔ وہ اپنا منہ چھپائے لیٹی رہی۔ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ اٹھتا۔

میں نے جب اسے بال کھولنے کو کہا تو تب بھی اسے حیرت نہ ہوئی۔ اس نے ہولے ہولے مینڈھیاں کھولیں۔ گندھے ہوئے زیور کھولے اور انھیں قریب رکھ لیا۔ جب وہ بال کھولے بیٹھی تھی تو مجھے لگا وہ اڑ جائے گی۔ شام کی سرخی میں چھپ جائے گی اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیز دھار والی کرپان سے اسے کاٹنے لگا۔ میں نے اس کے ٹکڑے نہر میں بہا دیے۔ پانی میں بادلوں کی سرخی کے ساتھ ساتھ سرجو کی مہندی کی سرخی تھی۔ اس کا سہاگ پانی کے قطروں میں مل گیا۔ اس کے جسم کی نرمی ہوا میں رچ گئی۔

میں نے اٹھ کر گھوڑیاں کھولیں۔ ہری سنگھ چاچا اور میں دونوں چپ چاپ بیکانیر کی طرف جانے والی راہ پر جا رہے تھے اور میں اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا دو سال کے بعد اس اب اس ہاتھ سے روٹی کھا سکوں گا۔